☆ نامور مصنفہ 'رفعت سراج' کا شاہکار ناول ''دامِ دل'' اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

افسانے

رنگ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 7-OB تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا ـــ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

"بجو کہاں سے لاؤں آپ جیسا"

بجو چلی گئیں۔ آج ان کو دنیا سے رخصت ہوئے کئی دن گزر گئے ہیں مگر مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ وہ اب نہیں...... بجیا کو میں پیار سے بجو کہتی تھی۔ مجسم محبت وہ ہستی جس نے ہمیشہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر رکھا۔ ہم لوگ کتنی باتیں کرتے تھے ایک بار مجھے اپنا خواب سنا رہی تھیں۔ جس میں اُن کے اوپر سفید پھولوں کی بارش ہو رہی تھی میں نے کہا بجو یہ وہ عزت اور نیک نامی کی برسات ہے جو آپ نے کمائی ہے۔ محبت، ایثار اور خلوص کا پیکر کوئی ضرورت مند آ جائے بجیا تن من دھن سے اس کے لیے حاضر، بیماری کے دنوں میں بھی صرف دوسروں کا سوچتی رہیں۔ ایسے لوگ کہاں ہیں اور جو چند تھے ہم ان سے بھی محروم ہو گئے۔ میں نے اپنی زندگی میں بجو کو صرف دو دفعہ سوتے ہوئے دیکھا۔ پہلی دفعہ تو جیسے ہی پیروں کو ہاتھ لگایا انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

"آپ مجھے سوتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں۔" تب فوراً بولیں۔ "سو نہیں رہی تھی بس آنکھیں بند کر کے لیٹی تھی۔" دوسری بار ۱۱ فروری کو بار بار ان کے پاؤں چھوئے ماتھے کو چوما اس یقین کے ساتھ کہ ہمیشہ کی طرح آنکھیں کھول کر کہیں گی کہ میں سو تو نہیں رہی تھی مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور جاتی سرما کی رات خاموشی سے سب کو روتا بلکتا چھوڑ گئیں۔ میں نے ہمیشہ ان سے کچھ نہ کچھ سیکھا اور جاتے جاتے بھی وہ یہ سبق دے گئیں کہ محبت کرنے والے ،لوگوں کے کام آنے والے، بے حساب عزت دینے والے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتے۔ انہوں نے اپنے اوپر پھولوں کی برسات کا جو منظر بند آنکھوں سے دیکھا تھا وہ میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا گہوارے میں موجود سفید کفن میں لپٹا اُن کا نازک سا وجود جب اپنی اصل آرام گاہ کی جانب بڑھا تب محبت اور خلوص کی برسات ہر آنکھ سے جاری تھی۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ کون تھا جو نہیں تھا، کلمے کی گونج میں
میری پیاری بجو اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔
اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

دل بہت اُداس ہے۔ بہت بڑے سانحے کے بعد کوشش کررہی ہوں کہ اس کرب سے نکل سکوں جس نے میرا احاطہ کیا ہوا ہے۔ بجیا کے جانے کا دکھ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہا ہے مگر مسلمان ہونے کے ناطے ہم سب کا ایمان ہے کہ ہر ذی روح کو اپنے خالق کی جانب پلٹنا ہے تو اس سچائی کے ساتھ ہی زندگی کے سفر کو طے کرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی ہمیشہ ہمارے ساتھ نہیں رہتا۔ آتے بھی اکیلے ہیں جاتے بھی اکیلے ہیں۔ بس درمیانی وقفے میں اتنے رشتے بن جاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ازل سے ابد تک کا ساتھ ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بہر حال غم اور خوشی دونوں ہی زندگی کا حصہ ہیں۔ ذمہ داریاں اچھے انداز میں نبھانے والے ہی سرخرو رہتے ہیں۔

آیئے اب میں اور آپ اس محفل کا حصہ بن جائیں جہاں ہم ایک دوسرے سے دل کی بات کرتے ہیں۔

پہلا خط کراچی سے نگہت اعظمی صاحبہ کا آیا ہے، لکھتی ہیں ڈیئر منزہ امید ہے خیریت سے ہوگی بہت عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ جواب ضرور دوگی۔ افسانہ 'ذراسی بات' بھیج رہی ہوں۔ کسی قریبی اشاعت میں شامل کر لینا تا کہ جلد ہی دوسرا بھجوادوں۔ رسالے میں سب سے پہلے رفعت سراج کے ناول کی قسط پڑھتی ہوں اور پڑھنے کے بعد اگلی قسط کا انتظار کرنے لگتی ہوں۔ بہت نازک مسئلے پر بہت خوبصورتی سے لکھا ہے۔ بڑے رائٹرز کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ کہتے ہیں پرانا چاول پرانا ہی ہوتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کو ان پرانے رائٹرز سے ضرور سیکھنا چاہیے۔ دوشیزہ فیملی کے پرانے افراد کم ہی نظر آتے ہیں۔ پرانے سے مراد سینئر رائٹرز ہیں اور سینئر بھی عمر کے لحاظ سے نہیں بلکہ ذہنی پختگی، بالغ نظری اور تحریروں کے لحاظ سے جن کا نام ہی دوشیزہ کا سنگھار ہے۔ اور اس فہرست میں وہ رائٹرز بھی آتی ہیں جنہوں نے کچھ عرصے پہلے لکھنا شروع کیا لیکن اُن کی تحریروں نے سینئر رائٹرز کی صف میں جگہ بنالی۔ نام نہیں لکھوں گی۔ کیونکہ سب کے نام لکھ نہیں پائیں گی اور جن کا نام رہ جائے گا اُن کے دلوں کو ٹھیس پہنچے گی۔ کیونکہ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ جب لوگ سب کو یاد کرتے ہیں اور مجھے بھول جاتے ہیں۔ زیادہ پرانی بات نہیں لیکن مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا جب رسالہ کھولتے ہی سہام مرزا صاحب کا اداریہ نظر آتا تھا۔ پھر فہرست کو کھولتے تھے تو لکھنے والوں میں، فرزانہ آغا، صبیحہ شاہ' شاہدہ ناز قاضی' سلمیٰ ناز قاضی، ثمینہ علی راجپوت' دردانہ نوشین خان' شائستہ عزیز' سیما مناف' نزہت جبیں ضیاء' شمیم فضل حق' سنبل' ناہید

حسنین، علی ارسلان، ایڈیسن مسیح، رضیہ مہدی، ڈاکٹر ہاشمی، اور بہت پیارے پیارے نام جو اِس وقت ذہن میں نہیں آرہے کہ اِن سب کے نام فہرست میں جگمگاتے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کس کی تحریر پہلے پڑھی جائے۔ اِن ناموں میں سیما رضا، غزالہ عزیز، فریدہ مسرور، غزالہ رشید کے نام بھی شامل ہیں۔ ایک نام جو اس وقت لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہا ہے۔ وہ نام گل کا ہے۔ گل جو اپنے نام کی طرح خوشبو بکھیرتی تھیں۔ اُن سے میری ملاقات ایک دفعہ ہوئی تھی۔ اور میرے ذہن میں آج تک اُن نفیس خاتون کا سراپا موجود ہے۔ اُن کا دھیمے دھیمے بات کرنا دھیمے سے مسکرانا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ پھر اُن کی تحریریں اور تحریروں سے زیادہ اہم اُن کے تبصرے۔ اُن کے تبصرے دوشیزہ کی محفل میں پھول بن کر مہکتے تھے۔ ہر تحریر پر بھرپور تبصرہ، ملکی حالات پر تجزیہ، میں اُن کی بہت مشکور ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میری ہر تحریر کو پڑھا اور اُس پر مثبت انداز میں تبصرہ کیا۔ یہ وہ قرض ہے جو میں کبھی نہیں چکا سکتی اور میں بہت شرمندہ ہوں کہ اِس معاملے میں، میں بہت کاہل اور لاپرواہ ہوں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میں تحریروں پر تبصرہ اِس واسطے نہیں کرتی کہ میں اپنے آپ کو اِس قابل نہیں سمجھتی کہ کسی کی تحریر کا صحیح طور پر تجزیہ کرسکوں۔ دوسرے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میرے الفاظ کے نشتر سے کسی کا شیشہ دل نہ ٹوٹ جائے۔ یقین ہے دل بھر کے بور ہو رہی ہوگی۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے اگر خط کا جواب دیا تب بھی اور نہ دیا تب بھی بور کرنے کے لیے آتی رہوں گی کہ یہ رسالہ میرے اُس زمانے کا ساتھی ہے جب زندگی خواب دکھاتی تھی۔ پھول مہکاتی تھی۔ رنگ برساتی تھی۔ رخسانہ باجی کو بہت بہت سلام ادارے میں سب کو سلام اور دعائیں۔

☆: نگہت آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ میں آپ کو جواب دوں گی اور یہ بات ہوئی نا کہ میں آتی رہوں گی تو جناب آپ کا رسالہ ہے ضرور لکھتی رہیے۔ افسانہ مل گیا ہے جلد ہی شائع کردوں گی۔ اس یقین کے ساتھ کہ جلد ہی دوسرا افسانہ ارسال کریں گی۔

✉: آمد ہے خولہ عرفان کی کراچی سے، لکھتی ہیں السلام علیکم! احترام و نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ حاضرِ محفل ہوں۔ قلم حیران ہے اس طالب علم کی طرح جس کو اگلے دن ایک نئے استاد کا سامنا کرنا پڑے۔ آیا یہ استاد ہم کو سمجھ سکے گا؟ ہمارا دوست بنے گا؟ ہمیں باغِ علم کے مفید معلوماتی پھلوں سے مستفید کرے گا؟ غرض ہزار جواب طلب سوالات اس کے ذہن و دل کا احاطہ بذور خوف کیے ہوتے ہیں کیونکہ وہ معصوم ہوتا ہے احترام مانع ہوتا ہے اس کے لیے اپنے استاد سے سوال پوچھنے پر بالکل ایسے ہی یہ قلم جھجک رہا ہے کہ براہِ راست مدیرِ اعلیٰ سے شرفِ ہمکلامی اور ہمقلامی کرنے جا رہا ہے۔ قلم سے کوئی تقصیر ہو تو معافی کی پیشگی خواستگار ہوں۔ بے تکلفی معاف فرما دیجیے گا۔ رضوانہ صاحبہ سے کافی دوستانہ ماحول بن گیا تھا۔ کاشی صاحب کے بعد پرنسز کے جانے کا افسوس اپنی جگہ لیکن دعائیں ہماری ہمیشہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اب آتے ہیں تبصرہ کی طرف منزہ جی فروری کا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں کافی تاخیر سے آیا ہے اور اس میں کوتاہی کچھ اِس خاکسار کی ہے اور کچھ ہمارے یہاں ڈائجسٹ کے حصول کا مسئلہ ہے کہ وہ پندرہ تاریخ سے پہلے شاپس پر موجود ہی نہیں ہوتا۔ اس درد بھری کہانی کا رضوانہ کو علم ہے اور آپ کو ہو جائے گا بہر حال جیسے ہی دوشیزہ تک ہاتھوں کو رسائی حاصل ہوتی ہے ذہن و دل آنکھوں کو اس کی سیرابی سے محروم نہیں کرتے۔ آج بھی اکیس فروری کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ اور ہم اس تبصرہ کو کل پوسٹ ہو جانے کی امید پر تحریر کر رہے ہیں۔ کیونکہ کل رات دس بجے دوشیزہ

ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں...

آہ!

فاطمہ ثریا بجیا......

اناللہ وانا الیہ راجعون

2016ء۔1930ء

وہ! اک رشتہ جاں بلب

جس کے ہونے سے......

ہمتیں مجتمع تھیں

وہ اک سایہ تابندہ

جس کی اک ذرا سی سخن فہمی سے

'کارواں راہ بھول جاتے تھے'

بس!

'ہم تمہارے ہیں' کہہ کر

ہمارے ہو جاتے تھے......

آج!

وہ درخشاں ستارہ

زمین چھوڑ کر

آسمان کا ہوا

بجیا......اب ہم میں نہیں

ہمارے ہاتھوں میں رونق افروز ہوا ہے اور ہم نے چاند ماری کی جگہ رات ماری کی ہے اور میاں جی کی نیند بہت عزیز ہونے کے باوجود انہیں کے سرہانے لیمپ جلا کر اس کے مطالعے سے مستفید ہوئے ہیں جس کی انہوں نے بخوشی و رغبت خود اجازت دی۔ اب آتی ہوں تبصرہ کی طرف سب سے پہلے موسمِ سرما سے مربوط ہماری قوم کے منجمد جذبات پر آپ کا قوم کی ترجمانی کرتا اداریہ پڑھا اور آپ کے ایک ایک لفظ پر اپنا سرِ تسلیم خم کیا۔ یہ قوم کا المیہ ہے اللہ ہماری قوم کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔ پھر دوشیزہ کی محفل میں آپ کا حوصلہ افزا جواب اپنے افسانوں کی اشاعت سے متعلق پڑھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ اور نئے لہجوں اور نئی آوازوں میں اپنی نظم پڑھ کر فرطِ مسرت سے آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ یقین جانیں منزہ کاشی صاحب ہوں، رضوانہ پرنس ہوں یا آپ دوشیزہ کا ہر مدیر اور مدیرہ اپنے جوابات سے قاری کو اتنا معتبر کر دیتے ہیں کہ خود پر رشک آتا ہے کہ اتنے بہترین لوگ ہماری باتوں کو نہ صرف بغور پڑھتے ہیں بلکہ محبتوں کے ساتھ حوصلہ افزائی سے بھرپور جواب بھی تحریر کرتے ہیں۔ اتنا بھرپور رسپانس وہ بھی کسی مدیر کا علاوہ دوشیزہ کے میں نے کسی اور رسالے میں نہیں پڑھا۔ اتنے بہترین اراکین دوشیزہ کی ہمسفری اور قیادت پر آپ کو آفرین ہے۔ افسانے جتنے زیرِ مطالعہ آئے ان میں شہناز انور شفا کا 'زہریلی' بہترین ہے اتنے خوبصورت جملے اور ان کے درمیان تسلسل ایک زنجیر کی طرح مضبوطی سے جڑے ہوئے لگے۔ جذبات نگاری ختم تھی بہت خوب شہناز' رضوانہ پرنس کا سراب ناتے بہت پیارا افسانہ بہت حساس اندازِ تحریر بہت اچھے رضوانہ ماہ وش کا شبِ تاریک اور فرح انیس کا جرمِ محبت بھی دونوں نصیحت آموز اچھے افسانے تھے۔ کہانی کا اندازِ بیاں بہت اچھا لگا۔ سعدیہ عابد کا کس قدر تجھے چاہیں۔ ہیپی اینڈنگ کے ساتھ دل خوش کر گیا۔ شگفتہ شفیق کی غزل بہت بہت بہت...... خوبصورت تھی ایک ایک لفظ ان کے دل سے نکل کر میرے دل میں ترازو ہو گیا واہ...... اسماء اعوان کی کاوشوں کا ثمر دوشیزہ گلستان پہلے سے زیادہ جاذبِ نظر لگا۔ سارے اقوال' مفید باتیں اور نظمیں موجودہ حالات کی عکاسی کرتی نظر آئیں۔ ڈاکٹر ہاشمانی کا 'یہ دل کا معاملہ ہے' لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ منزہ جی فی الحال دوشیزہ کا جتنا حصہ کا مطالعہ کیا وہ حاضر ہے۔ باقی مطالعہ جاری ہے۔ یقین ہے کہ ساری تحریریں امیدوں سے زیادہ اچھی ہوں گی۔ کاشی صاحب اور رضوانہ پرنس کو بہت بہت بہت دعائیں۔ آپ کے ساتھ اب باقی سفر طے کرنا ہے۔ بصد ہے کہ محبت و خلوص کے اس قلمی سفر میں آپ ہماری بہترین دوست ثابت ہوں گی۔ ایک نظم ارسال کر رہی ہوں۔ اللہ آپ کو دوشیزہ اور اہلیان دوشیزہ کو روز افزوں ترقی اور صحت عطا فرمائے آمین۔

☆: ڈیر خولہ! بہت خوبصورت خط لکھتی ہو اور مجھے تو ایسے مخاطب کیا ہے جیسے میں مدیرہ اعلیٰ نہیں بلکہ وزیر اعلیٰ ہوں۔ تم لوگوں کی محبت ہے اور میں اس کی بہت بڑی قدر دان، بہت توجہ سے رسالہ دیکھتی ہو مجھے بہت اچھا لگتا ہے...... محنت وصول ہو جاتی ہے۔ پابندی سے محفل میں حاضری لگایا کرو۔

✉: کراچی سے سنبل لکھتی ہیں، السلام علیکم! اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ یہاں پر سب خیریت ہے اور آپ سب کی خیریت رب کریم سے نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ منزہ کا اداریہ پروٹوکول بہت زبردست تھا۔ واقعی من حیث القوم ہم ایسے ہی شوباز ہیں۔ محفل حسبِ معمول زوروں پر تھی مگر مجھے گلا ہے کہ ہماری تمام قارئین و مصنفین اپنا اپنا گا کر چلی جاتی ہیں کوئی بھی رسالے کی تحاریر پر رائے نہیں دیتا ہے۔ جبکہ

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

فروری 2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

"زہریلی"
شہناز انور شفاء

"کس جہاں میں کھو گئے" صدف آصف

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ — مارچ 2016

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

دوشیزہ میں شمارے کی سب سے بیسٹ تحریر کو ایوارڈ ملتا ہے اس بار محفل میں 13 خطوط شامل تھے جن میں سے صرف 5 نے رسالے پر تبصرہ کرنے کی زحمت کی اس بار محفل میں خاصے کی چیز شائستہ کا خط تھا شائستہ تبصرہ ہمیشہ بڑا شاندار کرتی ہیں مگر پتا نہیں اتنا کم کیوں آتی ہیں۔ میرے افسانے پر تبصرہ، مجھے ناچیز کی تحریر پر تمہاری قیمتی رائے۔ باخدا دل ان الفاظ پر بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہو گیا رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تصاویر اچھی لگائیں۔ ہم اور ہمارے مہمان میں تاثرات سب کے اچھے تھے اور شائستہ جو خود اچھے ہوتے ہیں۔ انہیں سب اچھے لگتے ہیں۔ گل کے بارے میں کیا کہوں میری صرف ان سے ایک ہی ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی میں ان کی باوقار و رعب دار شخصیت سے مرعوب کی بناء پر سلام سے آگے کلام نہ کر سکی اور کچھ میں شروع سے کم گو ہوں۔ جب میں نے دوشیزہ میں لکھنا شروع کیا میری دو بیٹیاں بہت کم سن تھیں اور بعد میں چار سال بعد بیٹا اور اس کے دو سال بعد ایک بیٹی ہوئی تو گل اکثر اپنے خطوط میں کہا کرتی تھیں یہ مجھے سنبل جیسی رائٹرز پر رشک آتا ہے۔ جو اتنے کم سن بچوں کی موجودگی میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ تو میں ہمیشہ ہی لکھا کرتی کہ آپ کو مجھ پر رشک آتا ہے اور مجھے آپ پر کہ آپ اپنی بیماری سے لڑ کر تحاریر بھی بھجواتی ہیں اور خطوط بھی تقریباً سات سال سے مستقل ان کی بیماری کی اطلاعات آرہی تھیں۔ رب کریم ان کو غریق رحمت کرے آمین۔ ان کے درجات بلند کرے اور جیسے وہ اہل زمین میں مقبول ہیں اپنے اعمال کے باعث رب دوجہاں کی بارگاہ میں بھی مقبول ہوں۔ آمین۔ دوشیزہ گلستان اچھا سجاتی ہیں اسماء اعوان نئے لہجے میں شاعری کمال کی ہوتی ہے۔ فرح، سویرا کی نظم اچھی تھی تمہاری بھی ایک گزارش ہے کہ اگر قسط وار کہانیاں کم کر دی جائیں تو بہتر ہے چھ سلسلے وار ناولز اور ناولٹ چل رہے ہیں اُم مریم اور رفعت سراج کو چھوڑ کر باقی چار کو پڑھتے وقت جب تک کئی صفحے نہ پڑھ لو یاد ہی نہیں آتا یہ کونسی اسٹوری ہے۔ اور آپ سنائیں کیا حال احوال ہے۔ ہمارے دل کا عجب ہی احوال ہے ابھی ایک سال ایک ماہ اور چار دن قبل APS کو روئے تھے تو اب چارسدہ میں باچا خان یونیورسٹی کو رو رہے ہیں پتا نہیں ہمارے آنسو کب تھمیں گے۔ اب اجازت دیں طبیت اور زندگی نے وفا کی تو آئندہ بھی خط لکھوں گی انشاء اللہ۔

☆: پیاری سنبل! آپ کا خط لگنے سے رہ گیا تھا جو یقیناً آپ کے ساتھ زیادتی تھی اس لیے افسانوں پر تبصرہ حذف کر دیا ہے۔ آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر سلسلے کم کرنے کی کوشش کروں گی۔ ایسے ہی بھرپور تبصرے کے ساتھ ہر ماہ حاضری لگایا کریں۔

✉: یہ آمد ہے فرح انیس کی بذریعہ ای میل، لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے اور دعا ہے رب کائنات سے کہ وہ سب پر اپنا کرم رکھے۔ آمین کیسی ہیں مام منزہ، مام رضوانہ اور سب پڑھنے والے کیسے ہیں؟ فروری کا شمارہ 8 تاریخ کو موصول ہوا اپنا افسانہ جرم محبت دیکھ کر انتہائی خوشی محسوس ہوئی۔ شکریہ مجھے اپنے شمارے میں جگہ دی اور میری حوصلہ افزائی کی محفل میں سب ہی کے تبصرے اچھے لگے۔ رفعت سراج کا ناول بہت زبردست جا رہا ہے۔ سعدیہ عابد کی تحریر کا اختتام بہت اچھا رہا۔ باقی افسانے پڑھے نہیں اس لیے تبصرہ نہیں کر سکتی نئے لہجے نئی آوازیں میں فریدہ جاوید فری کی 'میں چپ رہی' بہت پسند آئی۔ تین مہینے پہلے میں نے اپنی تحریر پیکیج بھیجی تھی۔ اس کے بارے میں ضرور بتائیں کہ وہ قابلِ اشاعت ہے کہ نہیں امید کرتی ہوں کہانی کا ٹاپک آپ کو پسند آئے گا۔ اجازت چاہتی ہوں زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ ملاقات ہو گی۔

دنیا میں کس جگہ

دوشیزہ

کے چرچے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو

زرِ مبادلہ دیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55امریکی ڈالرز	ایران	55امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55امریکی ڈالرز	سری لنکا	55امریکی ڈالرز
یو اے ای	55امریکی ڈالرز	جاپان	55امریکی ڈالرز
مصر	55امریکی ڈالرز	لیبیا	55امریکی ڈالرز
یونان	55امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55امریکی ڈالرز
فرانس	55امریکی ڈالرز	جرمنی	55امریکی ڈالرز
برطانیہ	55امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55امریکی ڈالرز
ناروے	55امریکی ڈالرز	پولینڈ	55امریکی ڈالرز
امریکہ	65امریکی ڈالرز	کینیڈا	65امریکی ڈالرز
افریقہ	65امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے

II 88-C ۔فرسٹ فلور۔خیابانِ جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

☆: پیاری فرح محفل میں آتی رہا کرو تمہارا افسانہ مجھے مل گیا ہے جلد بتاؤں گی۔ سعدیہ عابد تک تمہاری پسندیدگی پہنچ گئی ہوگی۔

✉: یہ آمد ہے مظفر گڑھ سے دردانہ نوشین کی، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! یقیناً اب ایک صحافی کے قلم سے زندہ اداریہ پڑھنے کو ملیں گے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے زندگی میں اب اتنا وقت نہیں ملتا ہے کہ مکمل ماہنامہ پڑھ کر مکمل تبصرہ کرسکوں۔ تاہم نامکمل پڑھ کر بھی نہ کبھی حصہ ڈال دیتی ہوں۔ موسم سرما کی شدت تو بیس روزہ تھی۔ اب خنک موسم بہار ہے جو جلد ہی گرم موسم بہار میں بدل جائے گا اور اس کے بعد...... گرمی شیطان کی آنت جیسی گرمی...... اس بار جس افسانے نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ شہناز انور شفا کا افسانہ زہریلی تھا۔ یہ افسانہ عام رومانوی معاشرتی اور افسانوں کی صف سے ہٹا ہوا حقیقت سے قریب تھا۔ بلکہ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اسے سچائی سے سینچا گیا تھا۔ کینہ توز، حاسد، خودغرض، ظلم پسند باس اور پھر عورت باس ہو تو اُس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ عورت کو اتھارٹی ملے تو مرد سے زیادہ متکبر اور سنگدل ہو جاتی ہے۔ کسی انٹرویو، پوزیٹیشن وغیرہ میں اگر میڈم سے واسطہ پڑ جائے تو سمجھو دھوبی پڑا ہوگیا۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے 'زہریلی' کی باس بی بی جیسی بچھو صفت پرنسپل کے توہین آمیز اذیت ناک رویے کو میں نے اپنے دل پر جھیلا ہے۔ اُسی دور میں میں کراچی بھی آئی تھی۔ اور ایک بھی رخصت کے بغیر ہفتہ کو آئی اتوار رات واپس چلی گئی۔ افسانے نے وہ دور میری نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جب محنتی باصلاحیت اساتذہ کی کمال ہنرمندی کی ایسی کی تیسی پھیر دی جاتی اور دن بھر پرنسپل آفس میں جڑی بیٹھی رہنے والیاں خوشامدی منظور نظر ہوتی تھیں۔ میں انگلش کی ماہر مضمون عہدہ پر تھی۔ اصولاً مجھے ہائر سیکنڈری کلاسز (ایف اے/ ایف ایس سی) کی انگلش پڑھانا تھی مگر مجھے ہائر سیکنڈری کے علاوہ ہائی کلاسز نہم دہم کی انگلش کے چھ پیریڈز کے علاوہ انچارج سال اول بنایا گیا تھا۔ میں ادبی کمیٹی کی صدر صرف انسلٹ کروانے کے لیے بنائی گئی تھی۔ جب کوئی ادب تقریب ہوتی تو انعقاد کے بعد کلاس لی جاتی۔ سینکڑوں کیڑے نکالے جاتے اور منظور نظر اسپورٹس کی انچارج تھی۔ اسے ہار جانے والے میچ کے بعد بھی انعامی رخصت دی جاتی تھی۔ وغیرہ وغیرہ...... اب جب میں یہ سوچتی ہوں کہ اللہ معاف کردینا پسند فرماتا ہے تو پھر سوچتی ہوں اس کا مطلب ہے دنیا کی فانی زندگی میں ہماری عزت نفس، اَنا' خودی دراصل بے معنی ہیں۔ اب دس سال بعد دُکھ کی وہ شدت نہیں رہی ہے اب میں آزمائشوں سے فلسفہ حیات تلاشتی ہوں۔ شہناز انور شفا کو شاندار افسانہ لکھنے پر مبارکباد نئی لکھنے والی بہنوں سے یہ کہنا ہے کہ افسانہ نگاری میں اسلوب پر توجہ رکھا کریں۔ بیانیہ میں غیر ضروری انگریزی الفاظ نہ لائیں۔ البتہ مکالمے میں ضرورت کے مطابق انگریزی یا مقامی زبانیں لائی جاسکتی ہیں۔ مکالمہ کردار کے منہ سے ادا ہوتا ہے اسلوب میں ادیب کا قلم معیار کا تعین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ غلط یا اختراعی ضرب الامثال مت لکھیے۔ جیسے؟ رضوان لالی ٹپکتے منہ سے 'غلط فقرہ ہے۔ رال ٹپکاتے منہ سے' درست ہے۔ 'شرم سے پانی میں غوطہ زن' غلط ہے۔ 'شرم سے پانی پانی ہونا' درست ہے۔ دوشیزہ کا کافی سارا حصہ نہیں پڑھا ہے۔ امید کرتی ہوں کہ منزہ سہام کی موجودگی اور توجہ دوشیزہ کی مقبولیت میں چار چاند لگائے گی۔ افسانہ بھیج رہی ہوں۔

☆: جان سے پیاری دردانہ! امید کرتی ہوں پابندی سے محفل میں شامل ہوتی رہیں گی۔ سینئر لکھاری کی یہی

مصوری
سفارت کاری
کتابیں
کامیاب زندگی
فن تعمیر
تندرستی
پاکستان کے اضلاع
موسیقی
عوام اور ہمارے بچے
طنز و مزاح
اردو ادب سے انتخاب
لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت
☆ نیوز ایجنسیز کو معقول کمیشن

خاص ادا ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے آپ کی توجہ یقیناً انہیں ایک اچھا مصنف بننے میں مدد دے گی۔

✉:لاہور سے تشریف لائی ہیں فریدہ جاوید فری لکھتی ہیں۔ فروری کا دوشیزہ دلکش ٹائٹل کے ساتھ ملا اب میری طبیعت قدرے بہتر ہے اب موسم میں ذرا تبدیلی آئی ہے حالانکہ سردیاں میری فیورٹ ہیں اور ہمارا جنم دن بھی دسمبر ہے۔ اس بار بھی افسانے اور ناول بہترین لگے خاص کر اپنی پیاری دوست سباس گل کا ناول بس ایک تو کیا کمال کا ناول لکھا مزا آ گیا پڑھ کر خوش رہو۔ سباس گل جی ایسا ہی لکھتی رہو صدف آصف کی تحریریں بھی اچھی لگتی ہیں۔ ان کا ناول بھی بہترین لگا کس جہاں میں کھو گئے۔ ناولٹ محبت روٹھ جائے تو، کس قدر تجھے چاہیں، پلکوں پر ٹھہرے خواب بہترین لگے رضوانہ پرنس واقعی تسی چھا گئے کیا افسانہ تھا جی خوش ہو گیا پڑھ کر آپ تو ناول اور افسانوں کی ملکہ ہیں سراب ناتے مبارک ہو۔ پیاری صورت اور دلکش آنکھوں والی منزہ سہام کو بھی بے حد پیار دعا اور سلام اداریہ میں موسم سرما خوب اچھا لکھا۔ کچن کارنر میں میری پسند کی ڈشز تھیں چٹ پٹی مچھلی اور چپلی کباب بے حد مزیدار لگے اور خوب کھائے سب رائٹرز اور قارئین کو بے حد سلام اور دعا۔

☆:سویٹ فریدہ! اللہ آپ کو صحت دے اداریہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉:ڈیرہ غازی خان سے منعم کی آمد ہوئی ہے، لکھتے ہیں۔ ڈیئر آپا منزہ سہام السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ پگھلتی سردیوں میں دوشیزہ کی آمد بڑی بھلی سی لگتی ہے معذرت کہ پچھلی بار محفل میں حاضری سے قاصر رہے مگر اچھی خبر یہ بھی ہے کہ دوشیزہ کے دیر سے ملنے یا کبھی بالکل نہ ملنے پر اور ہماری فریاد پر ہاکر صاحب کے کان پر جوں رینگ ہی گئی کہ اب دوشیزہ باقاعدہ اور ٹائم پر ملنے لگا ہے۔ فروری کا ٹائٹل اپنی تمام تر رعنائیوں کے ہمراہ سامنے ہے، بہت پیارا سب سے قبل اداریہ ہی پڑھتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ آپ کی باتیں بہت غور طلب اور حقیقت کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اداریہ پڑھ کر کچھ دیر کے لیے تو کچھ اور پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ خطوط سبھی اچھے لگے۔ دوشیزہ کی کہانیوں پر مجھے اتنا کہنا ہے کہ چلو ہم پر بھی رحم کریں اتنے سلسلے وار اُف خدایا...... اتنا انتظار نہیں ہوتا۔ باقی آئندہ ماہ دیکھ کر میں بھی جلد اپنا ناول لے کر حاضر ہوں گا فری ہو کر انشاء اللہ۔ پلیز سلسلے وار کم کریں اور مکمل ناول زیادہ دیا کریں۔ رفعت سراج کا ناول اچھا جا رہا ہے ایمن کی موت پر بہت دکھ ہوا۔ ام مریم بھی ہلکے ہاتھ سے ناول سمیٹنے میں لگی ہیں۔ مکمل ناول میں دونوں ہی رائٹرز مجھے پسند ہیں بہت اچھا لکھا اگلی قسط کا انتظار ہے۔ محبت روٹھ جائے تو عابدہ سبین نے کوشش کی اور یہ دکھاتیں نظر آئیں کہ وہ بھی اچھا لکھ سکتی ہیں ویلڈن۔ کس قدر تجھے چاہیں سعدیہ عابد نے قلم بند کیا بہت خوب آپی مجھے آپ کی تحریر بہت اچھی لگتی ہیں۔ پلکوں پر ٹھہرے خواب بھی اچھا جا رہا ہے۔ بس اگلی قسط کا انتظار کرنا پڑتا ہے بے چینی سے، افسانوں میں زہریلی تو بہت ہی زبردست لگا۔ شہناز انور شفا کا انداز تحریر بہت دل چھوتا ہے۔ سراب ناتے اور جرم محبت بھی اپنی اپنی جگہ خوب رہے۔ شب تاریک ٹھیک لگا مزید اچھا لکھ سکتی ہیں ماہ وش طالب، باتیں ملاقاتیں میں ماہرہ خان اور شہریار صدیقی سے باتیں و ملاقات اچھی لگی۔ مستقبل سلسلوں میں نئے لہجے نئی آوازیں اور منی اسکرین بہت دلچسپ لگتے ہیں۔ باقی پورا رسالہ بھی اے ون تھا۔ بس اب چلتا ہوں خط طویل ہو گیا ہے میرا ناولٹ اگر پڑھا ہے تو براہ مہربانی اس کے بارے میں آگاہ کریں۔ اگلے ماہ ملاقات ہوگی تب تک کے لیے بہت سی دعائیں۔

☆:منعم اسی کو تو ہمت مرداں کہتے ہیں کہ آخر کار آپ دوشیزہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

طویل کہانی نمبر

ہمارے قارئین طویل کہانیوں کے دلدادہ ہیں۔ قارئین کی پُر زور فرمائش پر "سچی کہانیاں" کا منفرد

"طویل کہانی نمبر"

آپ کی بصارتوں کا رزق بننے کے لیے تیار ہے۔ ماہ اپریل کا شمارہ طویل کہانی نمبر ہوگا۔

ایک ایسا شمارہ جس میں سسکتی، بلکتی، روح فرسا سچائیاں، سنگین سچ بیانیاں آپ کو اپنی گرفت میں لے لیں گی۔

زندگی کی برہنہ سچائیاں لیے ایک یادگار نمبر......

پلیٹ فارم نمبر

یہ زندگی ریل کی دو پٹریوں کی طرح ہے۔ جس پر حق اور باطل ایک ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں۔

زندگی ہر موڑ پر ایک پلیٹ فارم پر رُکتی ہے اور پھر...... زندگی کی منزل آجاتی ہے۔

حق اور باطل کبھی مل نہیں پاتے۔

ایک ایسا یادگار شمارہ جسے قارئین کبھی نہ بھول پائیں گے۔

تلخ وشیریں، عبرت وسبق آموز یادوں کو کہانی کے روپ میں ڈھال کر فوری طور پر ہمیں روانہ کردیں۔

نوٹ: پلیٹ فارم نمبر کے لیے اپنی کہانیاں اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں 25 مارچ سے پہلے موصول ہوجائیں۔

ماہ **اپریل** کا شمارہ طویل کہانی نمبر ہوگا

قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ناولٹ مل گیا ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے مومنہ بتول کی، لکھتی ہیں۔ میں آپ کے لیے اجنبی سہی مگر آپ میرے لیے شناسا ہیں لکھنے لکھانے کا کچھ شوق ہے اور آپ کے رسالے دوشیزہ و سچی کہانیوں میں بھی لکھ رہی ہوں۔ محترم کاشی مجھے جانتے ہیں آپ سے پہلی مرتبہ قلم شناسائی ہو رہی ہے۔ میں آپ کے اداریہ شوق سے پڑھتی ہوں۔ اللہ آپ کو کامیابیاں عطا کرے میں اپنی ایک غزل نئے لہجے نئی آوازیں کے لیے ارسال کر رہی ہوں براہ کرم نوک پلک کی درستگی کے بعد جگہ دیں آپ کی بزم آرائی میں بھی خطوط کے جوابات پڑھے اب سے پہلے رضوانہ صاحبہ ہوا کرتی تھیں۔ آپ سے اک اجازت اور لینی ہے مدرڈے کے حوالے سے میں اپنی ایک نظم بعنوان 'ماں' بھیجنا چاہتی ہوں گر وہ آپ شائع کریں تو بہت مہربانی ہوگی مزید یہ کہ افسانے بھی پوسٹ کروں گی خط کا جواب ضرور دیں میں شدت سے انتظار کروں گی۔

☆: ڈیئر مومنہ! میرے لیے ہر لکھنے والا میرا اپنا ہے کوئی بھی اجنبی نہیں اس طرح آپ بھی میری اپنی ہوئیں۔ مجھے آپ کے افسانے اور نظم کا انتظار رہے گا۔

✉: ساہیوال سے بجلیاں گراتی آئی ہیں نیئر شفقت لکھتی ہیں۔ دوشیزہ ماشاء اللہ سے آپ کی معیت میں روز بروز نکھرتی جا رہی ہے اور دعا گو ہوں کہ میری اس بچپن کی سکھی پر ہمیشہ جوانی ہی چھائی رہے آمین۔ منزہ جی سے مجھے ایک شکایت ہے گو کہ میں نے کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کی باوجود اس کے کہ اکثر دوشیزہ مجھے بھول جاتی ہے۔ بہرحال سکھیوں کا بھولنا بھی سر آنکھوں پر۔ شکایت؟ ہاں جی وہی بات کر رہی ہوں۔ کیا ایک لکھاری ہونے اور دوشیزہ کی ایوارڈ ونر ہونے کے ناطے میرا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں ہر ماہ خود مجھ سے ملنے آ جائیں۔ سچی کہانیاں تو بک اسٹالز پر پھر بھی مل جاتا ہے مگر یہاں ساہیوال میں دوشیزہ کے لیے شاید میرے علاوہ کوئی چشم براہ نہیں ہوتا۔ اس لیے بک اسٹالز پر کہیں دوشیزہ دستیاب نہیں ہوتا۔ ہر ماہ انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھتی ہوں تو وہ پڑھنا کیسا ہوتا ہے یہ بھی بتا دیتی ہوں جب پڑھنے کا وقت اور موڈ ہوتا ہے تو لائٹ نہیں ہوتی اور لائٹ ہو تو دوسرے بہت سے کام میرے منتظر ہوتے ہیں۔ کاشی جی نے دونوں رسالے بھیجنے شروع کیے تھے تو ایسے کہ ایک ماہ بھیجتے تو دو تین ماہ ڈاکیے کا انتظار کر کے آنکھیں پتھرا جاتیں۔ سہام انکل کی زندگی میں مجھے ہمیشہ دونوں شمارے وقت پر ملتے رہے تو کیا منزہ جی اب اپنے عزیز والد کی روایت کو برقرار نہیں رکھ سکتیں؟ جنوری کا سالگرہ نمبر ابھی پڑھا نہیں ہے۔ جتنا بھی پڑھا ہے زبردست ہے۔ گل کے بارے میں پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کے گھر والوں کو غم سہنے کی ہمت عطا فرمائے آمین۔ منزہ جی کا ظہرانہ بہت خوب رہا۔ دل چاہ رہا تھا کہ کاش ہم بھی وہیں موجود ہوتے۔ ویسے ہمارے کراچی کے سات سالہ قیام کے دوران منزہ جی نے کبھی ایسے مل بیٹھنے کے پروگرام نہیں بنائے یقیناً یہ ہمارے خلاف کوئی سازش ہی ہو سکتی ہے۔ کہ ہمارے ساہیوال شفٹ ہونے کے بعد...... ہوں...... تصاویر اگر رنگین ہوتیں تو زیادہ مزہ آنا تھا۔ پھر سالگرہ سروے میں بھی اپنی کمی محسوس ہوئی۔ (دل کے ارماں آنسوؤں میں بہ گئے) چلیں کوئی بات نہیں۔ اگلی مرتبہ سہی، سب کے جوابات نے بہت مزہ دیا۔ افسانوں میں سالگرہ محبت، ہے بہار منتظر اور اب کے برس ہی پڑھ سکی ہوں پھر یہ ہوا کہ لائٹ چلی گئی اور کمپیوٹر آف ہو گیا۔ چلیں کوئی بات نہیں کوشش کروں گی کہ اگلے ماہ مکمل تبصرے کے ساتھ

حاضر ہوسکوں۔ عائشہ کا ایک افسانہ آپ کے ریکارڈ میں ہوگا ذرا کاشی سے پوچھ کر بتائیں کہ کب تک چھپ جائے گا۔ اس کی دو نظمیں بھیج رہی ہوں۔ کسی قریب اشاعت میں جگہ دے دیجیے گا۔

☆: بہت ہی پیاری چلبلی نیئر شفقت! ساری غلطیاں کاشی کی ہیں میں نے پرچے کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اُن سے لکھاریوں کی فہرست مانگی تھی جنہیں پرچے بھیجے جانے تھے یقیناً آپ کا نام اس میں نہیں ہوگا بہرحال اب آپ کو شکایت نہیں ہوگی مگر بدلے میں مجھے افسانے اور پرچے پر مکمل تبصرہ چاہیے۔

✉: یہ آمد ہے فیصل آباد سے فرحت صدیقی کی، لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ السلام علیکم! بہت دنوں سے لکھنا چاہ رہی تھی۔ لیکن نگاہوں کے سامنے سے بجیا کا چہرہ آجاتا ہے۔ معصوم بھولا بھالا سفید بالوں سے ڈھکا سر محبت کی کرنیں چہرے کو چاند کی طرح جگمگا رہی ہوتی۔ میں تو تمہارے سامنے ہوں۔ تم کیسے منزہ سے میرے جانے کا دکھ شیئر کرسکتی ہو۔ میرے سامنے میرے تین ایوارڈ اداس ہیں۔ جن کی ہر تقریب میں بجیا موجود ہوتی ہیں۔ ماں کی شفقت ان کے چہرے پر پھوار کی طرح رم جھم کررہی ہوتی۔ آنکھوں سے پیار کے حد یا ٹھاٹھیں مارتے نظر آتے۔ منزہ بجیا کے جانے سے دوشیزہ اور میں ایک بار پھر ماں کی محبت سے محروم ہوگئے ہیں۔ مجھے اپنا وہ زمانہ کبھی نہیں بھولتا۔ جب بجیا کے ڈرامے P.T.V کی جان ہوتے تھے۔ ایک ایک لمحہ پر محنت نظر آتی۔ اتنی خوبصورت تحریر، اتنے ہی لاجواب ڈرامے خاص طور پر عروسہ، کائنات، شمع، سسی پنوں، گھر اک نگر اور آخری غلطی بجیا ہمارے دیس کا سرمایہ تھیں۔ وہ خاتون جس نے اسکول اور کالج کی شکل نہ دیکھی ہو۔ مگر اردو اور تہذیب کی دلدادہ، سفید ساڑھی میں ملبوس، بجیا سفید گلاب لگتیں، اس کی خوشبو تو ہمارے اندر رچ بس گئی ہیں وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان کی یادیں شمع کی طرح روشن رہے گی۔ جانے والے تو سبھی جاتے ہیں مگر کچھ جانے والے جاکر بھی نہیں جاتے وہ ہمیشہ کے لیے دلوں میں رہتے ہیں ان کی یادوں میں ان کی باتوں میں، منزہ، مجھے پتا ہے بجیا تو آپ کا گھرانہ تھی۔ ان کا جانا بہت بڑے سانحے سے کم نہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس خوش وخرم ہیں کیونکہ اللہ کے بندے ان سے خوش وخرم تھے انہوں نے کسی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ یہی عبادت ہوتی ہے۔ منزہ میں فون پر بات نہیں کرسکی مجھے پتا تھا کہ آپ بھی بات نہیں کرسکو گی۔ حوصلہ کرنا، محبت کے چراغ تو ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔ دیے سے دیا جلاؤ کہ بہت اندھیرا ہے۔

☆: فرحت آپ نے بالکل درست کہا آج دوشیزہ گھرانہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا۔ بجیا میرے لیے کیا تھیں۔ یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں مگر آپ سے تعلق اتنا پرانا ہے کہ آپ نے محسوس کیا کہ بجیا ہی میری ماں تھیں میرے لیے میری اولاد کے لیے ہر دم موجود میں ان سے ہر بات کرتی تھی اور وہ مجھ سے جو شاید ہم کسی اور سے کبھی نہیں کرسکے۔ میں یہ دکھ بھی جھیل جاؤں گی جانتی ہوں مگر جو خلا اب حائل ہے وہ شاید کبھی پُر نہ ہوسکے۔

✉: الماس نے بذریعہ ای میل پوچھا ہے کہ کیا میں دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے لیے لکھ سکتی ہوں۔

☆: اچھی الماس! کیوں نہیں لکھ سکتیں۔ ضرور لکھو مگر پہلے دونوں رسالوں کا مطالعہ ضرور کرو کیونکہ دونوں کا مزاج بالکل مختلف ہے۔

اس آخری خط کے ساتھ آپ لوگ مجھے بھی اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ انہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

حمزہ علی عباسی

اداکار، ماڈل اور ڈائریکٹر

ذیشان فراز

ہم: یہ بتائیں تعلیم کی کتنی دولت کمائی اور کہاں سے؟

حمزہ: میں نے ابتدائی تعلیم امریکہ سے حاصل کی پھر IR میں ماسٹرز کیا قائد اعظم یونیورسٹی سے، اور اس کے بعد CSS کے امتحان دیے مگر ٹریننگ مکمل نہیں کی۔

ہم: ٹریننگ سے مراد؟

حمزہ: میں پولیس گروپ میں سلیکٹ ہو گیا تھا اس کے لیے سہالہ ٹریننگ اکیڈمی میں کچھ عرصہ ٹریننگ کی پھر چھوڑ دی۔

ہم: CSS اور پھر پولیس کی نوکری اس کے لیے تو ہر شخص دیوانہ ہے پھر آپ نے کیوں چھوڑ دیا؟

حمزہ: یار میں جانتا تھا کہ ساری زندگی نوکری کرنے کے بعد IG ہی بن سکتا ہوں مجھے زندگی میں بہت واضح راستہ پسند نہیں ہے۔ Thrill ہونی چاہیے روز ایک نیا Task بس اسی لیے پھر میں نے CSS صرف ماں کی خواہش پر کیا تھا شوق بھی سے نہیں تھا۔

ہم: حمزہ یہ بتائیں سالگرہ کب مناتے ہیں؟

حمزہ: سالگرہ وغیرہ تو نہیں مناتا ہاں ڈیٹ آف برتھ آپ کو بتا سکتا ہوں 23 جون 1984ء۔

ہم: اچھا آپ نے شوبزنس کا انتخاب کیوں کیا؟

حمزہ: میں Taboo بریک کرنا چاہتا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ اس طرف نہیں آتے مجھ سے پہلے صرف راحت کاظمی صاحب CSS کر کے ڈرامہ انڈسٹری کی طرف آئے تھے اس درمیان میں بہت لمبا گیپ ہے لیکن اب Trend تبدیل ہو گیا ہے۔

ہم: شوبزنس کی ابتدا کہاں سے کی؟

حمزہ: شروعات تو تھیٹر سے ہوئی پھر میں نے دو شارٹ فلمیں بھی بنائیں Mad House اور گولڈن ڈول، اشتہارات بھی کیے جس میں Dairy Milk, Zong, سرفہرست ہیں۔

فیلڈ میری پسندیدہ

Candy Biscuit اور Jazz ہے۔

ہم: شہرت کب ملی؟

حمزہ: ہنستے ہوئے جی پیارے افضل کے بعد لوگ مجھے جاننے لگے۔ حالانکہ میں یہ ڈرامہ کرنا ہی نہیں جانتا تھا مجھے نام پسند نہیں تھا۔ پھر دوست بھی مذاق اڑاتے تھے مگر اسی ڈرامے نے مجھے پہچان دی اکثر لوگ اب بھی مجھے افضل کہہ کر پکارتے ہیں؟

ہم: میرے درد کو زباں ملے بہت بڑی ہٹ ثابت ہوا کیسا لگا؟

حمزہ: یقیناً بہت اچھا لگا۔ اس ڈرامے نے تو ریٹنگ کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

ہم: آپ نے 2013ء میں فلم میں بھی کام کیا۔ کیسا تجربہ تھا؟

حمزہ: پہلی فلم بلال لاشاری کی شارٹ فلم تھی اس کے بعد میں ہوں شاہد آفریدی اور وار کیں جس پر مجھے بہترین اداکاری کا ایوارڈ بھی ملا۔

ہم: آپ غصے والے ہیں یا نہیں؟

حمزہ: میں غصہ تو نہیں کرتا ہاں ضدی بہت ہوں۔ ہر معاملے میں معیار پر یقین رکھتا ہوں۔ خاص طور سے ایکٹنگ کے معاملے میں بہت محتاط ہوں کیونکہ یہ

ہم: آپ کے فین تو بہت ہیں آپ کس کے فین ہیں؟

حمزہ: میں شکر

ہیں اور شادی کب کریں گے؟

حمزہ: بہت گھما کر آپ نے سوال کیا پہلے ہی پوچھ لیتے ویسے مجھے کوئی پسند تھا پھر میں نے خان صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ شادی ایسے انسان سے کرنا جو کلک کرے' جس کی Directionوہی ہو جو تمہاری ہے SO اب کوئی نہیں ہے۔

ہم: ہم نے سنا ہے کہ آپ خواتین کے پردے کے حق میں ہیں؟

حمزہ: دیکھیے میں ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ملتان کی پیدائش ہے میری، میں صرف فحاشی کیخلاف ہوں۔ لوگ اس بات کو بھی نیگیٹیو لے لیتے ہیں۔

ہم: یعنی آپ خواتین کے باہر نکلنے کے خلاف نہیں ہیں؟

حمزہ: بالکل نہیں بس میں Limits کا قائل ہوں۔ میری بہن خود ڈاکٹر ہے اور پریکٹس کرتی ہے اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر فضیلہ عباسی اسکن کی ایک مشہور ڈاکٹر ہے۔

ہم: اکثر لوگ آپ سے ناراض رہتے ہیں وجہ؟

حمزہ: وجہ تو وہی بتائیں گے مگر میرا خیال ہے کہ میں اپنے خیالات کا اظہار بہت کھل کر کرتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے پسندیدگی کی Straingh Forward لوگ اکثر پسند نہیں کیے جاتے۔

ہم: انڈیا سے آفر ہوئی تو کام کریں گے؟

حمزہ: کیوں نہیں مگر Preference اپنی پاکستانی انڈسٹری کو دوں گا پاکستانی ہوں اور یہاں بننے والی فلمیں ہی شوق سے کروں گا۔

ہم: فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟

حمزہ: مجھے گٹار بجانا بہت پسند ہے، کوکنگ

گزار ہوں کہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں میں خود خان صاحب کا فین ہوں۔

ہم: ہم نے تو سنا تھا کہ آپ صبا قمر کو بہت پسند کرتے ہیں۔

حمزہ: زور سے قہقہہ لگا کر...... جی بالکل نہیں یہ افواہ ہے۔

ہم: اچھا چلیں یہ بتادیں کس کو پسند کرتے

بہت شوق سے کرتا ہوں بلکہ میں تو شیف بننا چاہتا تھا اس کے علاوہ مجھے اپنے کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا بہت پسند ہے۔

ہم: شاپنگ کہاں سے کرتے ہیں؟

حمزہ: بس کہیں سے بھی ضرورت کی چیزیں لے لیتا ہوں۔ کسی خاص یا مہنگے برانڈ سے ہرگز مرعوب نہیں، جوتے بہت شوق سے باٹا کے پہنتا ہوں۔

ہم: پسندیدہ کھیل کون سا ہے؟

حمزہ: مجھے کرکٹ بہت پسند ہے۔

ہم: کپڑے کس رنگ کے شوق سے پہنتے ہیں؟

حمزہ: مجھے کالا رنگ اچھا لگتا ہے۔

ہم: فیورٹ اداکار کون سے ہیں؟ اور کون سی فلم بار بار دیکھنا چاہتے ہیں؟

حمزہ: جی مجھے ڈینئل ڈے لوئیس بہت پسند ہیں۔ اداکارائیں تو سب اچھی لگتی ہیں اور Forest Gump ایسی فلم ہے جو میں بار بار دیکھنا چاہتا ہوں۔

ہم: کس انسانی رویے سے نفرت کرتے ہیں؟

حمزہ: مجھے جھوٹ سے نفرت ہے، دھوکے بازی والے رویے تکلیف دیتے ہیں۔

ہم: یہ بتائیں ایسا کیا کام ہے جو کرنا چاہتے ہیں؟

حمزہ: میری خواہش ہے کہ میں ایسی فلمیں بناؤں جو معاشرے میں کچھ سدھار پیدا کرسکیں۔

ہم: حمزہ آپ سے بات کرکے بہت اچھا لگا حقیقت تو یہ ہے کہ جیسا آپ کو سوچا تھا مختلف پایا۔

حمزہ: آپ کا شکریہ اور امید کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اچھا پایا ہوگا۔

تو یوں خواتین و حضرات پانچ فٹ گیارہ انچ لمبے اس خوبرو اور انتہائی ذہین ہمارے ہیرو سے ملاقات تمام ہوئی امید ہے کہ آپ لوگ بھی اس ملاقات کو انجوائے کریں گے۔

☆☆......☆☆

صنم سعید

خوش گلو ماڈل اور اداکارہ

مونی خان

صنم سعید 2 فروری 1985ء کو لندن میں پیدا ہوئیں۔ یوں ان کا ستارہ Aquarius ہے۔ چھ سال کی عمر میں صنم پاکستان آ گئیں۔ کراچی کے نجی اسکول Bayview سے Olevils کیا اور اے لیول Lecole سے پھر BNU لاہور سے فلم اور تھیٹر اسٹیڈیز میں ڈگری

لی۔ 16 سال کی عمر میں پہلی بار ریمپ پر واک کی مگر جلد اس فیلڈ سے اُکتا گئیں اور ڈرامہ انڈسٹری میں قدم رکھا۔ صنم نہایت خوبصورت اداکاری

کرتی ہیں۔ دام، متاع جان، تلخیاں، کدورت شک، زندگی گلزار ہے فراق اور دیار دل جیسے میگا ہٹ دیں۔ 2013ء میں پہلی فلم دل میرا دھڑکن تیری کی اور ایوارڈ حاصل کیا۔ اور اب 'بچانا' ریلیز کے مراحل میں ہے۔ صنم کو گانے کا بہت شوق ہے بہت محتاط طبیعت رکھتی ہیں مزاج دھیما ہے۔ صنم کی دو بہنیں اور ہیں۔ 2015ء میں فرحان حسن سے شادی کی اور دبئی میں سکونت اختیار کی۔ اب کچھ وقت دبئی میں اور کچھ پاکستان میں گزرنا ہے۔ صنم کا ماننا ہے کہ زندگی بہت مشکل ہے لہٰذا بہت سنبھل کر گزارنی چاہیے یہی وجہ ہے کہ آج تک صنم کا نام کسی اور کے ساتھ خبروں کی زینت نہیں بنا۔ صنم کہتی ہیں کہ فین کو خوش رکھنا ان کے ساتھ تصویریں بنوانا اور پھر Privacy رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ صنم کو ذاتی طور پر تھیٹر بہت پسند ہے۔ کوک اسٹوڈیو میں لے بیک سنگنگ بھی کی۔ اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں کہ انہیں فیملی کی سپورٹ حاصل ہے۔

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

بچپن ہی سے میرا دل چاہتا تھا کہ میں ہواؤں میں اڑوں، پنچھی مجھے بہت متاثر کرتے تھے۔ کیسی آزاد زندگی ہوتی ہے ان کی...... نہ کوئی روک نہ کوئی ٹوک، بس جدھر دل کیا، رین بسیرا کرلیا۔ اِدھر تو یہ حال ہے کہ زندگی ایک دائرے کے درمیان ہی گھومتی رہتی ہے مگر کیا کریں دل کا۔ دل یہ کرتا تھا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کہ جس سے دل مطمئن ہوجائے۔

دو بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ اس لیے ان کا بس نہیں چلتا ان کا کہ اُسے دنیا سے ہی کہیں چھپا کر رکھ لیں۔ اماں بی سو سو بار قربان جاتیں۔ مانا کہ محبت قسمت والوں کو ملتی ہے مگر...... یہ محبتیں کبھی کبھی بغاوت کرنے پر بھی اکساتی ہیں۔

☆......☆......☆

''فریحہ! فریحہ! کہاں ہو تم؟''

اماں بی آوازیں دیتی لان میں چلی آئیں اور اسے مہندی کی باڑھ کے پاس کتاب میں مگن دیکھ کر ہول گئیں۔ ''کیا ہوا ہے تمہیں بیٹا؟ کتنی بار سمجھایا ہے کہ جب دونوں وقت گلے مل رہے ہوں تو کھلے آسمان کے نیچے نہیں بیٹھتے؟'' پھر اسے منہ بسورتے دیکھ کر چمکارنے لگیں۔ ''اٹھو میری جان! دیکھو، منع کرنے کے باوجود سرِ شام نہائی ہو۔ دو تین چھینکیں بھی آ گئی تھیں۔ اگر دشمنوں کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو؟'' وہ خود ہی اس کی کتابیں سمیٹنے لگیں۔

فریحہ ٹھنک کر بولی۔ ''کچھ نہیں ہوتا مجھے اماں بی! دونوں وقت تو ہر وقت گلے ملتے رہتے ہیں۔ رات صبح سے، صبح دوپہر سے، دوپہر شام سے، ایک گھڑی دوسری گھڑی سے پھر بھلا ہم کب تک اندر چھپے بیٹھے رہیں؟''

''لیکن تم تو خاص طور پر اسی وقت باہر نکل آتی ہو۔'' اماں بی نے شکایتاً کہا۔

''یہ وقت تو ہمیں اس لیے بھلا لگتا ہے کہ پرندوں کی ڈاریں چہچہاتی، خوب صورت لہریے بناتی گزرتی ہیں اور بعض دفعہ تو اتنی نیچے آجاتی

ہیں کہ ہم ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سن سکتے ہیں۔ اماں بی! کیا آپ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا؟"

"کیوں نہیں لگتا لیکن کچھ کام ایسے ہیں جن سے ہمارے بزرگ روکتے چلے آئے ہیں اس لیے......"

بات ادھوری تھی کہ فریحہ تالی بجا کر بولی۔ "وہ دیکھیے' ادھر سفیدے کے پیچھے سے ایک اور غول آ رہا ہے۔ ہائے' کاش میں بھی ایک پرندہ ہوتی' سچ' کتنا مزہ آتا۔ ہر دم کھلی فضاؤں میں اڑتی پھرتی۔"

ماں نے پھر اس کی محویت میں خلل نہ ڈالا' خنکی ہونے کے باوجود خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

جاگیر اور دولت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا پھر بھی آن بان اور روایات کی پاس داری اس خاندان کے خمیر میں شامل تھی۔ بیٹے سمجھدار تھے' بچے کھچے سرمائے کو تجارت میں لگا دیا تھا۔ کچھ آبائی مکانوں کا کرایہ ملتا اور یوں خاندانی ٹھاٹ باٹ نہ سہی لیکن خوش حال زندگی گزر رہی تھی۔ ماں بیٹوں کی نگاہوں کا مرکز فریحہ تھی۔ چھوئی موئی کے پودے کی طرح اسے سرد و گرم سے بچایا جاتا اور ہر ممکنہ آرام پہنچانے کی کوشش کی جاتی لیکن فریحہ کے نازک جسم میں ایک سیمابی روح تھی جو کبھی آسمان کی وسعتوں میں کھو جانا چاہتی، تو کبھی سمندر کی گہرائیوں کی متلاشی رہتی۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر بھائیوں نے گرلز کالج میں داخلے کی اجازت دے دی تھی خاص طور پر اس کی سہولت کے لیے ایک چھوٹی گاڑی خریدی گئی تھی۔ بااعتبار اور تنومند ڈرائیور ڈھونڈا گیا تھا جو بہ وقتِ ضرورت باڈی گارڈ کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا۔ اس کے باوجود فریحہ کی واپسی تک ماں کا دل ہولتا رہتا۔ وہ بار بار بیٹی کے خیالی پیکر کے گرد آیت الکرسی کا حصار باندھا کرتیں۔ وہ تھی بھی ایسی حسین اور جاذبِ نظر شخصیت کی مالک کہ جو بھی دیکھتا' اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔ جوان ہوتے ہی رشتوں کی بھرمار ہو گئی تھی جن میں سے بڑی سوچ بچار اور استخارے کے بعد نواز کے رشتے کو قبولیت کی سند بخشی گئی جو نہ صرف فریحہ کا تایا زاد اور بچپن کا ساتھی تھا بلکہ حسن و وجاہت میں خود بھی یکتا تھا۔ فریحہ کے دل میں اس کے نام ہی سے سریلی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ تنہائی میں وہ پہروں اسی کے خیالوں میں مگن رہتی۔ کبھی مسکراتی' کبھی خود ہی شرم سے دہری ہو جاتی۔ دونوں گھرانوں میں منگنی کے بعد ہی سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں لیکن شادی اس وقت تک ملتوی کر دی گئی تھی جب تک نواز C.A کا اور فریحہ B.A کا امتحان پاس نہ کر لے۔

☆......☆......☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب فائنل کے امتحانات کے بعد رزلٹ کا انتظار اور طویل چھٹیاں فریحہ کو بے زار کیے ہوئے تھیں کہ فریحہ کے اسکول کے زمانے کی سہیلی راشدہ کی شادی طے پا گئی۔ اپنے مزاج کی سادگی اور خوش خلقی کی بنا پر فریحہ ہر طبقے کی لڑکیوں میں مقبول تھی۔ راشدہ کا شمار بھی انہی میں سے تھا جو بظاہر معاشرتی اعتبار سے یکسر مختلف تھی۔ اس کا تعلق ایک زمیں دار خاندان سے تھا۔ راشدہ کا باپ اپنے گاؤں کا چوہدری اور انتہائی قدامت پسند تھا۔ راشدہ اس کی چہیتی بیٹی تھی جس کی ضد کی وجہ سے اس نے اسے اسکول تو بھیج دیا تھا لیکن چھٹی جماعت کے بعد آگے پڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ یہ طبیعتوں

کا خلوص ہی تھا جس کی وجہ سے اب تک دونوں لڑکیوں کی دوستی نبھ رہی تھی۔ راشدہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کئی بار فریحہ سے ملنے اس کے گھر آ چکی تھی لیکن خود فریحہ کبھی گاؤں کی جھلک نہ دیکھ سکی۔ اب جو شادی کا بلاوا آیا تو مچل گئی۔ اس کا زور ماں پر خوب چلتا تھا۔ پیار سے ضد سے روٹھ کر اور آنسو بہا کر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا لیتی تھی لہٰذا اس دفعہ بھی اس نے یکے بعد دیگرے ہر حربہ استعمال کر لیا۔

''اماں بی! وہ ہماری بڑی پیاری سہیلی ہے۔ ہم شادی میں شریک نہ ہوئے تو برا مانے گی۔''

''اور تمہارے جانے سے دونوں بھائی جو خفا ہوں گے؟'' ماں نے تاویل پیش کی۔

''انہیں آپ منا لیجیے گا۔'' اس کے پاس حل موجود تھا۔

''نا بھئی' میں بھلا اتنی دور تمہیں کیسے بھیج دوں؟''

''پھر آپ بھی چلیے نا ہمارے ساتھ۔'' وہ ٹھنکی۔

''میرے پیروں کا درد پیچھا چھوڑے تب نا۔''

''ہم آپ کے پاؤں دبا دیں گے۔'' اس نے خلوص سے اپنی خدمات پیش کیں۔

''دبانے سے کہیں جاتے ہیں یہ بڑھاپے کے درد۔ بس کہہ دیا میں نے کہ تمہارا جانا ممکن نہیں ہے۔''

''ہائے اللہ! یہ بھی تو سوچیں کہ ہم نے کبھی گاؤں نہیں دیکھا' اس بہانے وہاں کی سیر بھی کر لیں گے۔''

''سارے شوق پورے کر لینا تایا جان کے گھر جا کر۔'' ماں نے پیار سے سمجھایا۔

''ہاں ضرور۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''اچھی طرح اندازہ ہے ہمیں ان کی طبیعت کا' آپ سے بھی زیادہ ظالم ہیں وہ۔''

''میں ظالم ہوں؟'' اماں بی نے حیرت سے پوچھا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' وہ باقاعدہ سسکنے لگی۔ ''ہم تو ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں قید کیے جائیں گے پھر قبر میں اتر جائیں گے سارے ارمانوں سمیت۔''

ماں کا دل بھر آیا۔ بیٹی سے جدائی کی گھڑی قریب تھی گو اپنے رشتے داروں ہی میں جا رہی تھی پھر بھی سسرال تو سسرال ہی ہوتی ہے نا' وہاں جا کر تو اس طرح ضد بھی نہ کر سکے گی میری بچی! وہ پسیج گئیں۔ ''کون سی تاریخ ہے راشدہ کی شادی کی؟''

''بیس مارچ۔'' اس نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے۔ ''لیکن مجھے تو ایک ہفتہ پہلے بلایا ہے اس نے۔''

''ہرگز نہیں' اتنے دن تم گھر سے باہر کیسے رہ سکتی ہو؟ بھائیوں کا یہ حال ہے کہ آتے ہی تمہیں پکارتے ہیں۔ دو گھڑی نہ دیکھیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ میں کسی طرح انہیں نہیں سمجھا سکتی۔ جانا ہے تو صرف شادی والے دن چلی جاؤ۔ ویسے بھی اگلے ہفتے زوہیب اور شعیب شکار پر جا رہے ہیں۔ تم صبح سے شام تک سہیلی کے پاس رہ سکتی ہو لیکن شرط یہی ہے کہ اگر رخصتی میں دیر ہو تو سب سے معذرت کر کے ہر حال میں اندھیرا پھیلنے سے پہلے واپس آ جانا۔''

''چلیے یوں ہی سہی۔'' اس نے بخوشی قبول کر لیا کیوں کہ اتنا بھی توقع سے بڑھ کر تھا۔

''اور مومل بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' فریحہ نے زور زور سے گردن ہلادی۔

اسی رات اس نے اپنا سوٹ کیس تیار کرلیا۔ ایک ہی دن کی تو بات تھی' اسی حساب سے کپڑے اور زیور رکھے گو میک اپ کی عادی نہ تھی لیکن ایسے موقعوں پر امنگ پیدا ہو ہی جاتی ہے لہٰذا سنگھار کا سامان بھی پرس میں بند کرلیا گیا۔

اگلے دن اماں بی نے راشدہ کے بُندے' انگوٹھی اور بھاری سا جوڑا بھی منگوادیا۔

وہ تو گاؤں جانے کے خیال سے بے حد خوش تھی لیکن نہ جانے کیوں اماں بی کا دل دہلا جارہا تھا؟ کئی بار سوچا' اب بھی جانے سے روک لیں لیکن جب اس کا معصوم چہرہ خوشی سے دمکتا پاتیں تو خاموش رہ جاتیں پھر بھی صبر نہ ہوا تو اپنے قریب بٹھا کر اس کی صورت تکنے لگیں۔ ماں کو افسردہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا اماں بی؟''

''کچھ بھی نہیں' بس خواہ مخواہ جی گھبرا رہا ہے میرا۔''

''طبیعت خراب ہے آپ کی؟'' وہ بے چین ہوگئی۔

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے' بس تم سے یہ کہنا ہے کہ پہلی بار اکیلی کسی کے گھر جارہی ہو' نیا ماحول ہے اور اجنبی لوگ ہوں گے۔ تمہاری کسی حرکت یا بات سے خاندان کے وقار پر حرف نہ آئے۔ لڑکیوں کے بیچ میں جاکر خود بھی انہی کے رنگ میں نہ رنگ جانا۔ اچھی طرح یاد رکھنا کہ تمہارا تعلق کس باعظمت خاندان سے ہے جہاں لوگ اپنی جان سے بڑھ کر عزت کو اہم سمجھتے ہیں۔''

''آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں.....'' اس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا۔

ماں نے ٹوک دیا۔ ''جانتی ہوں کہ تم سمجھ دار ہو' اپنے خون پر بھی بھروسا ہے مجھے پھر بھی سن لینے میں کیا حرج ہے؟ تم بہت چھوٹی تھیں جب میں بیوہ ہوئی تھی۔ میرا آسمان میرے سر سے چھن گیا تھا لیکن میں نے خود کو اس چھت کے نیچے مقید کرلیا جسے تمہارے والدِ محترم نے تعمیر کرایا تھا۔ اس معزز خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں پر سوائے اُن کے باپ' بھائی اور شوہر کے' کسی غیر مرد کی نظر نہیں پڑی۔ یہ تو نئے دور کے تقاضے ہیں کہ تمہیں اتنی آزادی مل گئی ہے پھر بھی اپنی روایات سے بغاوت نہ کرنا ورنہ یہ سمجھ لو کہ ماں کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔''

''اماں بی......! آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے ہم ہمیشہ کے لیے کہیں جارہے ہیں۔''

''ماں ہوں نا' اتنی ذرا سی جدائی بھی گوارہ نہیں ہے مجھے۔ اگر تمہاری ضد نہ ہوتی تو......'' ان کی آواز بھرا گئی۔

''اچھا اماں بی! خدا حافظ!'' اس نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر اجازت لی۔ تھوڑا سا تو وقت تھا' وہ بھی ان کے پند و نصائح میں گزرا جارہا تھا لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ ڈرائیور مراد کی طلبی ہوئی۔ اماں جانی نے اسے مستعد رہنے کی تلقین کی۔ گاڑی آہستہ چلانے اور صاحب زادی کی حفاظت کے لیے کہا۔ موتی بی سے، بٹیا سے جُڑے رہنے کی تاکید ہوئی اور یوں تین نفری قافلہ روانہ ہوا۔

☆......☆......☆

راستے کے مناظر فریحہ کا دل لبھاتے رہے۔ وہ بڑے اشتیاق سے کھیتوں' کسانوں اور مویشیوں کو دیکھتی رہی' کھلی فضا میں اتنا لمبا سفر

کرنے کا اس کا پہلا اتفاق تھا۔ راشدہ کے گاؤں تک پہنچنے کے دو گھنٹے چٹکی بجاتے گزر گئے پھر جس جوش و خروش سے وہاں اس کی پذیرائی ہوئی، رنگ برنگی جھنڈیوں کی سجاوٹ، چمکتی دمکتی دیہاتی لڑکیاں، شور و غل، چہل پہل، سب کچھ اس کے لیے نئے تھے۔

وہ آنکھیں پھاڑ کر ہر چیز کی تفصیل اپنے ذہن میں اماں بی کو بتانے کے لیے محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ ادھر وہ حیرت و شوق سے ہر طرف دیکھ رہی تھی، ادھر اس کا اپنا وجود سب کے لیے عجوبہ بنا ہوا تھا۔

لڑکیاں اور عورتیں گھور گھور کر اس کا چہرہ اور لباس دیکھتیں اور اس کے متوجہ ہو جانے پر بھونڈے پن سے انجان بننے کی کوشش کرتیں۔ تقریباً ہر نظر اسی پر لگی ہوئی تھی کیونکہ اپنے بے پناہ حسن اور سنگھار کے ساتھ وہ سب سے منفرد دکھائی دے رہی تھی۔

وہ راشدہ کے پاس پہنچی تو حیران رہ گئی۔ دلہن بن کر اُس پر خوب روپ آیا تھا مگر اُس کی سادہ سی چوٹی میں گندھے بال بہت زیادہ عجیب و غریب لگ رہے تھے۔

''راشدہ! یہ...... یہ تمہارے بالوں کا حشر۔'' وہ راشدہ کے گلے لگتے بولی تھی۔

''کیوں! کیا ہوا ہے میرے بالوں کو؟'' فریحہ نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُسے مزید تاؤ اُس وقت آیا جب وہ اپنی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''اتنے اچھے تو ہیں۔'' اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''پگلی! آج تم دلہن بنی ہو۔ دلہن کا روپ تو الگ ہی ہوتا ہے اور اس روپ کے لیے اُس کے بال بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہار سنگھار بھلا بغیر بالوں کی آرائش کے پورا ہوتا ہے؟'' فریحہ جیسے رو دی تھی۔

''ارے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' راشدہ اب تک اُس کی بات پر سنجیدہ نہ ہوئی تھی۔

''ایسا نہیں ہوتا پگلی! بس بات یہ ہے کہ تم لوگ سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔'' راشدہ سے بحث بے کار تھی سو فریحہ نے فوراً اُسے پرفیکٹ دلہن بنانے کا فیصلہ کیا۔

''کتنی دیر ہے بارات آنے میں۔'' فریحہ نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بس آدھے پون گھنٹے تک۔'' راشدہ نے ترنت کہا۔

''اوکے! آئی وانٹ اونلی 15 منٹس۔'' فریحہ نے جیسے خود سے کہا۔ اور وہ جھٹ کمرے سے باہر نکل گئی۔ دو منٹ بعد وہ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں نیو لائف بوائے شیمپو کی چھوٹی بوتل تھی جو اُسے گاؤں کی ایک چھوٹی سی دکان سے با آسانی مل گئی تھی۔

''چلو جلدی سے یہ زیور اتارو۔ میں تمہیں پندرہ منٹ میں پھر سے تیار کروں گی۔'' یہ کہہ کر اُس نے راشدہ کی حواس باختگی کو نظر انداز کیا اور کام میں جُت گئی۔

اِس وقت راشدہ کی پھوپی زاد انجم اُس کی معاون کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ فریحہ نے فوراً راشدہ کے بال نیو لائف بوائے شیمپو سے واش کیے اور پھر انہیں تیزی سے خشک کرنے لگی۔ اُس کے بال منٹوں میں سلکی اور شائنی ہو گئے تھے۔ فریحہ کو اب اُس کی سادگی پر رہ رہ کر پیار آ رہا تھا۔

مگر غصہ اس بات پر تھا کہ آخر بالوں کی

حفاظت نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ شعور کیوں نہیں اِن لوگوں میں۔ لڑکیاں منوں ٹنوں تیل لگا کر سمجھتی ہیں کہ بالوں کی غذا پوری ہو گئی۔

نہیں ایسا بالکل نہیں ہوتا بلکہ بالوں کی اصل غذا تیل کے علاوہ شیمپو کی بھی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ لائف بوائے شیمپو میں شامل دودھ اور بادام کے ساتھ ساتھ بالوں کے لیے مفید وٹامنز بھی بالوں کی نشوونما کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

''باجی! تم نے تو کمال کر دیا۔ آپا کے بال تو ایسے ہو گئے جیسے فلم والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔'' انجم اُس کے بالوں سے اٹھتی لائف بوائے شیمپو کی سحرانگیز مہک کو سونگھتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ کمال تو تم سب بھی کر سکتے ہو۔ یہ جادو میں گھر سے نہیں لائی ہوں پگلی! تمہارے گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی دکان پر موجود ہے۔ یہ دیکھو جادو کی بوتل......!'' فریحہ نے نیو لائف بوائے شیمپو کی بوتل اٹھا کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

اب وہ جلدی جلدی راشدہ کا میک اپ کرنے لگی تھی اور میک اپ کرنے کے بعد اُس نے فوراً راشدہ کے بالوں کو ایک خوبصورت انداز دیا اور پھر پنوں سے دوپٹہ سیٹ کر دیا۔

اب راشدہ کے بالوں کی چمک اور مہک بہت نمایاں تھی۔ دور سے محسوس کی جا سکتی تھی۔ اور یہ سب بلاشبہ لائف بوائے شیمپو ہی کا جادو تھا۔ انجم نے راشدہ کی بلائیں لیں اور لائف بوائے شیمپو کی بوتل اٹھا کر بولی۔

''باجی آج سے میں بھی یہی لائف بوائے شیمپو استعمال کروں گی۔''

''صرف تم ہی کیوں ...... یہ تو ہر لڑکی کو استعمال کرنا چاہیے بلکہ میں تو کہوں گی ہر شخص خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ...... لائف بوائے شیمپو سب کے بال اچھے بنائے۔''

''واہ باجی!'' انجم کھلکھلائی۔

''ارے میں تو کہتی ہوں۔ لائف بوائے شیمپو، پرفیکٹ دلہن بنائے۔'' اب کی بار گھونگھٹ سے آواز آئی تھی۔ راشدہ کی آواز پر وہ دونوں قہقہے لگاتی کمرے سے باہر آ گئیں۔

نگاہوں کی آنکھ مچولی کے ساتھ ساتھ شادی کی رسمیں بھی انجام پاتی رہیں۔ فریحہ کی وجہ سے خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ کسی مرد کو زنانہ حصے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ خود اس نے بھی اپنے آپ کو دلہن تک ہی محدود رکھا حتیٰ کہ برأت کے ساتھ آنے والے بینڈ باجے کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

لڑکیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب دلہا کو دیکھنے کے لیے دوڑیں۔ دل تو اس کا بھی چاہا کہ برأت کا نظارہ کرے لیکن اماں بی کی آواز جیسے پاؤں میں زنجیر ڈالے ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

گاؤں سے واپسی کے بعد اُس کے دل میں عجیب ایک بے قراری سی بھر گئی تھی۔

''بھلا یہ کیسی آگہی تھی...... ایک طرف تو میڈیا چیخ چیخ کر اپنی ہر شے کو سیل آؤٹ کر رہا ہے۔ ہر شہر، ہر گاؤں، ہر قصبے میں موجود دکانوں پر اشیائے ضرورت تو موجود ہیں مگر خدا بھلا کرے اِن سادہ لوح لوگوں کا......

آگہی اور مناسب ہاتھوں میں چیزیں نہ پہنچ پائیں تو ایسی اشیاء کس کام کی......

راشدہ کی شادی میں بھلے سے وہ اپنے طور پر لائف بوائے شیمپو کی صورت میں اوراک کا ایک در وا کر کے آ گئی تھی۔ اب اُسے پھر سے گاؤں کی یاد ستا رہی تھی کہ جا کر دیکھے تو سہی کہ

اُس کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی۔
اماں بی سے بہت زیادہ ریکویسٹ کر کے وہ بڑے بھائی کی مصروفیات میں سے وقت نکال کر آخر گاؤں پہنچ ہی گئی۔

☆......☆......☆

راشدہ کے گھر آئے اُسے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ انجم اپنی دو لانبی اور چمکدار چوٹیاں لہراتی اُس کے سامنے تھی۔
''ارے باجی آپ!'' وہ فریحہ کو دیکھ کر بے ساختہ اُس سے لپٹ گئی۔
''کیسی ہو چھوٹی!'' وہ محبت سے بولی۔
''باجی میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ آج رکیں گی ناں۔'' اُس کی اس بات پر بڑے بھیا نے فوراً آنکھیں دکھاتے کے ساتھ ہی گھڑی بھی دکھائی۔ مطلب واضح تھا۔
''جلدی کرو۔''
''ارے نہیں نہیں! بس ہم تو یہاں سے گزر رہے تھے تو سوچا کہ تم سب کو دیکھتے ہوئے چلتے ہیں۔''
''باجی یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ باجی میں ابھی آتی ہوں۔''
''ارے بابا! بس ہم نکلیں گے۔''
''کہاں نکلیں گے...... ارے دھی رانی! شام کا کھانا کھائے بغیر تو میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔ تُو بھی تو میری راشدہ ہی ہے۔'' راشدہ کی امی نے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔
''آنٹی بھائی جان کی میٹنگ ہے۔ ہم بس چلیں گے۔ پھر انشاء اللہ جلد آئیں گے۔''
''آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ میں ابھی آئی۔''
''ارے لڑکی سُن تو۔ یہ تو بتا آج اتنی پیاری کیسے لگ رہی ہے۔''
''آپ نے ہی تو اُس دن سکھایا تھا پیارا لگنے کا طریقہ۔'' وہ مسکرائی اور دروازہ پار کر گئی۔
کچھ ہی دیر میں وہ واپس آئی تو اُس کے ساتھ درجن بھر لڑکیاں تھیں۔ جن کے بال لہرا رہے تھے۔ شائن کرتے ہوئے، ریشم کی طرح نرم ملائم......
''یہ کیا ہے؟'' وہ گنگ رہ گئی۔
''باجی! یہ ہے بالوں کی Care۔ آپ نے کہا تھا کہ جادو اِس بوتل میں ہے۔'' انجم نے نیو لائف بوائے شیمپو کی بوتل اُس کے سامنے کی اور پھر دوسری لڑکیوں نے بھی اُس کی تقلید میں لائف بوائے شیمپو کی بوتلیں اور ساشے آگے کر کے لہرائے۔
یہ تبدیلی دیکھ کر اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُس کی ذرا سی کوشش نے بالوں کی خوبصورتی میں پہلا قدم لائف بوائے شیمپو کی صورت میں اٹھایا تو کتنا سدھار آیا۔ کاش کہ ہر کوئی اِس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے اپنا فرض نبھائے تو ہر شخص سکھ کی بانسری بجائے۔
وہ سنہری یادیں لیے بڑے بھائی کے ساتھ واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔
''ارے میری گڑیا! تُو نے کر دکھایا۔ لائف بوائے شیمپو پرفیکٹ کام دکھائے۔'' بھیا نے کہا تو اُس نے ان کے کاندھے سے سر لگا دیا۔
آج لائف بوائے شیمپو کے نتیجے نے لائف بوائے شیمپو کے ہر دعوے کو سچ ثابت کر کے اس کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ اُس کے دل سے آواز آئی تھی۔
''تھینک یو لائف بوائے شیمپو...... تم نے وعدے سچ کر دکھائے۔''

☆☆......☆☆......☆☆

بیوٹی گائیڈ

مہرین اسماعیل

صحت اور خوبصورت زندگی

خواتین روزمرہ زندگی میں اتنی مصروف رہتی ہیں کہ اپنے لیے وقت نکالنا ہی بھول جاتی ہیں۔ اپنے گھریلو کام کاج کی مصروفیات' ملازمت کے تقاضے بچوں یا بچوں کی نگہداشت میں وہ اتنی مشغول ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اپنی صحت اور جاذبیت گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کھونے لگتی ہے۔ حالانکہ ان سب کاموں کو صحیح طریقے سے انجام دینے کیلیے ان کو اپنے آپ پر توجہ دینی چاہیے۔ صحت مند زندگی کیلیے ضروری ہے کہ اپنی فٹنس کو قائم رکھیں اور فٹنس قائم رکھنے کیلیےضروری ہے روزمرہ زندگی میں ہلکی پھلکی ورزش کریں۔

ہر خاتون چاہتی ہے کہ وہ صحت مند اور تندرست رہے ہمیشہ اسمارٹ اور دلکش نظر آئے اور جب تک ہو سکے بڑھاپے کے اثرات سے دور رہے جو خواتین ورزش نہیں کر رہی ہوتیں اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ ورزش کرنا ہی نہیں چاہتیں ''ان کی وجوہات'' کئی ہیں جیسے غیر متوازن غذا کا استعمال خواتین کو علم ہی نہیں ہوتا کہ کون سی ورزش ان کے لیے فائدہ مند ہے۔ ورزش کیلیے وقت کا نا ہونا۔ اسی طرح وقت گزرتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان بیماریوں سے بچنے کیلیے دو چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں۔

☆ مکمل غذا

☆ ورزش

یاد رکھیں کہ کم کھانا اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا زیادہ کھانا مشاہدے سے یہ بات

سامنے آئی ہے کہ موٹاپے سے پریشان خواتین اکثر اتنی سخت ڈائٹنگ کرتی ہیں کہ وہ کمزور ہو کر بیمار ہو جاتی ہیں یا پھر اس کے مثبت نتائج حاصل نہ ہونے کی صورت میں پہلے سے زیادہ کھانے لگتی ہیں اور تیزی سے وزن بڑھا لیتی ہیں اس لیے انسانی صحت کی نشوونما کے لیے اچھی اور مکمل غذا ایک اہم کردار ادا کرتی ہے لہٰذا اپنی خوراک کو سادہ اور سہل بنائیں اور کھانے میں سبزیاں اور فروٹ کا استعمال زیادہ سے زیادہ رکھیں اور روزمرہ زندگی میں ورزش ضرور کریں۔

خشک جلد میں نہ صرف چکنائی بلکہ اہم جز ''کولاجن'' کی کمی بھی ہے، جلد کی اوپری سطح پر ظاہر ہونیوالے دانے اسی قلت کی علامت بھی ہیں۔ یوں تو بازار میں کولاجن پر مشتمل کریمیں عام دستیاب ہیں۔ تاہم ان کے انتخاب میں یہ احتیاط بھی ضرور ذہن میں رکھیں کہ اس نوعیت کی کریم صرف خشک یا الرجی کی شکار جلد کیلئے ہی تیار کی گئی ہوں۔ بصورت دیگر فائدے کے برعکس مختلف نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ردعمل میں جلد پر جمنے والی خشک تہہ مسامات کو بند کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد کے ماہرین موسم سرما میں بھاپ لینے کے عمل کو سب سے بہتر ٹوٹکا گردانتے ہیں۔ بھاپ کے بعد جلد نرم پڑ جاتی ہے۔ مسامات کھل جاتے ہیں جلد کی تہہ در تہہ صفائی نہایت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ گھریلو نسخے بھی جلد کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ خشک جلد کی صفائی کیلئے ایک چمچہ شہد، آٹھ قطرے حیاتین ''ای'' ایک چمچہ خوبانی کی گری کا تیل ملا کر چہرے پر لگائیں تو قدرتی طور پر کچھ روز بعد جلد میں تبدیلی آتی ہے۔ یعنی جلد کے پرانے خلیات مردہ ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیات لے لیتے ہیں۔ اس لیے خشک جلد کیلئے مندرجہ بالا نسخہ ہر دو سے تین ہفتے میں ایک بار ضرور آزمائیں اور ایک معیاری فیئرنس کریم روزانہ استعمال میں لائیں۔

ناول

رفعت سراج

قسط 14

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کر دیں گی، رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

"ویری سیڈ...... بہت دکھ ہوا۔ مگر آپ بہت اچھی خالہ ہیں۔ میں تو تھوڑی دیر پہلے تک آپ کو اس کی ماں ہی سمجھتا رہا ہوں۔ جس طرح سے آپ بھاگ دوڑ کر رہی ہیں۔ بچی کے لیے پریشان ہیں یہ انداز تو ماں کے ہوتے ہیں۔"

"بہر حال...... اللہ سے اچھی امید رکھیں۔ میرا ہر طرح کا تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ ماشاء اللہ آپ بہت باہمت ہیں۔ اور یہ اسپرٹ آپ کو قائم رکھنا ہے۔ ڈاکٹر علی عثمان نے پہلی بار اس کی طرف بہت توجہ سے دیکھا تھا۔

شریف مرد ایک ماں کسی کی بیوی سے بات کرتے ہوئے بہت زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔

اگرچہ چمن نظر انداز کئے جانے والی شخصیت نہیں تھی۔ اس کا پہناوا' باوقار لہجہ و انداز انتہائی پریشان کن صورت حال میں خود پر قابو، سب سے بڑھ کر عورت کا سب سے طاقتور ہتھیار یعنی مکمل نسوانیت پُرکشش چہرے کے ساتھ، جو مرد کسی صورت نظر انداز کر ہی نہیں سکتا کیوں کہ یہ عین فطرت ہے۔

اس وقت وہ سی گرین اور Pink کے امتزاج سے تیار ایک خوبصورت جدید تراش کے لباس میں اس کے سامنے تھی جو اس کی نسوانیت کو کمالیت پر اُجاگر کر رہا تھا اور وہ ہرگز نظر انداز کئے جانے کے قابل نہ تھی۔

نظر تو ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے۔

ایک ہی نظر میں تو پست و بود کی تفصیلات ہوتی ہیں۔

ایک ہی نظر میں تو قبولیت و استرداد کی کیفیت محفوظ ہوتی ہے۔

ہر مظاہرہ ایک نظر کا ہی تو درخواست گزار ہوتا ہے۔ باقی تو پھر اس پہلی اور بے ساختہ نظر کی تفصیلات ہوتی ہیں۔

دونوں اپنے اپنے راستوں پر چل پڑے تھے۔

ڈاکٹر عثمان ماں جیسی خالہ سے متاثر ہو کر مختلف خیالات کے گرداب میں تھے۔

چمن سوچ رہی تھی......

اللہ اس بچی کو زندگی اور صحت عطا فرمائے جس نے اسے بہت طاقتور اور فیصلہ کن بنا دیا ہے کہ کشتیاں جلا کر فطری رشتے بنانے نکلی ہے۔

☆......☆......☆

ان لوگوں کی آج تک سمجھ نہیں آسکی۔

بیوی میکے میں پریشان ہے۔ معصوم بچی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ مگر مجال ہے جو ایک فون ہی کر لیں خیر خیریت پوچھنے کے لیے۔ عطیہ بیگم کو دوہرا دکھ تھا۔

ایک بیٹی کی دائمی جدائی پھر اس کی ننھی پری کی صحت کا مسئلہ، اس پر مستزاد دوسری بیٹی پر اچانک اخلاقی بوجھ پڑ جانے کا شدید احساس جس کی ساس کے بارے میں وہ جانتی تھیں کہ اگر پانی پینا پڑ جائے تو اتنا بولتی ہیں کہ فوراً ہی دوسرے گلاس پانی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

جب رویے دیکھے بھالے ہیں۔ جب مزاج سمجھ میں آچکے ہیں تو اس طرح کے تاسف و ملال محض اپنی قیمتی توانائی کا بے محل زیاں ہے۔

دھارا جس طرح بہہ رہا ہے بہنے دو...... مشکور احمد نے غم سے قوت پکڑنے اور صبر کی لذت سے ہمکنار ہونے کے بعد عین فطرت کی زبان میں بات کی کیونکہ صبر فطرت سے رابطے کا سب سے مضبوط واسطہ ہے۔

"آپ تو مرد ہیں......" عطیہ بیگم نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔
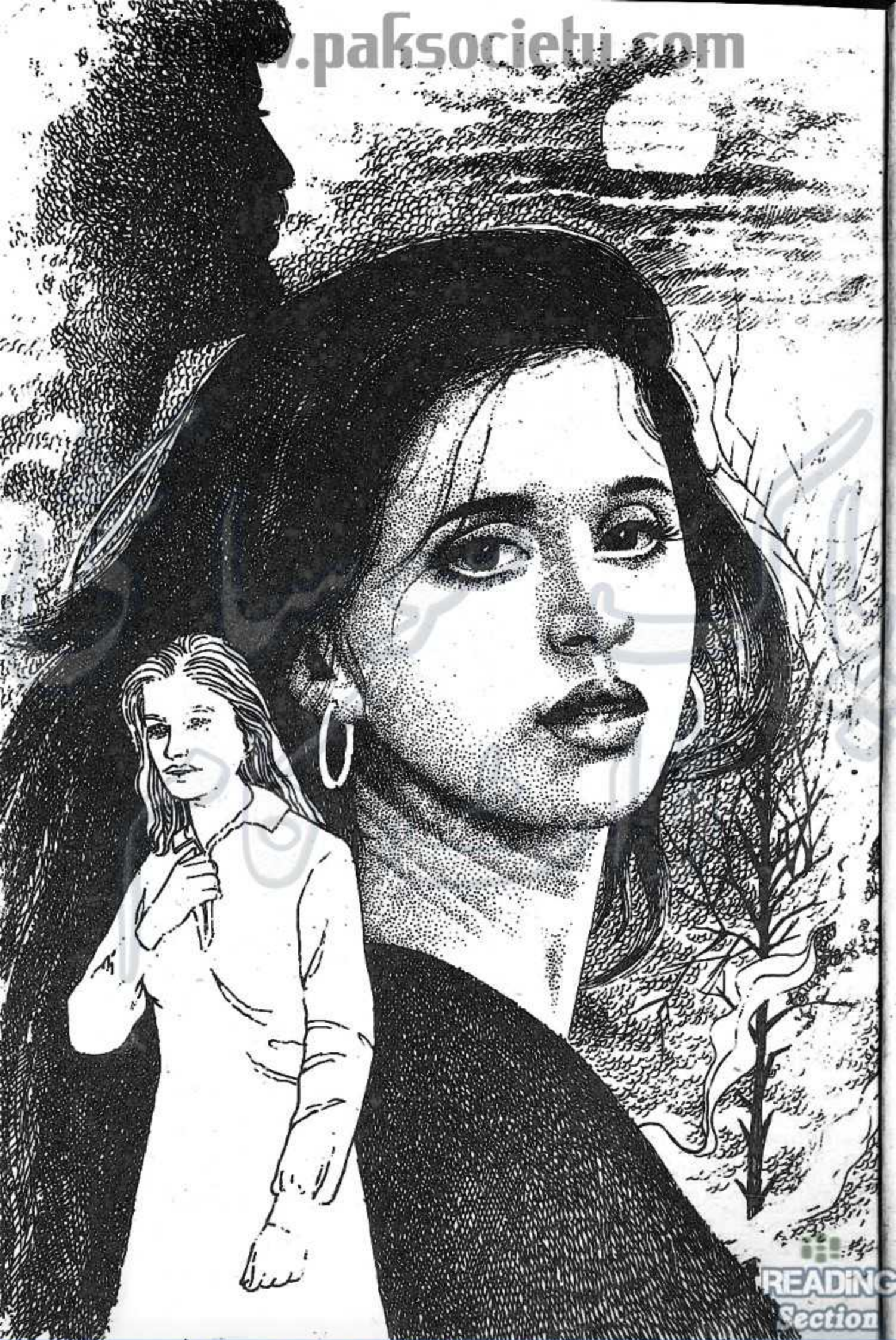
''مرد انسان نہیں ہوتا......؟'' مشکور احمد نے برجستہ سوال کیا۔ عطیہ بیگم اب لاجواب سی ہوگئیں۔
''جو کچھ ہمیں پیش آرہا ہے، یہ ہماری ذمہ داری ہے۔''
'''سب سے بڑی بددیانتی ہے کہ ہم اپنے بوجھ ڈھونے کے لیے دوسرے کا کاندھا چالاکی سے استعمال کریں۔''
''ہماری آزمائش ہے، صبر ہمارا راستہ ہے۔ ہم اللہ کی مدد سے اس راہ سے بھی گزر جائیں گے۔''
''جانے والی چلی گئی، اب اس کی بچیوں کو سنبھال رہی ہو۔ وہی کام کر رہی ہو جس کی توفیق اللہ نے دی ہے۔''
''جو جس کام کے قابل ہوتا ہے اسے وہی کام دیا جاتا ہے۔''
''ہمارے گھر میں بچوں کی رونق ہے۔ شکر ہے ویرانی نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر مشکور احمد بہت وقار سے قدم دھرتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔
''اس لحاظ سے تو میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسا بلند ہمت ساتھی اور میری اولاد کو مہربان شفیق باپ ملا......''
مشکور احمد کے خیال کا رنگ عطیہ بیگم کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ بھول گئیں کہ کیا بات کرنے بیٹھی تھیں۔

☆......☆......☆

''ماشاء اللہ آپ بہت کیئرنگ خالہ ہیں۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ بچی کو کسی بھی طرح Risk سے بچا لیا جائے۔ ڈاکٹر علی عثمان بہت پروفیشنل انداز میں چمن کو تسلی دے رہے تھے۔ بچی کو لیب ٹیسٹ کے لیے لے جایا جا چکا تھا۔
چمن ڈاکٹر علی عثمان کے روم میں بیٹھی بچی کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات کر کے گویا اپنی تقویت کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ کیونکہ اسے آثار اچھے نظر نہیں آ رہے تھے وہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر علی عثمان بہت مضبوط اعصاب پیشہ ور اور فرض شناس مسیحا ہیں۔ نہ خود ناامید ہونا جانتے ہیں نہ دوسروں کو ناامیدی کے گرداب میں پھنسانے کا اخلاقی جرم کرتے ہیں۔
مسیحا خاموش بھی رہیں تو کیا...... دل بولنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔
اسی دوران ان کے پاس فون آ رہے تھے وہ فون اٹینڈ کرنے کے دوران ایک نظر چمن پر بھی ڈالتے تھے۔
اس بے چاری خالہ کی بے لوث محبت' ماں جیسی شب بیداریاں، تڑپ، کوئی معجزہ ہو جانے کی جان توڑ بے قراری...... نے واقعی ان پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔
''Ary You Married؟'' سیل فون ایک طرف رکھتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر یوں بے اختیار سوال آیا گویا فون کرنے والے نے ان کو سختی سے تاکید کی تھی کہ جو سامنے بیٹھی ہے اس سے یہ سوال کرو۔
''چمن جو بچی کے دھیان میں غلطاں تھی چونک پڑی۔ یہ انتہائی نازک صورت حال میں، میں کہاں سے آ گئی؟''
''جی......؟'' چمن نے بہت اعتماد سے جواب دیا۔
''اوہ...... Good...... آپ کے اپنے کتنے بچے ہیں؟'' ڈاکٹر علی عثمان کو جیسے سن کر واقعی بہت دلی خوشی

ہوئی تھی۔ جوان کی صاف نظر و باطن کی ترجمان تھی۔
''بچے نہیں ہیں۔'' چمن نے سر جھکا کر بہت آہستہ آواز میں جواب دیا۔
''اوہ...... یعنی شادی کو زیادہ وقت نہیں ہوا۔''
''آپ کے ہزبینڈ ایک مرتبہ بھی نظر نہیں آئے۔ غالباً بہت بزی ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر علی عثمان کی ٹون اب بھی پہلے جیسی تھی گویا چمن کے شادی شدہ ہونے یا نہ ہونے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔
چمن کے حلق میں بڑا سا گولہ پھنس گیا۔
شادی شدہ عورت سماجی لحاظ سے بہت مضبوط اور معزز ہوتی ہے۔ لیکن اس کی حالت لمحے میں یوں ہوگئی جیسے آناً فاناً کوئی بکری ریوڑ سے بچھڑ کر بھیڑیوں کے ہجوم میں پھنس گئی ہو۔ اور بھیڑیے جشن کی تیاری کررہے ہوں۔
کچھ تھا چہرے پر...... ڈاکٹر علی عثمان کو حدود تجاوز کرنے کے جرم کا احساس ہونے لگا۔
''I Am Sorry...... مجھے اتنا پرسنل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایکچو لی آپ سے بچی کی وجہ سے اتنی ملاقات رہنے لگی ہے کہ بے خیالی میں آپ سے سوال کر بیٹھا۔''
''نو پرابلم...... جی...... ہزبینڈ واقعی بہت بزی رہتے ہیں۔ دن میں آجاتے ہیں۔ اس وقت آپ نہیں ہوتے۔'' چمن کے سر سے عزت کی ریشمی ردا بار بار پھسل رہی تھی۔ اس نے جھٹکے سے پیشانی تک کھینچی۔ یہ جھوٹ کتنا عظیم تھا جس نے رات کے اس پہر صرف شوہر کا نام یا ذکر کرنے پر ہی اسے مضبوط خیمے میں چھپا کر پردہ گرا دیا تھا۔
''ٹھیک ہے...... ہوسکتا ہے کسی دن ہماری ٹائمنگ میچ کر جائے اور آپ کے ہزبینڈ سے ملاقات ہوجائے۔''
''انشاء اللہ بے بی ابھی ہمارے پاس ہی ہے۔ Survive کرجانے کی صورت میں تو اسے یہاں کچھ دن نرسری میں رکھنا بہت ہی ضروری ہوگا۔''
چمن نے ڈاکٹر علی عثمان کی طرف دیکھا۔ امید، تازگی، جذبے کی بھرپور توانائی۔ ''میں اوپر ایک راؤنڈ لے کر آتا ہوں۔ میرا خیال ہے اتنی دیر میں نرس بے بی کو لیب سے لے آئے گی۔''
اسٹیتھ اسکوپ اُٹھا کر گلے میں لٹکاتے ہوئے اپنے اسی خاص پروفیشنل انداز میں چلتے ہوئے روم سے باہر چلے گئے۔
چمن نے صرف نظروں کی حد تک ان کا تعاقب کیا۔ کرسی پر دھرا وجود گویا پتھر کا بن چکا تھا۔
نسوانی پندار کی پیشانی پر چٹانی پتھر پڑا تھا۔ خون پھوٹ نکلا تھا۔ اب پیشانی پر ہاتھ دھرے خون روکنے کی کوششیں تھیں۔
اُبلتا پھوٹتا خون بھلا ایسے رُکتا ہے؟ چہرہ بھگوئے گا۔ گریبان تک آئے گا۔ ملبوس رنگین تر ہوگا۔ انگلیوں کے اشارے اور منافق مسیحاؤں کے دو نمبر ٹوٹکے ساتھ ساتھ چلیں گے۔

☆......☆......☆

''ہمیں کیا تیاری کرنا ہے۔ بیس تولہ سونا ایمن کے لاکر میں دھرا ہے۔ دس پندرہ ساڑھیاں ایک ایک مرتبہ

کی پہنی ہوئی۔ گرم کشمیری شالیں، سوئٹر، کوٹ، آرٹیفیشل جیولری ایک سوٹ نکاح کا ایک ولیمے کا، 100 بندوں کا ولیمہ...... وہ بھی گھر پر......"

"آپ کیوں اتنا غور و فکر کرنے لگے۔" فردوس بڑی لگاوٹ سے حامد حسین کے بازو پر ہاتھ دھرے تسلیاں دے رہی تھیں جوار جنٹ شادی کے اخراجات پر غور و فکر کر رہے تھے۔

"ہوں......" حامد حسین نے لمبا سا ہنکارا ابھرا۔ جیسے گاڑی آدھا کلومیٹر سے ریورس کی ہو۔

"عام سے لوگ ہیں۔ دس پندرہ ہزار کا نکاح کا سوٹ دیکھ کر بھی خوش ہو جائیں گے۔ اور جو ڈھیر سونا دیکھیں گے تو ہوش ہی کہاں رہے گا کہ کپڑے مہنگے ہیں یا سستے...... دو چار جوڑی سینڈل، 4-6 کلچ اور ہینڈ بیگ......"

"اسی لیے تو کہتے ہیں بیٹے کی بری بازار میں کھڑی۔" فردوس بڑی ترنگ میں بول رہی تھی۔ گویا بہو پوتا بھی ساتھ جہیز ہی میں لا رہی ہو۔

"ایمن کی ساری جیولری تو تمہارے پاس ہی ہے ناں۔ اس کی ماں کے گھر تو کچھ نہیں ہے۔ یاد کرلو......" حامد حسین کو خوامخواہ کے اندیشے نے ستایا۔

"ارے سونا اتنا مہنگا ہو گیا ہے ایک انگوٹھی لینے جاؤ تو دس ہزار میں ملے گی۔ وہ بھی چاول برابر وزن کی۔"

"ایک انگوٹھی اور چین تو وہ پہنے رہتی تھی۔ وہ اس کی ماں کے پاس ہی ہوگی۔"

"خیر چھوڑیں...... بچیاں تو انہی کے پاس ہیں۔ ماں کی ایک آدھ نشانی رہنے دیں ان کے پاس۔" فردوس نے حاتم طائی کی قبر پر لات جمائی۔

"ارے مشکور صاحب مرا ہاتھی ہیں۔ جو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ قبر میں لیکر جائیں گے سب کچھ ایک داماد ہی ہتھیا لے گا۔ اب ایک بیٹی ہی تو وارث ہے۔ بیٹیاں وہاں نانا کے گھر رہیں گی تو اپنا جائز حصہ وصول کریں گے۔ مشکور صاحب کوئی احسان نہیں کریں گے ان پر، ان کی ماں زندہ ہوتی تب بھی تو دیتے۔" حامد حسین کی شیطانی کھوپڑی خوب کام کر رہی تھی۔

"ماشاء اللہ آپ بہت عقل مند ہیں۔ بہت دور کی سوچتے ہیں۔" فروس نے تو گویا میاں کی بلائیں ہی لے ڈالیں۔

"مشکور صاحب نواسیوں پر خرچہ کریں۔ ہم اپنے پوتوں پر لٹائیں گے۔" فردوس نے بڑے ناز سے مسکرا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

"پوتے...... پہلے بیٹے کا سوگ تو ختم کرو۔ وہ تو ابھی شادی کی بات ہی سننے کو تیار نہیں۔" حامد حسین کو اچانک یاور کی خاموشی اور کم گوئی کا خیال آیا۔

"ربیعہ کو آنے دیں پھر دیکھیے گا ہر وقت ہنستا مسکراتا نظر آئے گا۔ سمجھا کریں دنیا کی شرما شرمی میں منہ بنا کر پھرتا ہے۔ اسے کون سا ایمن سے محبت تھی۔ ذرا سا بولتی تو دو چار جڑ دیتا تھا۔ بیٹیاں پیدا کرنے کی مشین تھی۔ ایسی عورت شوہر کو پیاری ہوتی ہے؟ ہونہہ......"

"خیر اب ایسی بھی نہیں ہے، احساس تو کرتا تھا۔"

"تمہاری خوشی کی خاطر دو چار لگا دیتا تھا۔" حامد حسین کو اب بہت زور سے نیند آنے لگی تھی۔

اور نیند ہی میں اتنی تاثیر وقوت اللہ نے رکھ دی ہے کہ بڑے بڑے مجرم نیند کی حالت میں سچ اُگلنا شروع کر دیتے ہیں۔

نیند ضد اور ڈھٹائی کو یوں توڑتی ہے جیسے سیلاب تنے ہوئے درختوں کو ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔

☆......☆......☆

''جوان...... حسین...... کم عمر بیوہ...... جس نے جمعہ جمعہ آٹھ دن سہاگ کی خوشیاں دیکھیں۔ سرشاری کی کیفیت ادھوری رہی۔ درمیان میں لامتناہی جدائی اور فاصلے...... ہر وقت بچھڑنے والے کی جدائی کا دکھ۔

''نہیں نہیں...... مجھے تو صاف...... سلیٹ جیسا...... سچے موتی جیسا شفاف دل چاہیے کوئی ٹوٹ کر چاہے۔ محبتوں کے باب میں اب منافقت برداشت نہیں ہوگی۔ کوری مٹی کے نئے پیالے جیسا دل، جس میں ہر آن محبت کا امرت ٹپکتا ہو۔

''بانو آپا...... کچھ دیر قبل وجیہہ کے قصیدے پڑھ کر ثمر کا ذہن اُلجھا کر جا چکی تھیں۔

''ارے صورت دیکھو جیسے شیشے کی بوتل میں تازہ شہد...... قد دیکھو جیسے ماہتابی چھوتی ہے۔ اور شادی شدہ ہونے کے باوجود ایسی حیا کہ ہر وقت اپنے آپ کو لپیٹ سپیٹ کر رکھتی ہے۔ خاندانی رئیس لوگ...... بیٹی کو کار ڈرائیور الگ سے دیا ہوا ہے۔ اس کی اپنی کار ہے جہیز میں ساتھ لائے گی۔ سنا ہے ان کا مری میں کوئی گیسٹ ہاؤس بھی ہے۔ اس میں دونوں بہوں کا حصہ ہے۔ بیٹے کا بتا رہی تھیں کہ اس کو شادی کے بعد اس کا حصہ دے دلا کر فارغ کر دیا تھا۔

بانو آپا ایک بہترین سیلز مین کی طرح پروڈکٹ کی خوبیاں گنوا رہی تھیں اور ثمر کا ذہن صرف 'بیوہ' میں اٹکا رہا۔ اس کو تو ڈپریشن کے دورے بھی پڑتے ہوں گے۔ نئی نئی شادی ختم ہوئی، ٹریجڈی بھی تو قیامت ہے۔ '22-23 سال کی ناتجربہ کار لڑکی اور بیوہ' ثمر کا دل کسی طور مان کر نہیں دیا۔

بیڈ روم میں لاتعداد معرکوں سے گزرنے کے بعد اب وہ کسی نئے محاذ کی طرف جانے کے تصور سے بھی خوفزدہ تھا۔

''شاید اسے پہلے والا یاد آ رہا ہے۔ اسی لیے اتنی چپ چپ ہے۔''

''اس نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا۔ شاید ڈپریشن میں ہے۔''

''اوفوہ...... بہت کام نکلے گا۔ اس سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے کہ میں ندا جیسی بے وقوف و معصوم لڑکی سے شادی کرلوں۔ ایک اچھی لڑکی کو تحفظ کا احساس مل جائے گا۔ کبھی ماضی کی بات چھیڑے گی تو ایک ہلکی ڈانٹ پر خاموش بھی ہو جائے گی۔

''یہ...... ندا...... درمیان میں کہاں سے آ گئی۔'' بے خواب آنکھیں حیرت سے ساکت ہونے لگیں۔

''لاحول ولاقوۃ...... میں نے تو کبھی غلطی سے بھی اس پر پسندیدگی کی ایک نظر نہیں ڈالی۔ وہ اپنے ہی خیال سے بدحواس ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسے واقعی اس خیال پر دلی ندامت سی ہونے لگی کہ رات کے اس پہر اسے ندا کیوں یاد آئی...... شاید اس لیے کہ وجیہہ کے تقابل کے لیے دوسرے کنارے پر کوئی اور بھی نظر آنا چاہیے تھا۔

یا پھر عمر کی مماثلت کے باعث اسے ندا کا دھیان آ گیا تھا۔

وجیہہ بیوہ تھی اور ندا کنواری...... از حد شریف...... جس کا ثبوت اس کا پڑوس تھا جو ندا سے پیار کا اظہار کرتے تو دیکھنے والے کو محسوس ہوتا کہ انہیں یہ لڑکی کتنی پیاری اور عزیز ہے۔ جس سے پیار بھی کرتے نظر آتے ہیں اور اس کی عزت بھی...... پڑوسیوں سے زیادہ مضبوط گواہی کسی کی نہیں ہوتی۔

"یا پھر...... اس سے بھی بڑھ کر گواہی اپنے دل کی ہوتی ہے۔ صاف شفاف بلور جیسے دل والی لڑکی...... کبھی اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرے گی جہاں چمن کے دیے ہوئے زخموں کی کثرت کے سوا دوسرا کوئی نشان نہیں۔

انتخاب آسان تھا مگر مراحل کڑے تھے۔

مردانہ نفسیات کے تحت ایک شریف' پاکباز' کم عمر سب سے بڑھ کر بے وقوف سادہ سی لڑکی......! عموماً مردوں کو سادہ بھولی بھالی بیوی سے بڑی سہولت رہتی ہے۔ دو چار حسین فقیرے کہہ دیے اور جان چھڑالی بیوی اگلے دو دن تک بدمست اور یہ اپنے اُلو سیدھے کرنے میں مصروف بے وقوف اور حسین بیوی تو مرد کے لیے جنت کی حور ہوتی ہے۔

دل بہلاتی رہے...... مسکراتی رہے خدمات بجالاتی رہے۔ بس کچھ سوال جواب نہ کرے۔

ثمر بذات خود بھی بہت شریف اور باکردار انسان تھا۔ اس کے زندگی میں کبھی خفیہ معاملات نہیں رہے۔ مگر وہ ایک بہت مشکل شادی اور ذہین عورت سے گزرنے کے بعد صرف Relexed ہونا چاہتا تھا۔ وجیہہ سے شادی کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا امی......

چمن کا غرور وجیہہ سے نہیں...... صرف ندا سے ٹوٹ سکتا ہے۔

"لیکن...... کیا یہ ممکن ہوگا...... ندا کا نانا' اوہ گاڈ!"

"مشکور صاحب کی دو بیٹیاں دو داماد"

ایک کو کہنی کی چوٹ لگی تھی۔

دوسرے کو اَنا کی چوٹ......

جس طرح بخل اور ایمان ایک دل میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح اَنا اور محبت بھی ایک دل میں بسیرا نہیں کر سکتیں۔ بستروں کے شراکت دار بدلنے کی صورتیں بن رہی تھیں۔ اندھے دل سفید لاٹھیاں ٹٹول رہے تھے۔

☆......☆......☆

نورالعین نرسری میں تھی۔ چمن کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نام و نشان نہ تھا۔ کبھی نورالعین کی طرف جانا' کبھی ثمر کی طرف' زمین سے آسمان کی طرف ایک برف کی چادر تنی ہوئی تھی۔

خفا تو اگرچہ ہمیشہ ہوئے مگر اس بار
وہ برہمی ہے کہ ہم سے انہیں گلے بھی نہیں

جانے کب کا حاصلِ مطالعہ شعر یادداشت کے روزن سے جھانکنے لگا۔ جو اس وقت اس کی کیفیات کا مکمل ترجمان تھا۔

اسی لمحے اس کے سیل پر بیل ہوئی۔ دل بڑے زور سے دھڑکا۔ سکڑا' سمٹا پھر پوری قوت سے پھیلا۔

"آخر...... خیال آ ہی گیا...... اس نے خوش گمانی کا ہلکورا محسوس کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھایا۔

مگر سامنے 'امی' کا لفظ بلینک ہو رہا تھا۔
"السلام علیکم امی......" اس نے گہری سانس لے کر کال ریسیو کی۔
"وعلیکم السلام...... جاگ رہی ہو۔ نور العین کی طبعیت میں کچھ فرق ہے؟" عطیہ بیگم کی متفکر آواز سماعت سے ٹکرائی۔
"ابھی تو نرسری میں ہی ہے امی...... کوئی خاص امپروومنٹ نہیں ہے۔" چمن نے تھکے تھکے دل شکستہ انداز میں جواب دیا۔
"بہت دعائیں کر رہی ہوں...... اللہ...... اچھی خبر سنائے۔ تم بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر بیٹھی ہوئی ہو۔ تمہاری بھی فکر لگی رہتی ہے۔" عطیہ بیگم کے لہجے سے تفکرات بارش کی طرح برستے محسوس ہوئے۔
"امی...... اس بچی کی پیدائش سے پہلے آپا جن حالات سے گزری ہیں۔ وہ تو پتا ہی ہے۔ ان کے اپنے اندر کچھ نہیں بچا تھا۔ بچی کو کیا دیتیں...... نہ خوراک کے ذریعے بچی کو کچھ ملا نہ روحانی فیض پہنچا۔ اپنی ڈپریسڈ ماں ایسی ہی تخلیق کر سکتی تھی۔ چمن کے لہجے میں آنسو یوں محسوس ہوئے گویا قرض خواہ اُدھار کھائے بیٹھے تھے کہ موقع ملے اور قرض وصولی کو پہنچیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ثمر کا فون بھی آتا ہوگا۔ ظاہر ہے بیوی گھر میں نہیں ہے مرد کو پریشانی تو ہوتی ہے۔ اللہ اسے اجر دے۔ بہت تعاون کر رہا ہے۔ اب اسے دعا ہی دے سکتی ہوں۔
عطیہ بیگم بول رہی تھیں۔ چمن کے حواسوں پر برف جمتی جا رہی تھی۔
میری پوری زندگی بد دعا بنا دی۔ کسی دعا کا حق دار تو نہیں۔
"مگر اس وقت یہ بات آپ کو کیسے بتاؤں؟"
ماں کی آواز دکھ کے موسم میں ٹانکے ادھیڑ دیتی ہے۔ دل بھرا ہو تو ماں کے سامنے آنسو بہانے کا اپنا ہی لطف ہے۔ مگر ماں خود رو رہی ہو تو اس کے سامنے رونا گناہ ہے۔ اس نے جلدی سے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ کیونکہ اسے خود پر کنٹرول کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔
سیل فون ایک طرف پھینک کر وہ تکیے پر اوندھ گئی۔ یوں جیسے سجدہ کی حالت میں ہو۔ پھر بری طرح تڑپ تڑپ کر روئی۔ اونچے درجے کا سیلاب تھا خطرے کا نشان کراس کر چکا تھا۔ تب ہی روتے ہوئے آس پاس کا ہوش نہیں رہا۔ شاید وقتی طور پر اس کا رشتہ زمان و مکان سے آزاد ہو چکا تھا۔
ہر سسکاری کسی بھٹی سے نکل رہی تھی اور ماحول سُلگ رہا تھا۔
"ایکسکیوزمی...... میم...... آپ کیوں رو رہی ہیں۔ بچی کو آپریشن کے لیے لے جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ، بہتری ہی آئے گی۔ آپ کیوں اتنی ہوپ لیس ہو رہی ہیں؟"
اس کے سر پر سسٹر کب مسلط ہوئی اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا تو رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔
سامنے ڈاکٹر علی عثمان بہت متذبذب کیفیت میں بڑی گہری نگاہ سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"یہ بچی کی ماں نہیں ہے...... خالہ ہے...... مگر رونا تو ماں جیسا ہے۔ ایسی خالہ تو شاید ہی ہوگی۔"
"یہ کس طرح رو رہی ہے یہ رونا کچھ اور طرح کا ہے۔ اس رونے میں بہت خاص بات ہے۔ یہ آنسو بہت معنی خیز ہیں۔ یہ بے ساختگی یہ بے اختیاری بہت با معنی ہے۔ ڈاکٹر علی عثمان کو اس کے آنسو بہت پُراسرار لگ

رہے تھے۔ اس لیے بھی کہ ابھی تو اسے تازہ ترین سچویشن کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ بچی نرسری میں تھی متعلقہ نرس بھی وہیں تھی۔

سوری...... بس یونہی دل پریشان ہو رہا ہے۔ اتنی معصوم اتنی چھوٹی سی بے بی...... کتنے مشکل وقت سے گزر رہی ہے۔

چمن ڈاکٹر عثمان کی معنی خیز نظر سے نظر چرا کر گویا آنسوؤں کی وضاحت پیش کرنے لگی۔

''اللہ بہتر کرے گا۔ ایک گھنٹے بعد بے بی کا آپریشن شروع ہوگا۔ آپ کو اب پہلے سے زیادہ ہمت سے کام لینا ہے۔

اور یہ بات آپ کو بتانے والی تو نہیں کہ مسیحا کوشش کرتے ہیں۔ مگر شفا تو اللہ ہی دیتا ہے۔ وہ بہت دل سوزی سے چمن کو حوصلہ دے رہے تھے۔ میم آپ کاؤنٹر پر آجائیں۔ آپ کو ایک فارم فل کرنا ہے۔

نرس ڈاکٹر علی عثمان کے برعکس پروفیشنل اور مشینی انداز میں مداخلت کرنے لگی۔

''اوہ...... لیس...... پلیز......'' ڈاکٹر علی عثمان نے بھی محتاط انداز میں اپنا انداز تبدیل کیا۔ اور آنسوؤں کے سحر سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے تیزی سے باہر چلے گئے۔

چمن ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

حادثہ پس منظر میں چلا گیا۔ افتاد آگے آگئی۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی گاؤں میں مدتوں بعد میلہ لگتا ہے۔ میلے کی خبر کے ساتھ ہی گاؤں کا ماحول یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ مائیں بچوں کو عید کے کپڑے پہنا کر میلے میں لاتی ہیں۔ خود بھی کب کب کے سینتے ہوئے کپڑے پہنتی ہیں۔ بچوں کو اِدھر اُدھر لے کر گھومتی ہیں۔

چند دنوں کے لیے گاؤں عروس البلاد بن جاتا ہے۔

پھر اسی گاؤں میں مدتوں بعد کالی آندھی بھی آجاتی ہے۔ ہر چیز پوری قوت سے ہوا کے زور پر اکھڑنے لگتی ہے۔ درخت بھی اکھڑتے ہیں اور پاؤں بھی۔

ماؤں کے ہاتھ سے بچوں کے ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے بچوں کو پکارتی ہیں۔ بچے جواب بھی دیتے ہیں مگر آندھی کی شوں شوں ناگ کی طرح معصوم کمزور آوازوں کو دبا دیتی ہے۔

پھر بالآخر آندھی رک جاتی ہے۔

رشتے، پتے، رابطے سب ٹوٹ جاتے ہیں۔

چمن لال آندھی سے گزر کر کالی آندھی کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

ننھی نور العین کی ڈیڈ باڈی اس کی گود میں تھی۔

یہ تو ہونا تھا......

ادھوری ذات......

ادھوری نشو ونما......

کمزور دل......

جگر......دنیا میں آنے سے پہلے ہی پاش پاش......

زندگی کے لیے ماں کی دعا سے محروم بے مایہ سی ذات......

یہی ہونا تھا......

مسیحا تو ہمیشہ اچھی باتیں کرتے ہیں......تقدیر تو نہیں لکھتے......

وہ آنکھیں پھاڑے نورالعین کے مردہ چہرے کو دیکھ رہی تھی......

ماں سے ملاقات کا خوشگوار احساس اس کے معصوم چہرے پر نقش ہو گیا تھا۔

سکون کا عرفان اس شیر خوار کے چہرے پر یوں ثبت تھا کہ مصور مصوری سے توبہ کر لے۔

اس لطیف منظر کو کسی خاکے میں پرونا کسی تصویر کش کے بس کا روگ نہیں تھا۔ البتہ اس لازوال سکون و مسکراہٹ کو دیکھ کر موت سے پیار کا جذبہ ضرور ابھر سکتا تھا۔ اس نے جھک کر نورالعین کی سرد پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

یوں جیسے برف پوش پہاڑوں سے آنے والے ہوا کے جھونکے نے اس کے ہونٹوں کو چھوا ہو۔ ڈاکٹر عثمان اس سے دور نہیں تھے۔

وہ اس کی کیفیات ملاحظہ کر رہے تھے مگر قریب آنے سے گریزاں تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ جھوٹی تسلیوں سے شرمسار تھے۔ اس لیے کہ وہ اس مرحلے کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں بہت سی ماؤں کو تسلی دی تھی اور گود میں مردہ بچوں کے وجود بھی......یہ تو پھر معصوم کی خالہ تھی۔

انہوں نے تو پہلی بار مردہ بچے کی ماں بننے والی ماں کو بھی بہت مرتبہ سنبھالا تھا۔ اور چار بیٹیوں کے بعد مردہ بیٹا جنم دینے والی ماں کو بھی حوصلہ دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے چمن کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

اس کے چہرے پر ایک معنی خیز سکوت تھا۔

تابوت سکینہ جیسا پُر اسرار سکوت......

تابوت سکینہ کے تبرکات' عصا' عمامہ' تورات کی تختیاں......طور کے راز و نیاز......

اس دنیا میں بے شمار دل ایسے ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک تابوت سکینہ کا استعارہ ہوتا ہے۔

بہت لوگ ایسے دل کے پیچھے پڑتے ہیں۔ کھوج کرتے ہیں۔ مگر صندوق نہیں کھلتا۔

کچھ تھا......کیا تھا......کچھ سمجھ نہیں آئی......چپ چاپ اپنے قدموں پر لوٹ گئے۔

☆......☆......☆

یاور علی الصباح آ گیا تھا۔ بڑی بات تھی۔ بچی کی تدفین بہت خاموشی سے عمل میں آئی اس لیے کہ دونوں معصوم بچیوں سے یہ بات فی الوقت پوشیدہ رکھنے کی ضرورت تھی۔ جو پہلے ہی ماں کی جدائی کے صدمے سے دوچار تھیں۔ باپ سے دور تھیں۔ حالات سے خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھیں۔

یہ صائب مشورہ بھی مشکور احمد کی طرف ہی سے آیا تھا کہ اللہ کی رضا پر راضی ہو کر اس صورت حال سے بھی صبر کرتے ہوئے گزر جاؤ۔ غم سہتے ہیں خوشی مناتے ہیں۔

یاور رسمی کارروائیاں نباہ کر جو بحیثیت باپ اس کی ذمہ داری بنتی تھیں یوں سر جھکا کر منظر سے غائب ہو گیا۔

جیسے کوئی راہ گیر پیچھے سے آ کر تیزی سے آگے نکل جائے۔ مشکور احمد اپنے معمول کے مطابق بچیوں کو اسکول ڈراپ کرنے چلے گئے۔ چمن کئی دنوں کی شب بیداری کے بعد لیٹی تو اسے اپنی سدھ نہ رہی۔ اس پر عطیہ بیگم نے بھی بہت احتیاط کی کہ اس کے کمرے تک کسی قسم کی آہٹ نہ پہنچے۔ اولاد کی پُرسکون گہری نیند ماں کی توانائی کا خزانہ ہوتی ہے۔

بچہ پُرسکون سو رہا ہو تو ماں کی بیٹری چارج ہو جاتی ہے۔

سوگوار لمحوں میں بھی وہ اتنی فعال ہو گئیں کہ ضروری کام جلدی جلدی نمٹانے لگیں۔ اور خیال ہی نہ آیا کہ چمن کے سسرال یا شوہر نے ابھی تک تعزیت ہی نہیں کی۔ عظیم دکھ پہلے ذات سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ پھر رشتے داروں سے۔

☆......☆......☆

''کیسی معنی خیز... لامتناہی، بے رحم، جامد، ساکت، غیر متغیر، خاموشی تھی۔ آندھی کے تیز جھکڑوں کے دوران ایک غیر محسوس سا وقفہ بھی ضرور آتا ہے جب تیز جھکڑ وقتی طور پر ہلکے پڑتے ہیں پھر نئے سرے سے شدت میں بھی آجاتے ہیں۔ فجر سے کچھ پہلے نیند ٹوٹی تو پہلا خیال یہی آیا۔

''اتنے دن گزر گئے۔ اس نے اپنی اَنا کے پھن کو کچل کر رابطہ کرنے کی کوشش تو کی تھی اس وقت غصہ شدید تھا بعد میں تو کچھ خیال آسکتا تھا۔

اس نے گہری سانس لے کر بستر چھوڑ دیا تھا۔ کمرے میں نظر دوڑائی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ نورالعین کی چھوٹی موٹی ضروریات کی چیزیں اب کمرے میں نہیں تھیں۔ اس کا فلاسک، دودھ، باسکٹ، بیگ، فیڈر، ٹاول، نیپکن، آئل، پاؤڈر، نیٹ...... عطیہ بیگم نے کمال ہوشیاری و احتیاط سے سب کچھ سمیٹ دیا تھا۔ تب اسے خیال آیا کہ وہ مدت بعد کتنی گہری نیند سوئی تھی کہ کمرے میں اتنا کام ہو گیا مگر اسے پتہ ہی نہ چلا۔

عطیہ بیگم کی بلا کی احتیاط، احساس اپنی جگہ...... مگر وہ ابھی تک نورالعین کی خوشبو کے دھارے میں تھی۔

اتنے دن اسے سینے سے لگا کر رکھا کہ روح میں اس کی خوشبو حلول کر گئی تھی۔ اسے اپنے وجود سے نورالعین کے ملبوس کی مہک آرہی تھی۔

چند لمحے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر غور سے دیکھا۔ اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''خالہ کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ ٹھیک ہے بیٹا۔ ماں ماں ہوتی ہے خالہ خالہ ہوتی ہے۔ اپا...... اب تو خوش ہوناں...... نورالعین اب تمہارے پاس ہے۔''

خاموش آنسو رخساروں پر ٹپکے اور اس نے آہستگی سے پوروں میں جذب کر لیے اور وضو کی نیت سے واش روم کی طرف بڑھی۔

آگے بڑھتے بڑھتے معاً خیال آیا...... واپس پلٹی اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ کوئی میسج ...... کوئی مس کال...... کچھ نہیں تھا۔ دو چار میسجز سیلولر کمپنی کے تھے جن میں بہت پُرکشش آفرز تھیں۔ 10 روپے میں چوبیس گھنٹے مفت میں بات بھی ہو سکتی تھی۔ اور تین روپے میں ساری دل کی باتیں بھی کی جاسکتی تھیں۔ کچھ نہ چھوڑو...... سب کہہ دو۔''

اور پھر سب کہنے کے بعد......؟ چمن کے ہونٹوں پر افسردہ اور تلخ مسکراہٹ کا بڑا تاریخی امتزاج اترا۔

"سب کہہ دیا...... کچھ بھی نہ چھوڑا۔"

☆......☆......☆

"امی جان...... آپ کے لیے کیا یہ کافی نہیں کہ میں آپ کی خوشی کی خاطر دوسری شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اب آپ مجھے اس طرح Bound نہ کیجیے کہ اس سے کرلو...... یا اُس سے کرلو...... پہلے بھی میں نے آپ ہی کی پسند کی لڑکی سے شادی کی تھی۔

ثمر ناشتے کی میز پر بانو آپا سے بالکل صاف صاف بات کررہا تھا۔ بانو آپا خوشی و حیرت سے ثمر کے اندر بہت بڑی تبدیلی دیکھ رہی تھیں۔

سیلاب اتر گیا تھا۔ آندھیاں تھم گئی تھیں۔ زندگی آگے کی طرف دوڑنے کے موڈ میں نظر آرہی تھی۔ وہ بھی بڑی سرعت کے ساتھ...... جیسے اکھاڑے میں ہارنے والا پہلوان اپنے آخری داؤ پر جان لڑادے اب تو اتنی جلدی تھی کہ آج شادی ہو اور نویں مہینے بچہ......"

سائنس و ٹیکنالوجی کی اس ترقی نے بھی فطرت کو ابھی تک عاجز نہیں کیا تھا کہ کوئی کیمیائی غذا جو پولٹری فارمز میں استعمال ہوتی ہے۔ دھڑا دھڑ انڈے دھڑا دھڑ بچے...... اسی پیٹرن پر کسی حاملہ سے تیس دن میں بچہ وصول کرلے دوسری شادی اور پھر بچے کا انتظار...... کم از کم ایک سال تو جانگسل انتظار سے گزرنا ہی تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم جس سے بولو گے وہیں رشتہ کرنے چلی جاؤں گی۔ مگر ابھی تو تمہیں دیکھنے ڈھونڈنے میں بھی ٹائم لگ جائے گا۔"

"یاد رکھو بیٹا...... اب ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ پہلے ہی ایک منحوس نے ہمارا بہت وقت ضائع کیا ہے۔ بانو آپا کو شوق کی انتہا پر آنے والی رکاوٹ سے از حد کوفت ہورہی تھی۔

میں آج ہی آپ کو اس لڑکی سے ملوانے لے جاؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ بانو آپا کے ہاتھ سے کافی مگ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ آنکھیں پھاڑ کر ثمر کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے ذہنی توازن پر شک ہورہا ہو۔

"ائے ہئے اس جنم جلی کے صدمے کی وجہ سے کہیں اس کے دماغ پر اثر تو نہیں ہوگیا، پہلا خیال تو یہی آیا۔"

"پہلے سے کوئی چکر چل رہا تھا بیٹا...... ایسی بات تھی تو مجھے تو بتادیتے۔ پھر یہ ڈھول گلے میں لٹکا کر کیوں بجا رہے تھے؟" بانو آپا ہنوز دم بخود تھیں۔

"کوئی چکر نہیں چل رہا تھا امی...... میں نے تو آج سے ایک دن پہلے اس کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ آپ جانتی ہیں میں کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ ثمر نے اپنی چائے بناتے ہوئے بہت مشینی انداز میں بات کی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ اس وقت ماں سے کسی جذباتی اور نازک مسئلے پر بات کررہا ہے۔

"تو بیٹا...... پھر ایک دم سے وہ کیسے تمہارے خیال میں آگئی۔" بانو آپا ششدر ثمر کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

"نظریہ ضرورت کے تحت...... اچھی لڑکی ہے...... کم عمر ہے، بے وقوف ہے میرا مطلب ہے سیدھی سادی، نیک شریف لڑکی ہے۔ بہت مشکل میں ہے آپ کو بہو اور مجھے بیوی چاہیے۔ اور اسے احساسِ تحفظ اور چار دیواری ثمر نے بانو آپا کی تسلی کی خاطر کچھ الفاظ بوجھ کی طرح ادا کیے۔

"بیٹا شکل صورت کی کیسی ہے؟ خاندان کیسا ہے؟ کہاں رہتے ہیں؟" بانو آپا محاورتاً آج نکاح کرنے کی بات کرتی تھیں مگر یہ سب کچھ اتنا اچانک اور تیزی میں بھی ہوسکتا ہے یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"امی...... میں نے وکیل سے طلاق کے پیپرز تیار کرنے کی بات کرلی ہے۔ میں چاہتا ہوں طلاق کے پیپرز کے ساتھ میری شادی کی خبر بھی اس کو مل جائے۔ ثمر نے چائے کے دو تین گھونٹ جلدی جلدی لیے۔

عورت نے مرد کی مردانگی کو گالی دی ہوئی تھی۔

تختہ دار پر پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہوا تھا۔ جلاد غائب تھا۔

ماں کو شکل وصورت خاندان کی پڑی ہوئی تھی۔ وہ چائے کا کپ رکھ کر کرسی دھکیل کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے شاہ جی آپ کی...... مان گئی......"

"ماشاء اللہ میرا بیٹا دوسری شادی کرنے یوں جا رہا ہے جیسے کونے کی دکان سے پان لینے......" بانو آپا کو اچانک کامیابی کے نشے نے اپنے حصار میں لے لیا۔

"چڑھاوے کی چادریں، منت کی دیگیں، مدرسے کی مٹھائی، اب وہ اپنی نذریں نیازیں مرتب کر رہی تھیں۔ شاہ جی کو ایک لاکھ تو ویسے ہی اقساط میں پہنچا چکی تھیں۔

☆......☆......☆

"تم ناسمجھ ناتجربہ کار بچی ہو۔ یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ کمزور عورت کی پشت پر طاقتور زوردار کا سہارا ہو تو لوگ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ پھر شرع میں اجازت ہے کوئی قباحت نہیں۔"

شبیر حسین ہانپتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان میں ندا کو قائل کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ نیم مفلوج جسم و ذہن دانائی سے محروم ہو کر صرف شیطانی وسواس اور مصلحتوں کے دائرے میں چکرا رہا تھا۔

ندا کی شریانوں میں اگرچہ جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ مگر اسے اس وقت اپنے اختیار و قوت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی تھا اور شبیر حسین کی بے بسی کی انتہا بھی معلوم تھی۔ شرع کی بات کرتے ہیں تو نانا جان سن لیں شرع کسی لڑکی کو نکاح پر مجبور نہیں کرتی۔ بس آپ اس بات کو ختم کریں۔

"وہ عیاش بڈھا اب ذرا اس گیٹ کے سامنے سے گزر کر تو دیکھے۔ پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں گی۔" شبیر حسین تو اتنی خوفناک دھمکی پر تھرا کر رہ گئے۔

"ارے تمہارے ماموں کسی قابل ہوتے تو ہم یہاں تک پہنچتے ہی کیوں...... اپنے بیٹے سے بیاہ سکتے تھے مگر وہ ملعون بھی انگریز سے شادی کر کے بیٹھ گیا۔ ہمارے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں۔ کب تک تمہاری چوکیداری کریں گے۔ شبیر حسین کی آنکھوں سے آنسو یوں بہہ نکلے گویا پتھروں سے چشمہ پھوٹا ہو۔

"نانا جان...... جوان فوجی جنگ لڑنے جاتے ہیں۔ شہید ہو جاتے ہیں۔ ان شہیدوں کی بیوائیں بھی جوان ہوتی ہیں۔ ساری زندگی دوسری شادی نہیں کرتیں۔ آپ جیسے خوفزدہ لوگ عورت کا ستیاناس مار دیتے ہیں۔ ڈرا ڈرا کر موت سے پہلے مار دیتے ہیں۔"

"اگر اب آپ نے حکیم صاحب کا نام لیا تو سمجھ لیں۔ میں ان کو جان سے مار کر چودہ سال کے لیے جیل چلی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کمزور، سن رسیدہ، مفلوج بوڑھا بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کسی دست شناس سے سوال ہوا ہاتھ کی لکیروں میں سب سے طاقتور لکیر کس کو کہتے ہیں؟ دولت کی لکیر...... شہرت کی لکیر...... قسمت کی لکیر......؟ قوسِ سلیمانی،

اسٹار اسکوائر ٹرائی اینگل سرکل جال دست شناس مسکرایا اور بولا۔
''سب سے پہلے بے چارے کے دماغ کی لکیر ضرور دیکھ لیجیے۔'' جس انسان کا ذہن ساتھ چھوڑ چکا ہو۔ اس سے افلاطونی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔''
اس لیے ندا نے اندر سے اٹھنے والی وحشت ناک چیخ پکار کو اندر ہی روک لیا۔ اب اسے نانا پر غصہ نہیں ترس آرہا تھا۔

☆......☆......☆

''ہائے امی جان...... یہ کیا کہہ رہی ہیں...... وجیہہ سے اچھی لڑکی تو مل ہی نہیں سکتی۔ لگتا ہے کسی مکار چالاک لڑکی کا جادو چل گیا ہے بھائی جان پر۔ کہاں تو دوسری شادی کا سن کر ہتھے سے اکھڑ جاتے تھے کہاں...... بیگم کو چلتا کرتے ہی دوسری کرنے کے لیے دوڑے......''
''امی جان...... مجھے تو کوئی بڑا چکر ہی لگ رہا ہے۔ افشاں اواہی تباہی بولنے لگی۔ چھناکے سے سپنوں کا محل زمین بوس ہوا تھا۔ وجیہہ کو بھابی کے روپ میں دیکھنے کے لیے اس نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔''
''جانے کتنی کانٹی نینٹل ڈشز کے تجربے سے گزری...... یہ بنا وہ بنا بھاگم بھاگ پلیٹ لے کر پہنچی۔ بہانے سے شاپنگ پر ساتھ لے گئی۔ ہزار دو ہزار تحائف پر ٹھنڈے کر دیے۔
اللہ جانے ثمر کس شاطرہ کے پھندے میں پھنس گیا۔ کہیں چمن کی بھی کوئی استاد ہی نہ ہو۔ گھر، دولت، بیٹا...... سب ہاتھ سے گیا۔ افشاں کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔
''دھیرج بیٹا...... ارے شکر کرو۔ اس نے دوسری شادی کی حامی تو بھری۔ بانجھ بنجر سے جان تو چھوٹی...... اللہ نے چاہا تو اگلے برس پوتے کا عقیقہ کروں گی اور اخبار میں فوٹو لگواؤں گی۔
بانو آپا کا جوش و خروش دیدنی تھا۔
''بس کر دیں امی جان...... آپ تو بہت ہی سیدھی ہیں۔ یہ ایک دم سے بھائی کو مل کہاں گئی؟ بھابی کو گئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟ امی جان لگتا ہے ہم پھر کسی غلط جگہ پھنسنے جارہے ہیں۔ افشاں کسی طور یہ تبدیلی ہضم کرنے کو تیار نہیں تھی۔
''باؤلی ہوئی ہو...... میں کون سا انگوٹھی پہنانے جارہی ہوں۔ لڑکی دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ نہیں سمجھ آئی تو پھر دیکھیں گے۔''
بھائی فیصلہ کر چکے ہیں تو آپ کو لے جانے کی بات کر رہے ہیں۔ امی جان دیکھ لیں۔ یہ بہت بڑا رسک ہوگا۔
افشاں کا دل بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ چمن کی مروت رواداری، صبر و برداشت نے اپنی جگہ تو بنائی ہی تھی۔ دل کا چور شور تو مچا رہا تھا۔ آنے والے کسی ناپسندیدہ حادثے کے اندیشے تو جگا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''امی...... آپ پتہ نہیں کیا کیا سوچ کر خود کو الجھاتی ہیں۔ ثمر کو تین چار دن کے لیے اسلام آباد جانا تھا۔ میری روز بات ہو جاتی ہے۔ نور العین کی ڈیتھ والے روز وہ یہاں تھے ہی نہیں۔ اور امی جان کا تو آپ کو پتہ ہی ہے وہ تو اپنے بیڈروم سے ہی بہت مشکل سے نکلتی ہیں۔ ان کو تو میڈیکل چیک اپ کے لیے لے جانا ہی بہت بڑا مرحلہ ہوتا ہے۔

چمن عطیہ بیگم کو بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔ جو اس بات پر حیران اور افسردہ تھیں کہ اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی سمدھیانے سے کوئی تعزیت کے لیے نہیں آیا۔ ماں کا دل بہت بولتا ہے۔ ماں کے اندیشے اکثر بے بنیاد نہیں ہوتے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ چمن بہت پُرسکون ہو کر ماں باپ کا ساتھ دے رہی تھی۔

"مگر...... ریشم کی ڈور میں کہیں کوئی گانٹھ بھی چبھ رہی تھی۔

منظر میں سکوت و سکون تھا۔ مگر گویا کہ طوفان سے پہلے کا ہولناک سکوت اگر سب کچھ ٹھیک تھا تو پچھلے پہر نیند کیوں ٹوٹی تھی؟"

چمن کا دھیان اچانک کیوں آتا تھا۔ کلیجے سے ایک سسکاری سی کیوں نکلتی تھی۔ دل بہت بولتا تھا۔ بیٹی چپ تھی۔

ایک بات جوان کو بہت زیادہ کھٹک رہی تھی وہ یہ کہ چمن صبح سے گھر میں اس انداز میں مصروف ہو جاتی تھی جیسے شادی سے پہلے معمولات نمٹاتی تھی۔

اسے شوہر کے گھر جانے کے خیال سے کوئی بات یاد نہیں آتی تھی۔

وہ بھول ہی نہیں سکتی تھی کہ مایوں کا زرد جوڑا پہننے سے پہلے چمن اسی طرح گھر کے معمول کے کام نمٹاتی پھر رہی تھی۔

پُرسکون ہے...... مصروف ہے۔ مگر اپنے گھر جانے کی جلدی میں ہرگز بھی نہیں ہے۔ غیر معمولی معمولات غیر معمولی رشتوں کی نظر ہی میں آ سکتے ہیں۔ مگر...... چمن کی تسلیاں آہنی پھاٹک کی طرح راہ میں حائل تھیں۔ شاید بہت زیادہ دکھوں نے مجھے بہت وہمی بنا دیا ہے۔

بے بسی کی کیفیت کا یہ ماحاصل تھا۔ عطیہ بیگم کے اعصاب شل ہو گئے۔

☆......☆......☆

اب یہ تو قسمت کی باتیں ہیں۔ خدانخواستہ ہم نے تو کسی کے گلے میں پھندا نہیں لگایا۔ سوگ تین دن کا...... اور معصوم بچی کا کیا سوگ؟ ماں کے بغیر بچے خوار ہو جاتے ہیں۔ قسمت کا لکھا جان کر قبول کرو۔ اور صبر سے کام لو۔

فردوس اس وقت نہایت سخت ڈیوٹی دے رہی تھی۔ جن لوگوں سے اللہ اللہ کر کے جان چھوٹی اب ان کو موضوع بھی بنایا جائے۔ اپنا قیمتی وقت بھی صرف کیا جائے۔ آنکھ او جھل پہاڑ او جھل...... لینا ایک نہ دینا دو۔

بیٹا ہے کہ لائن پر آ کر نہیں دے رہا۔ لڑکی والے ہائی الرٹ بیٹھے ہیں شادی کی ضروری تیاریاں کرنا ہیں مگر یہ تو سرا ہی پکڑنے نہیں دے رہا۔ فردوس کا خون کھول رہا تھا مگر ضبط کی انتہا سے گزرنا بھی لازم تھا۔

امی...... بہر حال آپ کو اور پاپا کو جانا چاہیے تھا۔ بہت سے لوگوں نے پاپا کے بارے میں پوچھا تھا۔ انکل بھی بہت ہرٹ دکھائی دے رہے تھے۔ یاور اپنی بیٹیوں کی معصومانہ باتوں کے سحر سے آزاد نہیں تھا۔ جو اس سے بچھڑتے وقت بار بار پوچھ رہی تھیں پاپا آپ کب آئیں گے؟"

"بات سنو یاور...... بہت ہو گئی...... مجھ سے یہ منافقت نہیں ہوتی۔ تمہاری مرحومہ بیوی ہمیں لات مار کر چلی گئی تھی۔ ہمارا تو اس کی زندگی ہی میں ایک طرح سے مرنا جینا ختم ہو گیا تھا۔ اگر بیٹیوں سے اتنی ہی محبت ہے تو کل ہی نکاح کرو۔ پہلے بیوی گھر میں لے آؤ۔ پھر بیٹیوں کو لے آنا۔ اپنی اولاد کو اپنے ساتھ رکھو۔ ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔ لڑکی والوں سے صاف صاف بات کر لوں گی۔ فردوس نے ایک دم پینترا بدلا تھا۔

یاور ہکا بکا ہو کر ماں کی شکل دیکھنے لگا۔
''لیکن...... آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بچیاں اب نانی کے پاس ہی رہیں گی۔'' یاور کو واقعی کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔
''اس وقت بولی تھی جب دودھ پیتی بچی زندہ تھی۔ اتنی سی بچی پالنے کے لیے کوئی اپنی کنواری کم عمر بیٹی نہیں دیتا۔''
''مگر اب وہ تو رہی نہیں...... دونوں بچیاں اپنے دس کام خود کر لیتی ہیں۔ اپنی اولاد اپنے پاس رکھو۔ اب یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے گھر میں بیوی لے آؤ۔''
لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں یاور کی حیرت ختم ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ ارے بک رہی تھی۔ بکواس کر رہی تھی۔
تم سیدھے سیدھے بولو لڑکی والوں سے تاریخ لینے جاؤں یا ابھی کچھ دن عدت میں بیٹھو گے؟'' فردوس باپ کو اولاد سے قریب رکھنے کا احسان کر رہی تھی۔ لہجہ خود بخود فیصلہ کن اور زوردار ہو گیا۔
اولاد سے محبت کا فطری احساس تو خون میں دوڑتا ہی ہے۔ ماحول اور رویے اس احساس کو وقتی دھند کی اوٹ میں چھپا بھی دیں تو فطرت نہیں بدل سکتے۔
بالکل اسی طرح کہ مکمل سورج گرہن کے وقت سورج کے سیاہ دائرے کے کناروں پر گوٹے کرن کی طرح ایک چمک نظر آتی ہے جو سورج کے روشن ہونے پر دلیل ہوتی ہے اور وقتی پردے سے مطلع کرتی ہے۔
کسی شے کے ہونے سے ہونے یا نہ ہونے کی بحث ہوتی ہے۔
شے کا سرے سے وجود ہی نہ ہو تو بحث بھی نہیں ہوتی۔
ماں باپ جن کو شروع سے بیٹے کے اعصاب پر قابو پانے کا ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے اسے کبھی اپنی ذات کو محسوس کرنے اور استعمال کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔
سب سے پہلے تو یہ احساس کہ اکلوتا بیٹا...... دوسرا احساس...... اس کی شادی ہو گی تو یہ خوف بیوی ماں باپ سے دور نہ کر دے۔
اس لیے نو آبادیاتی نظام کا طرز حکومت اپنایا گیا کہ...... پہلے ممنونِ احسان کرو۔ نوازشات کی بارش کرو۔
''Say Yes Boss in Command''
اتنا خیال کرو کہ اپاہج بنا دو۔ پھر اونٹ خیمے میں اور مالک خیمے سے باہر۔
اعصاب کنٹرول ہو گئے۔ حکومت قائم ہو گئی۔
مرضی کا کھانا...... مرضی کی ٹائمنگ میں مکمل آرام...... موسموں کو دھوکہ دینے والی تمام سہولیات' پیار بھرا لہجہ' محبت کی تھپکیاں جو نوازتا ہے اسی کا اختیار چلتا ہے۔
بے چارہ یاور...... اس کی کیا مجال تھی کہ اس طلسم ہوش ربا کو لات مار کر کسی دارالمشقت میں جا پڑے۔
اور آج ایک مزید نئے احسان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ شادی کے بعد اولاد کو ساتھ رکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔
کہ ابھی تک مہ پارہ کی صدائے بازگشت عقب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔
''پاپا...... آپ کب آئیں گے......؟ پاپا ہم شام کو آپ کے ساتھ آئس کریم کھانے جائیں گے۔''
اس بازگشت کے ساتھ اس نے اپنے دماغ کو ماں کی فولادی مٹھی میں قید ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔ کمال بے بسی کی کیفیت تھی۔
اپنی ماں کا شاہ دولہ ہی تو تھا جس نے اسے پیدا ہوتے ہی فولادی ٹوپی پہنا دی تھی۔ قد چھ فٹ کا...... سر چھ ماہ

کے بچے کا ماں کا احسانِ عظیم......
ناگا پربت کی سب سے بلند چوٹی پر برفانی ہوا کے جھونکے اس کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ ایک تصوراتی جہنم سے نجات پا چکا تھا۔ فردوس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پیار سے چوم لیا۔
''امی...... آپ کو کتنا خیال ہے میرا...... میں آپ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔
''ماں ہوں تمہاری...... یہ میرا فرض ہے۔ مگر ایک بات ذہن میں رکھو۔ آنے والی بھی کسی کی کنواری بچی ہے۔ ایک دم سے دو بچیاں اس کے سر پر لا کے نہیں بٹھادوں گی۔ مگر نکاح سے پہلے یہ بات کلیئر کردوں گی کہ بچیاں اپنے باپ کے ساتھ ہی رہیں گی۔
فردوس نے کمال فن کاری سے معاملات کو حتمی شکل دی۔
''ٹھیک ہے امی...... فی الحال تو آنٹی اور چمن ان کو سنبھال رہی ہیں۔ مگر آپ یہ بات بالکل کلیئر رکھیے گا کہ میری بیٹیاں میرے ساتھ ہی رہیں گی۔
یاور نے مزید تاکید اور اپنی خاطر جمع کے لیے کہا۔
''یہ میری ذمہ داری ہے۔ تم فکر ہی نہ کرو۔ میں اگلے جمعہ کی تاریخ لینے کی کوشش کروں گی۔''
''اتنی جلدی......؟'' یاور پھر گڑبڑا گیا۔
اس سناٹے میں دل گھبراتا ہے میرا...... میرا بس چلے تو آج شام کو تمہارا نکاح کردوں اور بھاگوان کو گھر لے آؤں۔
فردوس پر گویا رقت طاری ہوگئی۔ یاور پھر عیاری کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ اس لیے کہ سادگی ہمیشہ عیاری کے سامنے اظہارِ بے بسی کرتی ہے۔
اور پھر سالہا سال سے اس کی زندگی میں سوائے ڈپریشن، تناؤ، تنازعات کے سوا تھا ہی کیا۔
بیوی اُداس، ماں باپ ناخوش، اولاد بھی ہوئی، نہ گھر میں دعوتیں۔ نہ صلۂ رحمی، نہ حقوق العباد نہ ذوقِ عبادت، نہ خیر خواہی کا جذبہ، نہ خوفِ خدا کا ماحول،
روحانی مسرت عنقاء،
ہر وقت سوداگری کے خیالات، کیا ملے گا؟ کیسے ملے گا؟ کون دے گا؟ کہاں سے آئے گا؟
تم ہمارے گھر آؤ گے تو کیا لاؤ گے؟
ہم تمہارے گھر آئیں گے تو کیا دو گے؟
خود غرضی کی اس زہریلی فضا میں بندہ بشر خوشی کے سراب کے پیچھے سرپٹ دوڑتا ہے۔ شاید خوشی یہاں ہے۔ شاید سکون وہاں ہے۔ ایک نیا جوان، تر و تازہ خوبصورت ساتھی، تمنائیں جاگ پڑیں۔
یہ تو کمال ہی ہوگیا۔ جان چھوٹی خوشی تو گود میں آگری ہے۔ میں نے ایک نااہل اہلیہ کے ساتھ بڑے صبر سے وقت گزارا۔
یہ اسی کا صلہ ہے کہ دکھ کا موسم رخصت ہوا۔ خوشی آ کر لپٹ گئی۔
ان خوشیوں پر تو میرا حق ایسا ہی ہے جیسا باپ کی وراثت پر بیٹے کا، ماں...... ماں ہوتی ہے۔ میری خوشی کے بندوبست کر رہی ہے۔ کیونکہ میں بہت اچھا ہوں ایک بیمار اداس عورت کو نباہتا رہا ہوں۔ اس لیے اب مجھے اپنی نیکی کا صلہ مل رہا ہے۔ یہ تو میرا پیدائشی حق ہے۔ یاور اپنا حق وصول کرنے کے لیے سرگرم ہوگیا۔ کیونکہ وہ بہت مظلوم تھا۔

"ٹھیک ہے امی...... آپ جس طرح کہتی ہیں وہی کروں گا۔اس بار یاور کی آواز میں شفافیت اور لہجہ میں استحکام تھا۔

فردوس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔

☆......☆......☆

ندا آنکھیں پھاڑے ثمر اور بانو آپا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہی ہو، میری امی ہیں۔سلام کرو۔" ثمر نے گویا پتھر پر دم کر کے تحریک پیدا کی۔

"ندا ایک دم حواسوں میں آگئی۔"

"اس...... السلام علیکم آنٹی!" اس نے سٹپٹا کر سلام کیا۔اور ایک طرف ہو کر دونوں کو گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے راستہ دیا۔

بانو آپا سخت اور کڑی نظروں سے ندا کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ندا کم عمر تو تھی ہی مگر چہرے پر برستی حماقتوں کے باعث مزید کم عمر محسوس ہوتی تھی۔

دبلی پتلی، دراز قامت، تراشیدہ بالوں کی اونچی پونی ٹیل' بے تکا ڈھیلا ڈھالا لبادہ۔

خوبصورت اور کم عمر...... بانو آپا کو محسوس ہوا چاروں طرف سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ کامل ہو گیا بانو آپا کی تو لاٹری نکل گئی۔

آگے بڑھ کر انہوں نے ندا کو گلے سے لگا کر پیشانی چوم لی۔ندا کے چہرے پر مزید حماقتیں برسنے لگیں۔ کیونکہ ابھی تک اس کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔

میری امی آپ کے نانا جان کی عیادت کے لیے آئی ہیں۔ثمر کو اب خیال آیا کہ ندا کو اُلجھن سے نکالنا چاہیے۔

"اوہ...... تھینک یو آنٹی...... آیئے' ندا اب قدرے پُرسکون ہو کر بولی۔اور دونوں کو ڈرائنگ روم کی طرف لے کر چلی۔

"نانا جان جاگ رہے ہیں تو ہم ان کے پاس ہی بیٹھ جاتے ہیں۔" ثمر نے رک کر ندا کی طرف دیکھا۔

"ان کا تو پتا ہی نہیں چلتا سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔پھر ان کے کمرے میں اتنی چیزیں بکھری ہوئی ہیں کہ آنٹی کو اُلجھن ہوگی۔کسی چیز کو اٹھانے نہیں دیتے۔ہر چیز سونے کی ہے۔کمرے میں کباڑ جمع کیا ہوا ہے۔

ندا بول رہی تھی اور بانو آپا حیران پریشان اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ارے کس سے باتیں کر رہی ہو؟ کیا امریکہ سے فون آیا ہے؟ اس نانہجار نافرمان کو بولو کوئی ضرورت نہیں فون کرنے کی۔تین ہزار ڈالر بھیج کر پاک ہو گیا۔تھو کتا ہوں ایسی اولاد پر......"

کھانسی کی شدت نے سلسلہ کلام منقطع کر دیا۔

ندا پر جیسے گھڑوں پانی پڑ رہا تھا۔

بانو آپا ندا کے بجائے ثمر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔جو خود بغلیں جھانک رہا تھا۔

"ندا......او...... ندا...... شبیر حسین اب باقاعدہ ندا کو آواز دے رہے تھے۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاءاللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

اقبال بانو

بس ایک دعا

''یہ سب انہیں بھی پتا ہے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو بھائی چاہتے تھے کہ ان کی بیوی خوبصورت ہو اور ڈاکٹر ہو، اب ہم جب بھی کوئی لڑکی دیکھنے جاتے تو ڈاکٹر ہوتی تو خوبصورت نہ ہوتی اور اگر خوبصورت ہوتی تو ڈاکٹر نہ ہوتی اور ایک روز میں نے تمہیں......

''اچھی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔'' مارے غصے کے اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخا۔

''کیا ہوا؟'' عذرا بھابی نے دوپٹے پر لیس لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے موصوف کا پھر فون آیا تھا۔''

''بات کر لی ہوتی۔'' وہ بولیں۔

''آپ کے کہنے پر بات، ایک بار کی تھی اور اب بار بار کرنی پڑ رہی ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''دیکھو نا بیلا! کتنا اچھا رشتہ ہے تمہیں پتا تو ہے لوئر مڈل کلاس لوگوں کے ہاں بھلا ایسے رشتے کب آتے ہیں، یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اتنا اچھا بر بھیجا۔ ورنہ کون پوچھتا ہے اور تم ناشکرا پن مت کرو۔ فون کرتا ہے تو بات کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر تمہارا منگیتر ہے وہ......'' عذرا بھابی اسے سمجھا رہی تھیں۔

''بھابی! بات تو کر لیتی ہوں مگر......'' وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

''مگر کیا......؟'' وہ بولیں۔

''مگر وہ صرف بات ہی تو نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیا مطلب؟''

''کہتا ہے میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اے لو...... کیا پہلے نہیں دیکھا تھا۔'' ان کے لہجے میں شک تھا۔

''نہیں بیلا نے کہا۔''

''ہم تو سمجھے تھے کہ تمہیں دیکھ کر ہی اس نے رشتہ بھیجا ہے۔ آخر اس کی بہن تمہاری کلاس فیلو تھی۔''

''ہاں! ہما میری کلاس فیلو بھی تھی اور دوست بھی مگر بھابی! میں نے اس کے بھائی کو نہیں دیکھا تھا۔''

''اگر وہ کہتا ہے تو مل لو۔ یوں بھی شرع میں بھی اجازت ہے کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔''

''رہنے دیں بھابی! مجھے نہیں ملنا اور یوں بھی شادی میں صرف دس روز رہ گئے ہیں۔ آپ

زیادہ آزاد خیال نہ بنیں، اماں کو پتا چل گیا تو ایک نیا فضیحتہ کھڑا کردیں گی اور پتا نہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو کس نے کہا تھا۔ رشتہ آیا فوراً منظور کر کے تاریخ دے دی۔'' بیلا نے دل میں چھپا سوال کر ڈالا۔

''اے بی! سچ جانو تو ہم سمجھے تمہاری منشا ہے۔ تایا جان نے مین میخ اسی لیے نہیں نکالی۔''

''کیا...... کیا آپ لوگوں نے ایسا سمجھا تھا؟'' مارے حیرت کے اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

''اتنے اونچے گھرانے اور اونچے عہدے کے بندے کو...... آخر معمولی کلرک کے گھر کی راہ کسی نے تو دکھائی ہوگی۔''

''آپ لوگ سمجھے، میں نے وہ راہ دکھائی۔''

وہ بولی۔

''بالکل!''

''اُف میرے خدا......'' اس کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔ عذرا بھابی کام میں مصروف ہو چکی تھیں۔

''یا خدا! میں اتنی بے اعتبار ہوگئی تھی، کسی نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔ خود بخود مفروضے گھڑ لیے۔''

''کیا اماں ابا کو مجھ پر اعتبار نہ تھا؟''

وہ بیلا زمان دو ہفتے قبل ہی تو میڈیکل کے فائنل ایئر کا امتحان دے کر گھر آئی تھی۔ اور یہاں آکر اسے پتا چلا تھا کہ ایک روز قبل اس کی کلاس فیلو ہما اور اس کے گھر والے اس کے پروپوزل کے سلسلے میں آئے تھے۔ جمال فاروق سی ایس پی آفیسر تھا اور ان دنوں اس کی اسلام آباد میں

پوسٹنگ تھی۔ اماں ابا نے اس سے پوچھے بغیر ہامی بھرلی تھی کہ ہما نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ دونوں بیسٹ فرینڈ ہیں اور...... اور سب یہی سمجھے تھے کہ بیلا کی مرضی ہے۔"

اس لیے تو ابا بھی خاموش تھے۔ پھر فاروق صاحب کی خواہش پر جلد تاریخ دے دی گئی تھی۔ کیونکہ جمال کسی کورس کے سلسلے میں ایک ماہ بعد پیرس جارہا تھا اور وہ بیوی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ خاندان میں سب بیلا پر رشک رہے تھے۔

"بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے۔"

اڑتا اڑتا یہ جملہ اس کے کانوں میں بھی پڑا تھا مگر اس نے پرواہ نہ کی تھی۔

"بیلا! وہ ہما کا فون ہے۔" طاہرہ آپا جو اس کی شادی کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اطلاع دی۔ وہ بیزار سی اٹھ کر فون کے قریب آئی۔

"ہیلو......!"

"کیا حال ہیں بھابھو جانی؟" ہما چہک رہی تھی۔

"کیوں فون کیا ہے؟" وہ سخت لہجے میں گویا ہوئی۔

"بھئی تم نے میرے بھائی کو دیوانہ کردیا ہے۔ تمہاری آواز کے سحر میں وہ جکڑ گئے ہیں۔"

"کیا بکواس ہے ہما؟"

"یار! ان سے مل لو نا۔"

"کیا ضرورت ہے؟" وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

"پلیز بیلا! ایک بار اپنے درشن کروادو۔"

"دیکھو ہما! مجھے یہ فضولیات پسند نہیں، میں کوئی لولی لنگڑی نہیں ہوں۔ نہ ہی بدصورت ہوں۔"

"یہ سب انہیں بھی پتا ہے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو بھائی چاہتے تھے کہ ان کی بیوی خوبصورت ہو اور ڈاکٹر ہو، اب ہم جب بھی کوئی لڑکی دیکھنے جاتے تو ڈاکٹر ہوتی تو خوبصورت نہ ہوتی اور اگر خوبصورت ہوتی تو ڈاکٹر نہ ہوتی اور ایک روز میں نے تمہیں غور سے دیکھا تو پتا چلا تم تو بھائی کی پسند پر ایک سو ایک فیصد پوری اترتی ہو، تمہیں یاد ہوگا میں نے مما اور آپی سے تمہیں ملوایا تھا نا......؟"

"یاد ہے۔" اس نے کہا۔

"اور انہوں نے بھی تمہیں پسند کیا تھا۔ بس فائنل امتحان ہوتے ہی ہم تمہارے گھر پہنچ گئے۔ اتفاق سے بھائی بھی آئے ہوئے تھے اور تمہیں اس روز گھر پہنچ جانا تھا، مگر شاید تمہیں تابندہ کے ساتھ آنا تھا۔

وہ نہ آسکی، تو تم بھی نہیں آئیں اور ہم ضد کرکے ڈیٹ لے کر ہی آئے اور مزے کی بات یہ کہ دوسرے روز میں اور بھائی ہاسٹل گئے تو پتا چلا کہ تم چند منٹ پہلے فیصل آباد روانہ ہوگئی ہو۔ پھر ہم لاری اڈے پر بھی آئے مگر تم لوگ نہ ملے۔ بھائی واپس چلے گئے اور اب تم کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"یار کیا دقیانوسی باتیں کررہی ہو، آخر تمہاری ان سے شادی ہورہی ہے۔"

"مجھے یہ سب پسند نہیں ہے ہما! تم انہیں بتادو۔"

"میں نے تمہاری تصویر بھی دکھائی ہے جو جناح پارک میں ہم لوگوں نے کھنچوائی تھی۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ......

"تصویر تیری میرا دل نہ بہلا سکے گی۔"

"خیر تم نے یہ بھی اچھا نہیں کیا۔" وہ بولی۔

''تم سوچ لو بیلا۔'' ہما نے کہا۔
''سوچ لیا ہے کہہ جو دیا کہ نہیں کرنی مجھے اپنی نمائش۔'' اس کا لہجہ سخت تھا اور پھر ریسیور دوسری طرف سے ہما کے ہاتھ سے جمال کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔
''ہما! کہہ دو اپنے بھائی سے کہ وہ مجھے شادی سے پہلے نہیں دیکھ سکیں گے۔''
''اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا بیلا جی......'' ایک دم بھاری آواز ایئر پیس سے ہوتی ہوئی اس کی سماعتوں میں اتر گئی۔
''غرور نہیں ہے۔ یہ اصول کی بات ہے جس بات کو میں پسند نہیں کرتی۔ وہ نہیں کروں گی۔'' وہ نہایت اعتماد سے بولی۔
''تو سن لیں میں بھی اپنی دھن کا پکا ہوں نکاح سے پہلے آپ کو دیکھوں گا ضرور...... اللہ حافظ۔'' جمال نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
''ہونہہ......!'' بیلا نے سر جھٹکا۔
بات طے ہو جانے کے بعد جمال کے فون آنے لگے تھے اور دراصل عذرا بھابی کو اس نے شیشے میں اُتار لیا تھا۔
یوں بھی عذرا بھابی اس کے عہدے اور امیر گھرانے سے خاصی متاثر تھیں۔ انہوں نے ہی اس کی جمال سے بات کرائی تھی۔
''دیکھو بے چارہ کتنی دور سے فون کرتا ہے تمہاری خاطر بات کر لینے میں کیا حرج ہے۔ فون سے نکل کر کھا تو نہیں جائے گا۔''
اور عذرا بھابی کی باتوں میں آ کر وہ فون سن بیٹھی تھی۔ جواب اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔
اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر اس نے عذرا بھابی کی بات کیوں مانی؟''
آج مایوں کی رسم تھی، ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں بالیاں گیت گا رہی تھیں۔ شور میں تو کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔
تب ہی زہرہ پھوپو آ گئیں۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی بیلا کو انہوں نے کھینچ کر گلے لگا لیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔
''پھوپو پلیز......!'' اسے وحشت ہونے لگی۔
''تمہیں تو میری بہو بننا تھا۔ زمان نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے بیلا! تو پیدا ہوئی تھی تو میں نے اپنے انور کا نام ڈال دیا تھا مگر......'' ان کی آواز آنسوؤں میں گھٹ گئی۔
''زہرہ! اب رونے کا فائدہ۔'' اماں نے انہیں گلے لگا لیا۔
''بھابی! یہ تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ آخر کیا کمی ہے میرے انور میں، سولہ جماعت پاس ہے، اچھی نوکری بھی مل جائے گی۔ بس امیر گھر دیکھ کر نند یاد نہ رہی۔ چلو تم تو بھاوج ہو۔ بھائی کو بھی بہن یاد نہ رہی۔ اللہ! کیا خون سفید ہو گیا ہے؟'' زہرہ پھوپو سینے پر دو ہتھڑ مار کر رو دیں۔
''اے لڑکیو! تم گاؤ۔'' ذکیہ پھوپو نے کہا اور پھر بہن سے کہنے لگیں۔
''کیوں تماشا بنا رہی ہو۔ نصیب کی بات ہے۔ خوش ہو کہ اتنے امیر گھر بھتیجی جا رہی ہے۔ ارے وہ ڈاکٹرنی بن گئی ہے۔ اب رشتہ اس کے شایان شان تو ہونا چاہیے۔ گھر بھی اچھا ہو۔ خدا نے مقدر کھولا ہے تم واویلا مچا رہی ہو۔'' ذکیہ پھوپو نے بہن کو اچھی طرح رگیدا تب کہیں جا کر ان کا رونا دھونا ختم ہوا۔
بیلا کی رسم مایوں بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ گھر کے سامنے میدان میں ٹینٹ لگا کر مایوں

کی رسم ادا کی گئی۔ اسی میدان میں سارے محلے کی شادیاں قل وغیرہ ہوتے تھے۔

مگر بیلا کی شادی کے لیے زمان احمد نے ہال بک کرایا تھا کہ سمدھی امیر تھے اور جب اپنوں سے ہٹ کر رشتہ داری کی جاتی ہے تو چادر سے پاؤں نکالنے پڑتے ہیں۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر انہوں نے اہتمام کیا تھا۔

بیلا کے دونوں بھائیوں نے فیکٹری سے ایڈوانس لیا تھا۔ جبکہ زمان احمد نے اپنی ساری جمع پونجی بیلا کی شادی کی نذر کر دی تھی۔

اتنا خرچ انہوں نے تین سال قبل طاہرہ کی شادی میں نہ کیا تھا اور پھر شادی کا دن بھی آ گیا۔ خصوصی طور پر اس کے سسرال والوں نے لاہور سے بیوٹیشن کو ان کے ہاں بھیجا تھا۔ برأت آجانے پر بیلا کو بھی ہال کی طرف لے جایا گیا تھا۔

برأت آنے کے بعد نکاح کی رسم ہونی تھی کہ بیلا کو محسوس ہوا کوئی گڑ بڑ ہوگئی ہے۔

''کیا ہوا طاہرہ آپی......؟'' اس نے گھبرائی ہوئی طاہرہ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''اے لو پہلے نہیں کہہ سکتا تھا اب عین شادی کے دن یہ کوئی تک تو نہیں، لوگ کیا کہیں گے۔ نکاح سے پہلے ہم لڑکی کی نمائش کریں۔'' اماں شاید ابا سے ہم کلام تھیں۔

''مگر کیا کیا جائے...... بیٹا......'' ابا اس کے قریب آئے۔

''جی ابا میں سن رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں۔'' اسے ابا کے چہرے پر پھیلا دکھ صاف نظر آ رہا تھا۔

''پھر کہہ دوں، وہ یہاں آجائے۔'' کتنے مجبور ہو گئے تھے وہ۔

''ابا...... جمال کی شرط تو پوری کر دیں، مگر پھر جو ہوا سے میرا مقدر جانیے گا۔'' بیلا نے کہا تو طاہرہ آپی جلدی سے بولیں۔

''تم اتنی خوبصورت ہو۔ وہ بھلا تمہیں ریجیکٹ کر پائے گا۔''

''میں وہیں ہال میں جاؤں گی۔'' بیلا ان کی بات اَن سنی کر کے بولی۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ حیران تھے۔

''یہ میری شرط ہے ابا...... تماشا ہو تو پھر جم کے ہو۔'' وہ مسکرائی۔ زمان احمد سمجھ گئے کہ بحث فضول ہے۔ انہوں نے سر جھکا دیا اور بیلا ان کے ساتھ اس طرف چل دی جہاں باراتیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔

وہ گھونگھٹ نکالے ابا کے ساتھ ہاتھ تھامے نہایت اعتماد سے وہاں آئی تھی۔ سب حیران تھے کہ دلہن یہاں کیسے؟ وہ جمال کے قریب جا کر رک گئی۔

اور گھونگھٹ الٹ دیا۔ جمال فاروق کو لگا تھا جیسے چہار سو اجالا ہو گیا ہو۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ تو اس کے تصور سے بھی زیادہ حسین تھی۔

کڑکتی بجلی......

جو خرمن دل پر کیا گری کہ وہ خاکستر ہو گیا۔

ماہر حسن نے تو اس کے حسن کو اور بھڑکا دیا تھا۔

''مجھے دیکھ لیا جمال فاروق صاحب!'' وہ نہایت اعتماد سے پوچھ رہی تھی۔

''جی...... جی۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''اب کیا حکم ہے۔'' وہ ابرو چڑھا کر پوچھ رہی تھی۔

''نکاح پڑھایا جائے۔ مولوی صاحب مجھے منظور ہے۔'' جمال نے گردن تان کر فخر سے کہا۔

"مگر مولوی صاحب! مجھے جمال فاروق منظور نہیں ہے۔" بیلا کی آواز ابھری۔ جمال کو لگا جیسے چھت اُس پر آ رہی ہو۔

ہال میں عجیب سا شور مچ گیا تھا۔

"اگر میں آپ کو پسند نہ آتی تو آپ مجھے مسترد کر دیتے نا...... تو میں آپ کو مسترد کرتی ہوں۔

جہاں بزرگوں کے فیصلے کو آپ نے اہمیت نہیں دی کہ ہمارا رشتہ بزرگوں نے ہی طے کیا تھا نا تو اب میں آپ کا فیصلہ نہیں مانوں گی۔ انکل! آپ برأت لے کر جا سکتے ہیں۔"

بیلا نے فاروق صاحب سے مخاطب ہو کر کہا اور پھر رکی نہیں وہ اُس کمرے میں بند ہو گئی جہاں سے ابا اسے لے کر گئے تھے۔ باہر دروازہ پیٹتا رہا مگر اس نے نہ بھولا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل کو ایک عجیب سا اطمینان ہوا تھا۔

اور پھر ابا کی آواز آئی۔

"بیلا بیٹا! دروازہ کھولو' برأت جا چکی ہے۔"

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ابا کھڑے تھے وہ ان کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رو دی۔

"ابا یہ شخص اچھا نہیں تھا۔ یہ ہمیشہ بلیک میل کرتا رہتا اور ابا! ہم اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہتے، اس کا انجام کیا ہوتا۔ پتا ہے ابا مجھے آپ لوگوں کو چھوڑنا پڑتا یا اس تکبر کے مارے شخص کو، اور میں نے اس کے ساتھ چلنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ دیا ہے۔"

"مجھے پسند آیا ہے تمہارا فیصلہ...... مجھ سے جلدی بازی میں غلط فیصلہ ہو گیا تھا بیٹا! اب اگر تم مانو تو زہرہ بہن کے ساتھ تمہیں بھیج دوں۔"

انہوں نے پوچھا تو بیلا نے فوراً سر جھکا دیا۔

اور زمان احمد نے اس کو گلے لگا لیا۔

اور اسی رات حجلۂ عروسی میں انور اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

"آنا نہیں میرے غریب خانے میں تھا بھلا محل میں کیسے جا سکتی تھیں۔"

"آپ کا دل کسی محل سے کم تو نہیں انور......"

اس نے شرگیں مسکراہٹ سے کہا تو انور ہنس دیا اور بولا۔

"اگر تمہارے نصیب میں ہے تو انشاء اللہ بڑا گھر بھی مل جائے گا۔"

اور واقعی اس کا نصیب ہی تو تھا کہ جس روز وہ مکلاوے سے واپس آئی تھی تو انور نے بتایا کہ اس نے سی ایس ایس کا امتحان کلیئر کر لیا ہے اور جلد ہی وہ ٹریننگ کے لیے اکیڈمی چلا جائے گا۔

"آپ نے مجھے پہلے تو نہیں بتایا......" بیلا کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"یار! میں نے سوچا پتا نہیں پاس بھی ہوتا ہوں کہ نہیں۔" انور نے کہا۔

"کیوں نہیں پاس ہونا تھا...... اتنے ذہین تو ہیں۔"

"میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی بیلا۔" وہ دکھ سے بولا۔

"اللہ کی سفارش بھول گئے۔"

"ہاں سچ ہے تم بھی تو اللہ کی سفارش سے ملی ہو۔"

انور نے اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا تو بیلا کو لگا جیسے ڈھیر ساری روشنی اس کے وجود میں ٹھنڈک بن کر اترتی جا رہی ہو۔ اللہ نے واقعی اس کا مقدر کھول دیا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

دردانہ نوشین خان

فاصلوں کو تکلف ہے

ڈھیلی پتلون اور آدھی آستین کی شرٹ میں سُست رو سلیم ملک اور جھکے کندھوں کو بار بار جھٹک کر متوازن کرنے والا نیم گنجا خالد جمیل' حدیقہ کے بتائے ہوئے مکان تک پہنچے۔ ایک بیٹھک نما کمرہ جس کے آگے چھوٹا برآمدہ اور صحن تھا۔ غالباً مردان خانہ تھا جس کا دروازہ......

"دیکھو...... بابا پھر آگے نکل گیا۔" ڈھیلی پتلون اور آدھے آستین کی شرٹ والے اکسٹھ سالہ سُست رو سلیم ملک نے نہر کے کنارے پکی پکی روش پر چلتے ہوئے اپنے ساتھی خالد جمیل کو متوجہ کیا۔ اچھے موسم کی صبحوں میں یہ روش واکنگ ٹریک کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ جھکے کندھوں کو جھٹک کر سیدھا کرنے کی لگاتار عادت والے ہم عمر خالد جمیل کی نظروں نے سفید کُرتہ پاجامہ والے بابے کا پیچھا کیا۔

وہ دائیں ہاتھ میں پکڑی لکڑی کو بار بار اٹھاتا' تھوڑا سا لہراتا اور رکھتا ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ یہ سوٹی پکی لکڑی کی تراشی ہوئی تھی۔ بوجھ سہارنے کے کام تو نہیں آسکتی تھی البتہ اس سے آوارہ کتوں یا اندھا دھند دوڑ پڑتی گائے بھینسوں کو شُشکارا جاسکتا تھا۔

سلیم ملک اور خالد جمیل برسوں کے پرانے ہمسائے تھے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد نزدیکی نہر کے کنارے واک کرنے نکلتے۔ کسی نہ کسی بیماری کا شکار رہتے۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر واک دونوں کی مجبوری تھی۔ پھر یہ بابا بھی اسی وقت دکھائی دینے لگا۔ بابا اس لیے کہ اُس کے سر اور داڑھی کے بال مکمل سفید تھے۔ وہ انہیں رنگتا نہیں تھا۔

اُجلا سفید کرتا اور پاجامہ پہنتا مگر اُس کا چہرہ ہشاش بشاش اور امید کی چمک سے روشن ہوتا۔ وہ بوڑھوں والی پیلاہٹ زدہ تھکن نہیں رکھتا تھا۔

پہلی بار پاس سے گزرتے ہوئے سلام کا تبادلہ ہوا تو اُس نے تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ دوسری بار وہ اُن کے پاس قدم آہستہ کر کے بولا۔

"تیز قدم اٹھایا کرو...... تیز چلو۔" ان دونوں کے سر مکمل سفید نہ تھے۔ داڑھیاں صاف تھیں دونوں اُس سے چھوٹے دکھتے تھے یا پھر چھوٹے تھے۔

واک کرتے ہوئے وہ دونوں ایک جگہ بیٹھ کر سانس دُرست کرتے تھے۔ ایک بار وہ بھی وہیں

بیٹھا ہوا ملا۔ بات چیت کے دوران پتا چلا کہ وہ حج پر جانے والے ہے اس لیے طویل اور تیز چلنے کی مشق کر رہا ہے۔

وہ 71 سالہ ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھا۔ حج اُس کا زندگی بھر کا خواب تھا اور اب یہ خواب تعبیر پانے والا تھا۔ وہ انگلیوں پر دن گنتا رہتا تھا بلکہ بعد میں اُس نے یہ گننے کا کام خالد جمیل کے ذمے لگا دیا تھا۔ آمنا سامنا ہونے پر سلام کے بعد پوچھتا۔

''ھن کتنے ڈیھن باقی ھن سائیں؟''

(اب کتنے دن باقی ہیں جناب)

اور ایک بار ازراہ تفنن خالد جمیل اُسے دیکھ کر بول اٹھا۔

''ھن تے تھوڑے دن باقی ھن۔''

''اس سُوٹی کا کیا فائدہ ہے؟'' سلیم ملک نے سوال کیا۔

''کتے تو اس کو دیکھ کر بھونکنے لگتے ہیں۔''

''بھونکتے ہیں۔ مگر قریب آنے کی ہمت نہیں کرتے۔ میاں! تدبیر کر کے تقدیر پر چھوڑنا چاہیے۔'' وہ بات کرتے ہوئے بھی چلنا جاری رکھتا تھا۔

خالد جمیل اور سلیم ملک اُس کی جوان ہمتی کی داد دیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو روزانہ یہاں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ جس دن یہ جوڑا نظر نہ آتا بابا بھی مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا رہتا مگر وہ تو ناغے کا عادی ہی نہ تھا۔ روز اُسی وقت اُسی مقام پر ملتا، کبھی قریب، کبھی آگے اور کبھی پیچھے سے آگے نکل جاتا ہوا۔

حج روانگی کے دن قریب آنے لگے اور بابا کا جوش و خروش دیدنی ہو گیا۔ اب وہ ایک نعت اکثر

گنگناتا رہتا۔

آئی مدینے کی سواری گناہ گار چل پڑے

''یار اِس کی بخشش پکی ہے۔'' وہ رشک کرتے۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ وہ صبح کی سیر میں کہیں دکھائی نہ دیا۔ دونوں کا آدھا راستہ طے ہوگیا۔ ٹوٹی بیچ پر وقفہ کرتے ہوئے دونوں کی زبان سے بیک وقت ادا ہوا۔

''آج وہ نظر نہیں آیا۔''

''شاید...... صبح جلدی آ کے چلا گیا ہو۔'' پھر وہ خاموشی سے تازہ ہوا میں سانس لینے لگے۔ دوبارہ واک جاری کرتے ہوئے خالد جمیل نے بتایا کل میں نہیں آؤں گا۔

''کیوں؟''

''بٹیا کو گاڑی میں سوار کرانا ہے۔''

''چھٹیاں ختم ہوگئیں؟'' وہ ایک دوسرے کے بچوں کی بابت جانتے تھے۔ خالد جمیل کی بیٹی اسلام آباد یونیورسٹی سے چھٹیوں پر آئی ہوئی تھی۔

سلیم ملک اگلی صبح اکیلا آیا تو گویا یہ احساس تھا کہ ابھی بابا مل جائے اور دوسرا ہٹ ہو جائے گی۔ مگر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ویران راستہ طے ہوا...... بابا کہاں چلا گیا؟ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ روانگی سے دو ہفتے پہلے واک چھوڑ دے۔

اگلی سحر خالد جمیل کے نئے چھوٹے ریڈیو نے دونوں کو تمام وقت متوجہ رکھا۔ وہ ریڈیو کے حوالے سے ماضی یاد کرتے کچھوے کی طرح چلتے رہے۔

بابا کے منظر سے ہٹ جانے کا صحیح معنوں میں ادراک کئی دنوں بعد ہوا اور وہ ایکدم فکر مند ہوگئے۔ عارضی ہمسفر سہی مگر ایک تعلق خاطر تو تھا۔

ہاں شاید ذکر کر کے بھول جاتا مگر سلیم ملک کو یاد آیا کہ اُس کی پوتی کی ہم جماعت حدیقہ نامی بچی کا وہ نانا تھا۔

وہ بات کیا کرتی تھی کہ حدیقہ کے نانا آپ کے ساتھ واک میں ہوتے ہیں وہ حج پر جانے والے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کے گھر کا بھی اندازہ تھا۔ سلیم ملک کا ارادہ بن گیا۔ چلو پوچھ کے آتے ہیں۔ خالد جمیل کو پس و پیش ہوئی مگر اسوہ حسنہ سے دلیل نے لاجواب کر دیا۔

ڈھیلی پتلون اور آدھی آستین کی شرٹ میں سُست رو سلیم ملک اور جھکے کندھوں کو بار بار جھٹک کر متوازن کرنے والا نیم گنجا خالد جمیل، حدیقہ کے بتائے ہوئے مکان تک پہنچے۔ ایک بیٹھک نما کمرہ جس کے آگے چھوٹا برآمدہ اور صحن تھا۔

غالباً مردان خانہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برآمدے میں موڑھوں پر دو تین مرد بیٹھے تھے۔ انہوں نے کھلے دروازے پر دستک دی تو بولے۔

''اندر آجاؤ بھئی۔'' وہ اندر آئے تو اُن کے کچھ کہنے سے قبل کوئی بولا۔

''ملک صاحب اندر لیٹے ہیں۔ اللہ رحم فرمائے۔''

''بس جی اللہ رحم کرے'' کی تکرار ہونے لگی کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ دونوں آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔

اونچی بیک والے پرانی طرز کے لمبے چوڑے پلنگ کے درمیان سکڑا سمٹا بابا لیٹا تھا جس کی ٹانگوں تک چادر تھی۔ وہ ہر آنے والے کو دیکھتا سلام کا جواب دیتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ باقی احوال اُس کی پائنتی کے پاس موڑھے پر بیٹھا داماد

دیتا تھا۔ داماد بابا کا بھانجا بھی تھا۔ وہ کھنکار کر شروع ہوا۔

"وہ جی...... کچھ دنوں سے ماموں جی کو کبھی کبھی پیٹ میں درد کی شکایت ہوجاتی تھی۔ درد کافی تیز ہوتا' خود ہی ہوتا خود ہی رُک جاتا۔

ایسی چھوٹی موٹی تکلیفوں میں گھریلو ٹوٹکوں سے کام چلایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کوئی اتنی جلدی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا۔ ماموں تو بالکل بھی نہیں۔

"مگر......" بقول داماد وہ حج کی تڑپ میں ڈاکٹروں کی ٹھوکریں کھانے چل پڑا۔

"کسی کو بتایا تک نہیں۔" ڈاکٹر بھی شکار کی انتظار میں تھا کہہ دیا آپریشن کے سوا کوئی علاج نہیں۔ چھوٹا سا آپریشن ہوگا اور تین دن میں بھلے چنگے ہوکر چلنے پھرنے لگو گے۔ پچیس ہزار فیس مانگی۔ فیس زیادہ تو لگی تھوڑی سودے بازی کی۔

ماموں نے بیس ہزار بھر دیے۔ ارجنٹ کام کا ریٹ بھی ارجنٹ ہوتا ہے ماموں نے گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی سوچا ہوگا کہ بھانت بھانت کے مشوروں میں وقت ضائع ہوگا۔

"بی بی کو کیا کہا ہم گاؤں جارہے ہیں پرسوں تک واپس آجائیں گے۔" وہ ایک پرائیویٹ اسپتال تھا کوئی ایم بی بی ایس فیل عطائی چلا رہا تھا۔ ماموں چلا گیا۔

اگلی شام بی بی اماں کا فون آیا میں فلاں اسپتال بیٹھی ہوں بابا آپریشن کرواکے پڑا ہے۔ آؤ آکے لے جاؤ۔ گھر والے حیران اور پریشان ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھاگم دوڑ پہنچے۔ چھوٹا سا اسپتال تھا دو کمپوڈر کھڑے تھے۔ ڈاکٹر موجود نہ تھا۔ کمپوڈر بولے۔

"مریض ڈسچارج ہوچکا ہے آپ لے جائیں، بابا نہ اٹھ سکے نہ بیٹھ سکے۔ نچلا دھڑ حرکت ہی نہ کرے۔ نچلے دھڑ کی جان ہی نہ ہو۔"

گھر والوں نے کہا ہم ڈاکٹر کو مل کر جائیں گے۔ اچھے بھلے بندے کو کیا کردیا۔ بابا بھی رو رہا تھا اسپتال میں بار بار کہتا میں تو پیٹ کے درد کو جلدی ٹھیک کروانے آیا تھا۔

کمپوڈر نے کوئی ڈسچارج سلپ دی نہ کوئی کاغذ دیا۔ کہتا تھا۔

"گھر لے جاؤ آرام کرے دوائیں کھائے گا ٹھیک ہوجائے گا۔"

داماد نے آہ بھر کر بات یہاں ختم کی۔

"آج چوتھا دن ہے۔ ماموں ویسے کا ویسا پڑا ہے پتا نہیں کیسا ٹیکا لگایا ہے کون سی رگ کٹ گئی ہے۔ اب بڑے اسپتال کے دھکے، خرچے، آہ......"

خالد جمیل نے آگے کھسک کر بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" وہ حسرت بھری آنکھوں سے دیکھے گیا۔ خالد جمیل کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سمٹ کر اٹھنے کو ہوا تو مدفون ارمانوں کی صدا آئی۔

"کتنے ڈیھن باقی ہیں...... ایہ میکوں کجھ نی ڈسیندے (کتنے دن باقی ہیں یہ مجھے کچھ نہیں بتاتے)

سلیم ملک کی آہ نکل گئی۔ کلینڈر پر آج کی تاریخ پر سرخ گول دائرہ لگا تھا۔ دونوں کی نظر کلینڈر پر گئی۔ داماد اِن کی نظر کو بھانپ کر اٹھا۔ کلینڈر کو الٹا دیا۔ وہ پلٹا تو دیوار کے ساتھ رکھی بابے کی سوٹی دور جا گری۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

نفیسہ سعید

بنت حوا

ابھی بھی وہ دیکھ چکی تھی ماریہ نے کھانے کا ڈبہ بھی چارپائی کے نیچے چھپا دیا تھا۔ جس میں غالباً بروسٹ تھا جو وہ کسی ریسٹورینٹ سے ہی لے کر آئی تھی اس کا باپ ہمیشہ گھر کی دال روٹی کھاتا جبکہ ماں نے کبھی بھی گھر کے پکے ہوئے روکھے سوکھے کھانے کو منہ نہ لگایا تھا۔ جانے کیوں......

ایک ایسا یادگار ناولٹ جو دلوں سے مکالمہ کرے گا — پہلا حصہ

ادھر مسلسل کوئی دروازہ بجا رہا تھا اس کا دل ہی نہ چاہا کہ اٹھ کر دیکھے کون ہے جانتی تھی کسی خیراتی ادارے سے کوئی کھانا دینے آیا ہوگا یا شاید کسی صاحب حیثیت خداترس نے ان لوگوں کے لیے ایک وقت کا کھانا بھیجا ہوگا ورنہ اس جذام بستی میں کسی کا کیا کام۔ یہاں آنے والوں کا تو

کوئی اپنا بھی پیچھے باقی نہیں رہتا، جو یہاں آتا تھا وہ یہیں سے رشتہ جوڑ لیتا تھا باہر کی دنیا کے لیے یہ لوگ اچھوت تھے وہ ان ہی سوچوں میں تھی جب اسے خالہ ثریا کی آواز سنائی دی۔

یہ بریانی ہے کوئی دینے آیا تھا ایک تھیلی میں نے تمہارے لیے بھی لے لی۔ اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا عین کمرے کے دروزے کے درمیان ہی خالہ ثریا کھڑی تھیں۔ جس کی رہائش اس کے برابر والے کمرے میں ہی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ آگے بڑھی اس کی چارپائی پر سرہانے کی طرف رکھی ٹیبل پر تھیلی رکھی اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو سے اس کی بھوک چمک اٹھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن جیسے ہی تھیلی کی سمت ہاتھ بڑھایا نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی کوڑھ زدہ گلے ہوئے ہاتھ۔ وہ کپکپا اٹھی گھبرا کر ہاتھ پیچھے کرلیا۔

حسن اور جوانی زندگی میں ایک ہی بار ملتے ہیں۔ ان سے جو حاصل کرسکتی ہو کرلو یہ ہی وقت ہے تمہارا اس وقت سے فائدہ اٹھاؤ۔“

جانے یہ آواز کس کی تھی اسے یاد ہی نہ آیا۔

اپنے ہوش ربا حسن سے تم یہ دنیا زیر کرسکتی ہو۔ ایک اور آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

کاش وہ دنیا کے بجائے اپنی آخرت کے لیے اتنی کوشش کرتی تو شاید آج یہاں اپنے گلے سڑے بدبودار جسم کو لے کر نہیں پڑی ہوتی۔ لیکن نہیں یہ بدبودار جسم تو اس بددعا کا نتیجہ تھا۔ جو اس رات اس نے اپنے دامن میں سمیٹی تھی۔ جب وہ اپنے سگے اور خون کے رشتے کا احترام بھلا بیٹھی تھی اسے کبھی یاد کرنے پر بھی یاد نہ آیا کہ اس شخص نے اسے کوئی بددعا دی ہو ہاں البتہ اس کی نظریں آج جب اسے یاد آتی ہیں تو اس کا دل چاہتا تھا چیخ چیخ کر روئے اتنا روئے کہ اس کے آنسوؤں میں ساری دنیا بہہ جائے، بریانی کی خوشبو نے ایک بار پھر سے اپنی طرف متوجہ کیا اس کے ساتھ ہی انواع اقسام کے بے شمار کھانوں کی خوشبو اس کے ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی اسے متلی سی محسوس ہوئی وہ باہر صحن کے کونے میں بنے باتھ روم کی جانب دوڑی اور پھرتے کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری ہوگیا۔

☆......☆......☆

سورج سوا نیزے پر کھڑا تھا۔ بس اسٹاپ سے گھر تک کا فاصلہ طے کرتے کرتے اس کی قمیض پسینہ سے شرابور ہوگئی حالانکہ وہ شروع سے ہی موسم کی اس سختی کا عادی تھا مگر نجانے کیوں آج اسے گرمی شدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ گھر کا بیرونی دوازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا۔ پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا سامنے ہی چھوٹے سے صحن کے کونے میں موجود نل سے ہاتھ منہ دھوتے ہی طمانیت کا گہرا احساس اس کے اندر تک اتر گیا تولیہ سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے وہ برآمدے میں داخل ہوا تخت پر فیما بیٹھی اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ یہ وقت احسن کے مدرسے کا تھا جبکہ جو ہر دوپہر کی شفٹ میں اسکول جاتی تھی گھر میں پھیلا سناٹا ظاہر کررہا تھا کہ حسب معمول فرحین گھر پر موجود نہ تھی اور یقیناً ماریہ بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے برآمدے میں بچھی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔

بابا پانی۔ فیما کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

”وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں اسٹیل کا گلاس تھامے اس کے بالکل قریب ہی کھڑی تھی۔

اسے اپنی اس چھوٹی سی گڑیا جیسی بیٹی پر ٹوٹ کر پیار آ گیا، وہ بے اختیار اٹھ بیٹھا غٹا غٹ سارا پانی پی گیا۔ ''تم نے کھانا کھالیا؟
پانی کا گلاس واپس کرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔
''نہیں۔'' فیھا نے معصومیت سے اپنا سر انکار میں ہلاتے ہوئے کہا۔ اماں نے کہا تھا وہ تھوڑی دیر میں آ جائیں گی پھر مجھے کھانا دیں گی۔''
غلام حسین نے بے اختیار گھڑی کی طرف نظر دوڑائی۔
جو تین بجا رہی تھی۔ روٹی ہے۔
جواب وہ پہلے سے ہی جانتا تھا اسی لیے خاموشی سے پاؤں میں چپل پہن کر باہر نکل گیا۔
وہ راج مستری تھا جب کوئی کام مل جاتا تو آدھی رات تک گھر واپسی ممکن نہ ہوتی ورنہ عام طور پر وہ شام تک باہر ہی رہتا کبھی ہوتا جو دوپہر میں گھر واپس آ جاتا جیسے کہ آج، لیکن جب بھی آتا ہمیشہ فرحین اور ماریہ کو غائب ہی پاتا۔ اس محلے میں کئی سالوں سے رہتے ہوئے بھی وہ محلے داروں سے اتنا واقف نہ ہوا تھا جتنا فرحین، آج بھی یقیناً وہ کسی کے گھر ہی گئی ہوگی۔ اس کی واپسی تک فیھا نے پلیٹ میں دال نکال کر چارپائی پر رکھ دی ابھی اس نے دو تین نوالے بمشکل نگلے تھے کہ برآمدے کا دروازہ کھول کر فرحین اندر داخل ہوئی کہ جسم سے آتی بھینی بھینی خوشبو نے بے اختیار غلام حسین کو اپنی نظر اٹھانے پر مجبور کر دیا گلابی سلک کے سوٹ میں اس کی گوری رنگت خوب دمک رہی تھی۔ اس کے عقب میں ہی ماریہ تھی جس نے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ اٹھا رکھا تھا، جس میں غالباً کھانا تھا وہ یہ پیکٹ لئے کچن کی سمت چل دی اس نے ایک نظر فرحین کی جانب دیکھا جو کہیں سے پندرہ سولہ سالہ بیٹے کی ماں نہ نظر آتی تھی۔
تمہیں میں نے کہا تھا نہ کھانا مت کھانا پھر کیوں کھا رہی ہو۔'' اس نے فیھا کو مخاطب کیا جو بنا کوئی جواب دیے باپ کے ہاتھ سے نوالے لے کر مزے سے چباتی رہی۔
''تم کہاں سے آئی ہو......؟''
نہ چاہتے ہوئے بھی غلام حسین نے فرحین سے پوچھ ہی لیا۔
آج نشا کے گھر میلاد تھا وہیں گئی تھی۔
''نشا کون؟'' یہ نام آج اس نے پہلی بار سنا تھا۔
''ارے تمہیں بتایا تو تھا پچھلی گلی میں رہتی ہے اپنا اتنا بڑا پارلر چلاتی ہے مجھے کہہ رہی تھی تم اور ماریہ پارلر کا کام سیکھ لو بہت فائدے میں رہو گی مگر اس لڑکی کو کون سمجھائے کہتی ہے مجھے شوق نہیں ہے۔''
اس نے کچن سے نکل کر کمرے کی طرف جاتی ماریہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''اچھا ہوا ماریہ نے خود ہی منع کر دیا ورنہ مجھے بھی یہ کام بالکل پسند نہیں ہے۔
غلام حسین کھانا کھا کر اٹھ کھڑا ہوا، اسے حیرت تھی فیھا جیسی سات، آٹھ سالہ بچی پر جسے بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو بھی اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ مزے سے دال روٹی کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر سے اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلنے میں مگن ہو گئی جبکہ فرحین ماریہ کے پیچھے ہی اندر کمرے میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

ایئرپورٹ لاؤنج سے باہر نکلتے ہی گرم ہوا

کے تھپیڑوں نے اس کا استقبال کیا اکتوبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا مگر کراچی کی گرمی ابھی بھی زوروں پر تھی یا شاید اسے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنا ٹرالی بیگ گھسیٹتی وہ مزید آگے بڑھی گرل کے اس طرف نوفل کھڑا تھا اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے آیا اور اس کا بیگ تھام لیا۔

''کیسی ہو......؟'' مقامی ایئر لائن کے مخصوص یونیفارم میں ملبوس اس کے سرخ وسفید چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''بالکل فٹ فاٹ تم سناؤ۔'' وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ایئر پورٹ سے نکل آئی لاہور کا موسم کراچی سے بالکل مختلف تھا لاہور میں اکتوبر اچھا خاصا ٹھنڈا ہوتا تھا جبکہ یہاں ابھی مئی جیسی ہی گرمی تھی۔

میں بھی ٹھیک ہوں اور تمہارا لندن کا وزٹ کیسا رہا......؟

نوفل نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے سوال کیا۔

ہمیشہ کی طرح فرسٹ کلاس۔ آنٹی کیسی ہیں؟

ٹھیک ہیں اور تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔

ایئر لائن کی گاڑی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی ڈرائیور اتر کر باہر آ گیا۔

یہ کیا تم گھر نہیں چل رہیں؟ نوفل نے حیرت سے سوال کیا۔

نہیں یار تم جانتے ہو میں نے ایک ماہ لگاتار فلائٹ کی ہیں اور کل رات بھی مجھے لاہور جانا ہے اسی لیے اج رات میں ہوٹل میں آرام کروں گی۔ تم مجھے دوپہر میں کسی ٹائم پک کر لینا۔ پھر میں تمہارے گھر ساتھ چلوں گی اور ہاں حرم کیسی ہے؟ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اسے حرم یاد آ گئی۔

اب تو کافی بہتر ہے وہ تمہارا بہت پوچھ رہی تھی کہ اس دفعہ تم کافی دن سے نہیں آئیں۔

چلو انشاء اللہ، اگر کل ٹائم ہوا تو میں تمہارے ساتھ ہاسپٹل بھی چلوں گی او کے۔

''اللہ حافظ۔'' نوفل نے اسے الوداعی ہاتھ ہلایا اور پھر روڈ پر اس وقت تک کھڑا رہا جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر صاحب جلدی آئیں ورنہ اس پاگل بابا نے سسٹر نورما کو مار ڈالنا ہے۔

وہ الماری سے کوئی فائل ڈھونڈ رہا تھا جب اسے سسٹر رومی کی متوحش زدہ آواز اپنے عقب میں سنائی دی وہ کرنٹ کھا کر پلٹا۔

واٹ ربش سسٹر نورما اس پاگل کے پاس کیا کرنے گئی تھی۔ تم نے اسے منع نہیں کیا۔

وہ الماری کھلی چھوڑ کر باہر کی سمت بھاگا۔

پتہ نہیں جی کل شام سے وہ بابا بغیر کچھ کھائے پیئے دیوار سے ٹیک لگائے جانے کیوں رو رہا تھا نورما کو جب یہ پتا چلا تو اظہار ہمدردی زبردستی گارڈ سے دروازہ کھلوا کر اسے کھانا کھلانے اندر چلی گئی، بس جی پھر کیا تھا جکڑ لیا اس پاگل نے اسے گردن سے کہتا ہے مار دوں گا نہیں چھوڑوں گا۔''

رومی اس کے ساتھ چلتی ہوئی جلدی جلدی ساری تفصیل سنا رہی تھی وہ اپنے مطلوبہ بیرک تک پہنچ گیا تھا۔ گارڈ نے بابا کو اپنی گرفت میں دبوچ رکھا تھا نورما کو اس سے چھڑوالیا گیا تھا جو دہشت اور تکلیف کے سبب بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور بابا سر جھکائے گارڈز کی گرفت میں تھا کچھ دیر قبل والا اس کا جوش شاید ختم ہو چکا تھا اب وہ بالکل نڈھال پڑا تھا مارنا مت اسے۔

بابا جی کی طرف بڑھتے ہوئے گارڈ کو ڈاکٹر

صمد نے ڈپٹتے ہوئے پیچھے ہٹایا اور دوسرے ہی پل بابا جی کے بازو میں انجیکشن اتار دیا جو غالباً نیند کا تھا۔ اس کے زیر اثر جلدی بابا جی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ تم نے نورما کو بیرک کی چابی کیوں دی تھی جب تم اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ شخص اپنے قریب کسی لڑکی کو برداشت نہیں کرتا۔

ڈاکٹر صمد غصے سے قریبی کھڑے گارڈ کی طرف پلٹا جو شرمندگی کے باعث سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے جھکے ہوئے سر پر قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے وہ تیزی سے ایمرجنسی کی جانب چل دیا جہاں نورما کو لے جایا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''میرے پروردگار شکر ہے تیرا جو تو نے مجھے خوبصورت نہیں بنایا۔''

اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے ہینڈسم سے شرجیل پر ایک نظر ڈالی جو بڑی تندہی سے زنگر کھانے میں مشغول تھا۔ اپنی ماں کے نزدیک جو خوبصورتی کا جو استعمال اس نے اپنے گھر میں دیکھا تھا اسے سوچ کر ہی اسے کراہت آئی تھی۔ اس کی ماں کو ہمیشہ سے یہ قلق تھا کہ وہ اس کی ساری اولاد سے شکل وصورت میں بالکل مختلف تھی بچپن میں تو اسے بھی اپنی کم شکلی کا افسوس ہوتا لیکن گزرتے وقت نے اسے سمجھا دیا تھا کہ شکل وصورت سے زیادہ عزت اہم ہوتی ہے اور یہ عزت وہ صرف اس لیے ہی پا سکی تھی کہ وہ حسن وخوبصورتی کے اس معیار پر پوری نہیں اترتی تھی جو اس کی ماں نے اپنا رکھا تھا۔

جلدی کرو شرجیل مجھے دیر ہو رہی ہے۔ جانتے ہو لیٹ ہونے پر آنٹی بہت ناراض ہوتیں ہیں۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے شرجیل کو ٹوکا۔

افوہ یار ایک تو تم اتنا پیسہ خرچ کر کے بیوٹیشن کا کورس کر رہی ہو اوپر سے آنٹی کے نخرے بھی برداشت کرتی ہو انہیں تو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے تمہارے طفیل وہ اپنا پارلر چلا رہی ہیں۔''

وہ جلدی جلدی کولڈ ڈرنک کے سپ لیتا ہوا بولا۔

وہاں ایک اکیلی میں ہی ان کی اسٹوڈنٹ نہیں ہوں کئی ہیں میرے جیسی چلو اب اٹھ جاؤ لنچ کا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔''

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے ایک بار پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی شرجیل ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' اس کے ساتھ باہر نکلتے نکلتے شرجیل کو کچھ یاد آ گیا۔

''کون سی بات......؟'' اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا شرجیل نے کیا کہا تھا، ارے یار کہا تو تھا کہ امی تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں رشتہ کے لیے۔''

موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتا ہوا بولا اس کی بات سنتے ہی وہ یک دم گھبرا اٹھی وہ کسی بھی حالت میں شرجیل کو اپنے گھر میں نہیں لے جا سکتی تھی اس کی ماں انڈے دینے والی مرغیاں ذبح نہیں کرتی تھی اور پھر اس کے گھر کا ماحول وہ سوچ کر شرمندہ ہو گئی۔ کہاں شرجیل کی ماں بہنیں، جو شرعی پردہ کرتی تھیں اور کہاں اس کی ماں۔ کیا سوچ رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ پھر کہو گی دیر ہو گئی۔

وہ اس کے کان کے قریب چلایا۔

اوہاں وہ چونکتے ہوئے بولی اور پھر اپنی قمیض سنبھال کر شرجیل کے پیچھے بیٹھ گئی۔'' دیکھو شرجیل

ہماری فیملی میں ذات برادری سے باہر شادی کا رواج نہیں ہے پھر بھی کوشش کروں گی اپنی اماں کو منانے کی اس کے بعد ہی تم اپنے گھر والوں کو بھیجنا۔''

یار یہ بات تو تم پچھلے کئی ماہ سے مجھ سے کہہ رہی ہو۔''

لیکن تم بھی تو یہ سوچو ہماری دونوں بڑی بہنیں کنواری ہیں پھر کس طرح تم ان سے پہلے شادی کرسکتے ہو۔''

اسے اچھی طرح یاد تھا شرجیل نے کچھ عرصہ قبل اسے یہ ہی جواز دیا تھا جلد شادی نہ کرنے کا لیکن پچھلے دو ماہ سے اسے کیا ہوگیا تھا۔ مسلسل شادی کی رٹ لگا رکھی تھی۔

وہ دونوں کسی پر بوجھ نہیں ہیں۔

وہ جانتی تھی شرجیل کی ایک بہن گورنمنٹ اسکول ٹیچر تھی جبکہ دوسری کپڑے وغیرہ سلائی کرلیتی تھی۔

''پھر بھی شرجیل'' اس کی سمجھ میں ہی نہ آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔

بہرحال تم میرے مسائل کو چھوڑو آج جا کر اپنی امی سے بات کرلو۔ میں بھی اپنے گھر والوں سے بات کر کے انہیں بھیج دوں گا۔''

وہ اسے پارلر کے گیٹ کے سامنے اتار کر تیزی سے موٹر سائیکل بھگا کر لے گیا وہ مرے مرے قدموں سے پارلر کی بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔ وہ شرجیل سے صرف کورٹ میرج کرسکتی تھی بصورت دیگر اس کی شادی اس طرح بالکل محال تھی۔ جس طرح شرجیل نے سوچا ہوا تھا اسے سمجھ نہ آرہا تھا وہ یہ سب شرجیل کو کس طرح سمجھائے۔

☆......☆......☆

جلدی جلدی سارا سامان سمیٹ دو تمہارا باپ گھر آگیا ہے۔

فرحین نے کمرے کے دروازے سے جھانک کر ماریہ کو خبردار کیا جو چارپائی پر آج کی شاپنگ کا سامان پھیلائے بیٹھی تھی۔ افوہ امی انہوں نے کون سا کمرے میں آنا ہے۔

پھر بھی اگر دیکھ لیا تو قیامت اٹھا دے گا سب کچھ سمیٹ کر اٹیچی میں ڈال دو۔ اسے ہدایت دے کر وہ باہر نکل گئی۔ ہوم ورک کرتی فیھا نے ایک نظر اپنی ماں پر ڈالی اور دوسری بڑی بہن پر جو تیزی سے سارا سامان سمیٹ چکی تھی لگتا ہی نہیں تھا کچھ دیر قبل یہاں ایک چھوٹا سا بازار سجا ہوا تھا۔ فیھا آج تک سمجھ نہ پائی تھی اس کی ماں اور بہن یہ ساری چیزیں اس کے باپ کی آمد پر کیوں چھپا دیتی تھیں۔ ابھی بھی وہ دیکھ چکی تھی ماریہ نے کھانے کا ڈبہ بھی چارپائی کے نیچے چھپا دیا تھا۔ جس میں غالباً بروسٹ تھا جو وہ کسی ریسٹورینٹ سے ہی لے کر آئی تھی اس کا باپ ہمیشہ گھر کی دال روٹی کھاتا جبکہ ماں نے کبھی بھی گھر کے پکے ہوئے روکھے سوکھے کھانے کو منہ نہ لگایا تھا۔ جانے کیوں فیھا کا دل کبھی بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے باپ سے چھپا کر کوئی چیز کھائے ایسا کوئی کھانا اس کے حلق سے نہ اترتا تھا ابھی بھی اس کا ارادہ بروسٹ کھانے کا نہیں تھا اسی لیے اپنی کاپی بند کر کے اس نے بیگ میں رکھی اور خاموشی سے چپل پہن کر باہر آگئی تاکہ اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکے۔ اسے ہمیشہ اچھا لگتا جب غلام حسین ننھے ننھے نوالے اس کے منہ میں ڈالتا اس کھانے کی لذت ہمیشہ اسے اپنے حلق میں محسوس ہوتی اور وہ اس لذت سے کبھی محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

السلام وعلیکم کیسی ہیں آپ۔
اسے دیکھ کر حرم نے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا اسے سامنے پا کر خوشی کا احساس حرم کے چہرے پر بھی جھلک رہا تھا۔
وعلیکم السلام۔ الحمد اللہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ کیسی طبیعت ہے؟"
اب تو کافی بہتر ہے اور یہ صرف آپ کی وجہ سے ہے۔۔
حرم نے تشکر بھری آواز میں جواب دیا۔
میں کون ہوتی ہوں کسی کی مدد کرنے والی میری ذات تو صرف وسیلہ تھی اصل میں تو سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے اسی کا شکر ادا کیا کرو۔
وہ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولی۔
یہ لو تمہارے لیے میں کچھ سامان لے کر آئی ہوں دیکھ لینا۔ مجھے امید ہے تمہیں سب پسند آئے گا۔"
اپنے ہاتھ میں پکڑا پیپر بیگ اس نے حرم کے سرہانے رکھ دیا اور خود اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نوفل جانے اسے یہاں چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا شاید ڈاکٹر سے کچھ مشورہ کرنے گیا تھا اس نے ایک نظر حرم کے چہرے پر ڈالی وہ پہلے سے خاصی ہشاش بشاش لگ رہی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی طبیعت اب کافی بہتر ہو چکی ہے۔
"آپ خود ملنے آجاتی ہیں میرے لیے یہی کافی ہوتا ہے اس لیے پلیز یہ سب نہ لایا کریں مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔
وہ بیگ اٹھا کر اس کے اندر جھانکتی ہوئی بولی جبکہ شرمندگی اس کے لہجہ سے چھلک رہی تھی۔
یہ سب کچھ میں تمہارے لیے اپنی خوشی سے لاتی ہوں۔ پلیز مجھے منع مت کیا کرو اسے ہمیشہ حرم سے مل کر خوشی ہی ہوتی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ وہ جب آتی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتی جبکہ آنٹی سے ملنے گھر جاتے ہوئے وہ کتراتی تھی اس کی وجہ نوفل کی امی کا عجیب وغریب سرد سا رویہ تھا جسے پچھلے ایک سال سے وہ سمجھ نہ پائی تھی، بظاہر تو وہ بہت اچھی طرح ملتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں جانے ایسا کیا ہوتا جو اسے الجھا دیتا اسے محسوس ہوتا جیسے آنٹی کو اس کا اور نوفل کا ساتھ پسند نہیں تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنے اس خدشے کا اظہار نوفل کے سامنے بھی کیا جسے وہ ہنس کر ٹال گیا وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی جب نوفل وارڈ میں داخل ہوا۔
ہاں بھئی کیا ہو رہا ہے؟
نوفل ڈاکٹر ہی کے پاس سے آیا تھا۔ جس کا ثبوت اس کے ہاتھ میں پکڑے چھ میڈیسن کے پیکٹ تھے جو اس نے حرم کے بیڈ کے ساتھ رکھی ٹیبل پر رکھ دیے وہ کچھ فروٹ بھی لایا تھا اور ساتھ ہی جوس کے ڈبے بھی ایک جوس نکال کر اس نے حرم کو دیا اور دوسرا اسے تھمایا جسے نا چاہتے ہوئے بھی اسے لینا پڑا ویسے وہ ابھی ابھی ہوٹل سے اچھا خاصا لنچ کر کے نکلی تھی۔ اب کچھ بھی لینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔
کچھ نہیں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔
وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے میری رات کی فلائٹ ہے اور مجھے اپنے روم سے کچھ سامان بھی سمیٹنا ہے۔
تم چلو میں آتا ہوں وہ حرم کے قریب رکھی کرسی پر ہی بیٹھا ہوا بولا۔
وہ حرم سے مل کر باہر نکل گئی مہنگے اسپتال کا

سینی ٹوریم جسے نوفل صرف اس کی مدد سے ہی افورڈ کر رہا تھا۔نوفل سے اس کی پہلی ملاقات تقریباً دوسال قبل اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنے ماموں کی اچانک موت پر اپنی والدہ کے ساتھ لاہور جا رہا تھا اس فلائٹ پر اس کی ڈیوٹی تھی دوران فلائٹ آنٹی کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی ایسے میں وہ ان دونوں کے بہت کام آئی ایک تو یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا دوسرا وہ تھی بھی نرم دل سی اس کی اس خوبی نے نوفل کو اس کا دیوانہ بنا دیا لاہور پہنچتے پہنچتے وہ اسے اپنا کارڈ دے چکا تھا۔دونوں نے ایک دوسرے سے موبائل نمبر بھی لے لیے تھے، پھر جب تک وہ لاہور رہا ہر دوسرے دن اس سے ملتا رہا،نوفل ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا اور اپنی ماں اور بہن کا واحد سہارا تھا۔اس کی بہن کو ہڈیوں کی ٹی بی تھی جس کا علاج کافی مہنگا تھا اپنی حیثیت سے تو وہ یہ فرض بڑی تندہی سے سرانجام دے رہا تھا۔پھر بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔جب وہ پہلی بار حرم سے ملی اسے یہ زرد رنگ والی کم گو سی لڑکی بہت اچھی لگی جسے بیماری نے نڈھال کر رکھا تھا اور پھر وہ لاشعوری طور پر وہ دل سے اس لڑکی کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوگئی اور تھوڑی سی تگ ودو کے بعد اس نے نوفل کو بھی منالیا وہ چاہتی تھی اپنی زندگی میں کوئی ایسا نیکی کا کام ضرور کرلے جو اس کی پچھلی زندگی کی سیاہی کو دھونے میں کام آسکے اسی سبب وہ اپنے پیسے سے کھل کر حرم کی مدد کر رہی تھی۔ اس کے علاج کے علاوہ اس کی بہترین غذا کے لیے بھی رقم فراہم کرتی تھی لیکن یہ سب کچھ اپنے گھر والوں سے چھپ کر کرتی تھی ورنہ جانتی تھی کہ یہ کارخیر انجام دینے کی اجازت نہ ملتی۔ان ہی خیالوں میں گم اس نے سر اٹھا کر شیشے کے اس پار حرم کے کمرے میں جھانکا نوفل اس کا ہاتھ تھامے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا وہ بے اختیار مسکرادی اس منظر نے اسے اپنا بھائی یاد دلا دیا اپنا اکلوتا بھائی جس سے وہ بے تحاشا پیار کرتی تھی اور جو کافی عرصہ سے اس سے دور تھا۔

☆......☆......☆

ارے پاگل ہوگئے ہو کیا اس وقت بابا گھر پر ہیں میں کیسے تم سے ملنے آسکتی ہوں ماریہ نے اپنی آواز کر مدھم کر کے اس میں گھبراہٹ کا عنصر شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی اس کے قریب ہی بیٹھی مرغی کی ٹانگ چباتی فرحین نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ساری بات سمجھ کر مسکرا دی۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں ابھی فون بند کرتی ہوں تم سے بعد میں بات کروں گی کسی طرح جلدی جلدی جان چھڑا کر اس نے فون بند کر دیا۔

اماں جانے تم بھی کیسے کیسے بے قوف لوگوں کو میرے پیچھے لگا دیتی ہوں۔فرحین کی گود میں سر رکھ کر لیٹتے ہوئے وہ لاڈ سے بولی بے وقوف ہی اچھے ہوتے ہیں ان کی ڈیمانڈ زیادہ نہیں ہوتی جتنا فائدہ ہم ان سے حاصل کرتے ہیں ان بے چاروں کو تو اس کے بدلے میں سوائے چھوٹی موٹی ملاقات کے اور کیا ملتا ہے۔ہمارا ہی بھلا زیادہ ہوتا ہے۔

فرحین اسے سمجھاتے ہوئے دھیرے سے بولی ماریہ کا سیل پھر سے بج اٹھا''اب کون ہے؟

''وہ ہی بے قوف شیراز اب یہ دماغ پکائے گا۔''

لیس کا بٹن دباتے ہوئے وہ اِک ادا سے بولی۔

اس سے کہنا رشید سے بریانی لے کر تو دے

جائے بڑا دل چاہ رہا ہے۔"

پہلا کھانا فرحین کے حلق سے نہ اترا تھا دوسرے کی لذت اسے پھر سے تڑپانے لگی ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

کون سی فلم؟ دوسری طرف شاید شیراز اسے کوئی فلم دکھانے لے جانا چاہتا تھا۔

"نہیں بھئی نہیں تمہیں تو پتہ ہے میں اماں کے بغیر کہیں نہیں جاتی۔ وہ ذرا سا اٹھلا کر بولی۔

فلم کا تو میں تمہیں سوچ کر جواب دوں گی ابھی تو فی الحال ذرا ایک کلو بریانی دے جاؤ اگر ہو سکے ہو کباب بھی دے جانا اماں گھر نہیں ہے یقین مانو بھوک سے برا حال ہے اور تم جانتے ہو مجھے روٹی دوٹی پکانے نہیں اتی۔"

"نہیں یار تم کوئی کچن کے کاموں کے لیے تھوڑی بنی ہو۔"

فون بند کر کے وہ شیراز کی نقل اتارتے ہوئے زور زور سے ہنسی اس کی اس ہنسی میں فرحین نے بھی بھرپور ساتھ دیا۔ اماں میں بھی بریانی کھاؤں گا۔"

قریبی چارپائی پر لیٹا احسن بھی بریانی کے نام پر اچھل کر بیٹھ گیا بریانی کے خیال سے ہی اس کے منہ میں پانی بھر گیا۔

ہاں ہاں ضرور کھانا بلکہ ایسا کر رشید کی دکان پر چلا جاؤ ہاں شیراز کھڑا ہے اس کا میسج آ گیا ہے واپسی میں دھیان سے آنا بابا نہ دیکھ لیں۔

ماریہ نے جلدی جلدی اسے سمجھا کر روانہ کیا اور خود اس وقت صحن میں ہی کھڑی رہی جب تک وہ واپس نہ آ گیا بریانی، کباب کے ساتھ ایک ڈیڑھ لیٹر کولڈ ڈرنک بھی تھی۔ اس نے جلدی سے احسن سے سارا سامان لیا اور دروازہ بند کر کے اندر کمرے میں آ گئی جہاں فرحین اس کی منتظر تھی

وہ اندر آتے ہوئے کچن سے پلیٹ اور گلاس بھی لے آئی تھی۔

فیما کہاں ہے؟ چاول کا پہلا چمچہ منہ میں رکھتے ہی فرحین کو فیما کی یاد آ گئی۔ وہ ساتھ والی خالہ کے گھر قرآن شریف پڑھنے گئی ہے۔

اوہ اچھا میں تو بھول گئی تھی فرحین نے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

جو کھانا بچ جائے وہ فیما اور جواہر کے لیے بھی رکھ دینا دونوں نے صبح کا ناشتہ ہی کیا ہوا ہے وہ اپنی پلیٹ میں ایک بڑی سی بوٹی ڈالتے ہوئے بولی جواہر کے لیے تو رکھ لوں گی لیکن فیما نہیں کھائے گی مجھے اس کا پتہ ہے وہ اپنے باپ کے سامنے زیادہ نخرے دکھاتی ہے ورنہ تو کھا لیتی ہے۔

بس تم رکھ دینا ورنہ کیا رات کے پکے ٹھنڈے کھائے گی۔

فرحین کے لہجے میں بیٹی کی محبت جھلک رہی تھی۔

وہ کھا لے گی اماں مجھے اس کا پتہ ہے پھر بھی تم کہتی ہو تو رکھ دیتی ہوں ویسے تم شرط لگا لو اس نے کھانے ٹھنڈے ہی ہیں اور فیما کے گھر آتے ہی ماریہ کی بات سچ ثابت ہو گئی۔

اماں میں نے خالہ زارا کے گھر بیٹھے چاول کھا لیے تھے۔

بریانی کی پلیٹ کو پرے ہٹاتے ہوئے بولی اور آگے بڑھ کر اپنے بیگ سے کاپی اور کتاب نکال کر ہوم ورک کرنے لگی اس کی اس حرکت پر ماریہ نے پلٹ کر اپنی اس آٹھ سالہ بہن پر ایک نظر ڈالی اسے حیرت تھی فیما کیسی بچی تھی جو کھانے کی مزے دار چیزیں دیکھ کر بھی اس کی طرف نہ لپکتی تھی یہاں تک کہ اگر کبھی ماریہ گھر آتے

ہوئے اس کے لیے چاکلیٹ لے آتے تو وہ یہ کہہ کر رد کر دیتی کہ مجھے چاکلیٹ پسند نہیں ہے جب کہ غلام حسین روز گھر آتے ہوئے اس کے لیے ٹافیاں لاتا جو وہ بہت شوق سے کھایا کرتی تھی۔ اس کی نسبت احسن کھانے پینے کا شوق اپنی ماں اور بہن جیسا ہی رکھتا تھا جس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ وہ ابھی بھی فیما کے چھوڑے ہوئے چاول لے کر پھر سے بیٹھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

ٹیکسی چھوٹے سے بنگلے کے خوبصورت گیٹ کے باہر رک گی پورا گیٹ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی خان بابا نے گیٹ کھول دیا اور آگے بڑھ کر اس کا سامان تھام لیا۔

السلام وعلیکم بی بی جی۔

وعلیکم السلام خان بابا کیسے ہو آپ؟

وہ خوشدلی سے بولی۔

اللہ کا شکر ہے ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہے بیٹا جی۔

وہ اس کا سامان لیے ساتھ ساتھ اندر آ گیا اور لاؤنج میں رکھے صوفے پر رکھ کر باہر واپس چلا گیا۔ ممی شاید گھر نہ تھیں وہ خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی گھر کے ہلکے پھلکے کپڑے نکالے اور فریش ہونے واش روم میں گھس گئی تقریباً پندرہ منٹ بعد جب وہ نکلی تو ناہید جوس کا گلاس لیے کھڑی تھی۔

ممی کہاں ہیں؟ ناہید کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے اس نے سوال کیا پتہ نہیں جی وہ شاید کھوکھر صاحب آئے تھے ان ہی کے ساتھ گئی ہیں۔

جوس کا گھونٹ حلق سے نیچے اترتے ہی اس کا حلق ایک دم ہی کڑوا ہو گیا آدھا بچا گلاس اس نے واپس ٹرے میں رکھ دیا اس کی ماں کی سرگرمیاں اس عمر میں بھی ختم نہ ہوئیں۔ یہ سوچتے ہی وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

اچھا تم اب جاؤ میں ڈنر باہر کروں گی، میرے لیے کچھ اسپیشل مت بنانا وہ جانتی تھی ناہید کیوں کھڑی ہے اس لیے اسے ہدایت دے کہ بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی۔ ناہید خاموشی سے باہر نکل گئی لیکن جاتے جاتے وہ کمرے کا دروازہ بند کرنا نہ بھولی۔

☆......☆......☆

"دیکھو شرجیل میری امی اس رشتہ پر بالکل بھی تیار نہیں ہیں اب تم بتاؤ کیا چاہتے ہو۔"

وہ آج دوٹوک بات کرنے کی نیت سے ہی اس کے ساتھ آئی تھی۔ شرجیل کے ہاتھ میں دبا سگریٹ اور اس کے جسم سے اٹھتے کلون کی بھینی بھینی خوشبو مل کر اس کے حواس سلب کر رہی تھیں۔

وہ آج تک یہ نہ جان پائی تھی کہ شرجیل اپنی بیس ہزار تنخواہ سے اتنی عیاشیاں کیسے افورڈ کرتا ہے جبکہ اس کی ماں بھی اکثر و بیشتر بیمار رہتی تھی مکان کرایہ کا تھا اس کے باوجود وہ شاہانہ زندگی گزارتا تھا۔

شرجیل کو قیمتی پرفیوم کا بے حد شوق تھا جس کا ذکر وہ اکثر ہی اس سے کرتا رہتا لہٰذا جب بھی اسے موقع ملتا وہ شرجیل کو پرفیوم ہی گفٹ کرتی۔ آج بھی اس کے لیے نہایت قیمتی پرفیوم لے کر آئی تھی، جو اس نے لندن سے خاص اسی کے لیے منگوایا تھا۔

"دیکھو جو بھی شادی تو مجھے صرف اور صرف تم سے ہی کرنی ہے اگر تمہاری امی مانتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ جیسے تم کہو میں بتا دیتا ہوں۔

پرفیوم کو پیکٹ سے نکال کر اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد وہ اسے واپس رکھ چکا تھا اور اب مکمل

طور پر اسی کی جانب متوجہ تھا۔ شرجیل کے آخری جملے نے جوہی کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی یہ ہی تو وہ الفاظ تھے جو شرجیل کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

سوچ لو اچھی طرح اگر میں تم سے کچھ ایسا کہہ دوں جو تم نہ مانے تو......

وہ اچھی طرح جانچ کر بات منہ سے نکالنا چاہتی تھی۔

ایسا ہو نہیں سکتا تم جو کہو گی مجھے منظور ہوگا یہاں تک کہ اگر تم چاہو تو میں آج اور اسی وقت تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں جہاں تم بولو مسجد یا کورٹ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔...... شرجیل کے لہجہ کی استقامت نے جوہی کو سرشار کر دیا کبھی کبھی تو وہ خود حیران ہو جاتی کہ شرجیل جیسے خوبرو نوجوان نے اس جیسی سانولی سلونی لڑکی میں ایسا کیا دیکھا جو اس پر اپنا تن من وارنے کو تیار تھا شاید یہ نصیبوں کی بات ہوتی ہے یہ اس کے نصیب ہی تھے جو شرجیل جیسا بندہ اس کا مقدر بننے والا تھا۔

"دیکھو شرجیل اگر میں تم سے کہو کہ مجھ سے کورٹ میرج کر لو تو کیا ایسا ممکن ہے" وہ رک رک کر بولی۔

ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی ایک دفعہ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو ایسا نہ ہو کل کو تمہیں اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑے۔

شرجیل پر سوچ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

نہیں ایسا کبھی بھی نہ ہوگا میں ہر قیمت پر تمہارے ساتھ ہوں۔

اپنے گھر کے ماحول سے فرار کا اتنا خوبصورت راستہ اسے دوبارہ نہ مل سکتا تھا اسی لیے وہ آج ہی فیصلہ چاہتی تھی۔

تو ٹھیک ہے میں اس جمعہ کو تمہارے ساتھ باقاعدہ نکاح کروں گا۔ اپنے گھر والوں کی موجودگی میں، تم چاہو تو اپنی کسی دوست کو انوائیٹ کر سکتی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں اس نے ایک سیکنڈ میں ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

نہیں میرا کوئی دوست نہیں ہے سوائے تمہارے اور میں امید کرتی ہوں تم مجھے کبھی دھوکہ نہ دو گے۔" جوہی نے اپنا ہاتھ ٹیبل پر دھرے شرجیل کے ہاتھ پر رکھ دیا جانے کیا سوچ کر اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

چلو میں تمہیں پارلر چھوڑ دوں آج سٹرڈے اب میں تم سے ملنے جمعرات کو ہی آؤں گا اس سے قبل اپنی تیاری مکمل کر لوں گا تمہیں بھی اس سلسلے میں جو تیاری کرنی ہے کر لو۔

وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور ٹیبل سے چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

جوہی کچھ دیر اپنی کرسی پر بیٹھی رہی اور پھر تھکے تھکے قدموں سے اس کے پیچھے چل دی۔ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اس نے تنہا ہی طے کر لیا تھا اور اس فیصلہ کی تھکن ابھی سے اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

افوہ غلام حسین تمہارے پسینہ کی بو بڑی گندی ہے۔"

وہ باہر سے تھکا ماندہ گھر آیا تھا ابھی چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ وہاں پہلے سے موجود فرحین بدک کر دور ہٹ گئی وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ دراصل آج چھت کی بھرائی کا کام تھا نہ تو بس اسی لیے۔

فرحین کے صاف ستھرے وجود پر نظر ڈالتے ہوئے وہ تھوڑا سا مرعوب ہو گیا چلو تو ہو گئی چھت

بھرائی پر اب پہلے نہا دھو لو پھر آ کر چار پائی پر بیٹھنا۔

وہ پہلے کی طرح ناک منہ چڑھاتے ہوئے۔
غلام حسین خاموشی سے تولیہ اٹھا کر باتھ رم کی طرف چل دیا۔

کہاں یہ اور کہاں ملک صاحب۔

اسے پیچھے سے دیکھتے ہوئے وہ فوراً اس کا موازنہ ملک صاحب سے کر بیٹھی پچھلے دو ماہ سے اس کی ملاقات ملک وقار صاحب سے ہو رہی تھی وہ جب بھی اس سے ملتی ان کی شخصیت کے سحر میں کئی دن گرفتار رہتی ان دونوں کی پہلی ملاقات نشاء نے ہی کروائی تھی اس کے بعد ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چل ہی پڑا ملک وقار اس کے حسن جہاں سوز سے مرعوب تھا اور دل کھول کر اس پر پیسہ لٹاتا تھا ابھی تو غلام حسین کے ڈر سے وہ ملک وقار کے پیسے کے بل بوتے پر کھل کر عیاشی نہ کر پا رہی تھی ورنہ اس کا بس چلتا تو اس کروڑ پتی بندے سے اپنے لیے اے سی والی گاڑی ضرور ہتھیا لیتی۔

آج بھی وہ غلام حسین کے گھر آنے سے قبل ہی ملک وقار سے مل کر آئی تھی یہ ہی سبب تھا جو اسے غلام حسین کی پسینہ کی بو نے بدحال کر دیا تھا۔ اس کے حواسوں پر تو ابھی تک ملک کے مہنگے سگار اور کلون ہی کی خوشبو سوار تھی۔ شروع شروع میں تو وہ اس طرح کے کاموں سے کافی گھبراتی تھی کہیں غلام حسین کو پتہ نہ چل جائے لیکن نشاء کی مکمل حوصلہ افزائی نے اس کے اندر موجود شیطان کو مزید ہوا دے دی تھی۔

اسے نشاء کی پہلی آفر آج بھی اچھی طرح یاد تھی کہ اس دن وہ نشاء کی سالگرہ کی دعوت کھانے سی ویو کے ایک مہنگے ریسٹورینٹ گئی تھی ماریہ کو وہ نشاء کے پارلر میں چھوڑ گئی تھی جہاں وہ شیراز کے ساتھ ٹیلی فون پر بزی تھی وہ نشاء کا ریڈ قیمتی سوٹ پہنے کہیں سے بھی ایک مزدور کی غریب بیوی دکھائی نہ دے رہی تھی سچ ہے لباس پوری شخصیت کو تبدیل کر دیتا ہے نشاء کے قیمتی لباس نے اس کے جسم کو سجا دیا اور وہ دنیا میں نمایاں نظر آنے لگی۔ اس قیمتی لباس نے اس کی روح کو جو گندگی عطا کی وہ کسی کو نظر نہ آئی وہ دونوں کھانے کا آرڈر دے کر قریبی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئیں۔ جب کچھ دیر بعد نشاء نے اس کی توجہ دو ٹیبل چھوڑ کر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص کی جانب مبذول کروائی۔

عجیب بے قوف آدمی ہے جب سے یہاں آئے ہیں گھورے ہی جا رہا ہے۔

نشا کی نشاندہی پر اس نے بھی پلٹ کر دیکھا وہ شخص یقینی طور پر ان دونوں ہی کی جانب متوجہ تھا دیکھتے ہی مسکرا دیا۔

دفع کرو ہمیں کیا۔ فرحین نے نشاء کی توجہ اس سے ہٹانا چاہی۔

ایسے لوگ دفع کرنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ ذبح کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ نشا ہلکہ سا قہقہہ مار کر ہنسی۔

''کیا مطلب؟'' فرحین اس کا مطلب بالکل بھی سمجھ نہ پائی۔

''ابھی سمجھاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

تم کہاں جا رہی ہو۔

فرحین نے گھبرا کر پوچھا وہ کبھی کسی ریسٹورنٹ نہ گئی تھی ایسے میں اگر نشاء کہیں چلی جاتی تو وہ اکیلی کیا کرتی جسٹ آمنٹ ابھی آئی۔

اِک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ کاؤنٹر کی جانب بڑھی اگلے ہی پل فرحین نے

ایک حیرت انگیز منظر دیکھا سامنے بیٹھا شخص بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا دونوں نے ایک سیکنڈ کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر بات کی اور دوسرے ہی پل نشا اس اجنبی کو لے کر ٹیبل کی طرف آتی نظر آئی۔

بیٹھیں خان صاحب آپ یقیناً ہمارے پاس بور نہ ہوں گے۔

خان صاحب بجائے بیٹھنے کے تولتی ہوئی نگاہوں سے فرحین کا جائزہ لے رہا تھا جو اس کی نظروں سے نروس ہوئے جا رہی تھی۔

پہلے اپنی دوست سے تو پوچھ لیں انہیں تو کوئی اعتراض نہ ہوگا ارے نہیں نہیں اسے کیا اعتراض ہوگا پلیز بیٹھیں آپ ہمیں جوائن کریں ایکچویلی میں اپنی سالگرہ کے سلسلے میں لنچ کے لیے اسے یہاں لائی ہوں اور مجھے خوشی ہوگی اگر آپ بھی میری دعوت قبول کر لیں۔'' نشاء اپنے مخصوص اسٹائل میں بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی ساتھ ہی ساتھ اس نے نظر بچا کر فرحین کو آنکھ بھی مار دی۔

''کیا نام ہے جی آپ کا؟''

خان صاحب اس پر لٹو ہوتے ہوئے بولے۔

''فرحین۔''

'' آپ کا نام بھی آپ ہی کی طرح خوبصورت ہے'' یہ اس کی خان صاحب سے ہونے والی پہلی ملاقات تھی۔

اور پھر نشاء کی حوصلہ افزائی کی بنا پر وہ کئی بار خان صاحب سے ملی۔ خان صاحب کے آئل ٹینکر چلتے تھے بیوی بچے پشاور میں تھے یہاں خود وہ ایک لگژری فلیٹ میں رہتا تھا۔ جہاں کئی بار فرحین بھی گئی خان صاحب سے جب بھی وہ ملاقات کرنے جاتی ماریہ کو ہمیشہ پارلر ہی چھوڑ جاتی لیکن پھر بھی وہ ہر بات جانتی تھی کہ اس کی ماں کا نیا افیئر کس کے ساتھ چل رہا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی ملاقات کا تمام احوال من وعن ماریہ سے ڈسکس بھی کرتی اور پھر خان صاحب کے بعد اس نے کئی لوگوں سے افیئر چلائے ان سے حاصل ہونے والی رقم کو وہ اپنی عیاشی میں خرچ کرتی اب باہر جاتے ہوئے اسے نشا سے مانگ کر کپڑے نہ پہننے پڑتے بلکہ وہ خود ایک سے ایک قیمتی لباس کی مالک تھی پہلے تو وہ اس رقم سے گھر کے لیے کچھ نہ کچھ لیتی لیکن جب پہلی بار اس نے استری خریدی اور غلام حسین نے زیادہ باز پرس نہ کی تو وہ شیر ہوگئی اب وہ گھر کے لیے چھوٹی موٹی شاپنگ کر لیتی غلام حسین کو بتاتی کہ وہ سامان بچت کی کمیٹیوں سے خریدتی ہے کبھی کبھی غلام حسین حیران ضرور ہوتا کہ کس طرح فرحین اتنے کم پیسوں سے بچت کر لیتی ہے اس کا جواز بھی فرحین کے پاس موجود تھا۔

ماریہ نشاء کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے جو پیسے نشا اسے دیتی ہے ان سے میں کمیٹی ڈال لیتی ہوں۔

اس کی اس تاویل سے غلام حسین کافی حد مطمئن ہوگیا۔

☆......☆......☆

فون جانے کب سے بج رہا تھا اس نے بمشکل اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور یہاں وہاں ہاتھ ڈال کر سیل برآمد کیا یس کا بٹن دبا کر کان سے لگا لیا دوسر طرف جو ہی تھی جو اس کی آواز سنتے ہی چلائی۔

کہاں مری ہوئی تھیں تم کب سے فون کر رہی ہوں۔

پتہ ہی نہیں چلا بس گہری نیند سو گئی تھی۔

جوہی کی آواز نے اس کی نیند کو بھگا دیا تھا۔
تم آج مجھ سے مل سکتی ہو؟
آج؟؟ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔
کیوں کیا آج تمہاری فلائٹ ہے؟
نہیں وہ تو کل رات کی ہے سنگاپور جانا ہے۔
تم آج ہی آؤ گی اور ہاں جلدی آجانا بس میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔
اور ہاں جلدی آجانا لنچ ہم دونوں مل کر ہی کریں گے وہ سمجھ گئی کہ جوہی اس سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔
''اوکے میں آرہی ہوں۔'' بنا سوچے ہی اس نے جواب دیا اور فون بند کر کے تیار ہونے میں اسے صرف پندرہ منٹ ہی لگے جوہی سے ملنے کی خوشی میں تیار ہو کر وہ جلدی جلدی نیچے اتری لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پر بیٹھی اپنی ماں کو دیکھتے ہی اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی سیلولیس بلاؤز، بلیک شیفون کی ساڑھی کے ساتھ گولڈن بال اور نفاست سے کیے گئے میک اپ سے وہ کسی طور ایک پینتالیس سالہ عورت نہ دکھ رہی تھی جانے ایسا کیا کرتی تھی جس سے اس نے اپنا حسن آج بھی سنبھال رکھا تھا۔
''کہاں جارہی ہو تم؟''
پاس رکھے گلاس میں موجود مشروب حلق سے اتارتے ہوئے اس نے سامنے کھڑے اپنی بیٹی کا سرتاپا جائزہ لیا کہیں نہیں ذرا لنچ کرنے باہر جارہی ہوں کیونکہ اکیلے گھر میں مجھ سے کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔
جوہی سے ہونے والی ملاقات وہ کسی طور بھی اپنی ماں کو نہ بتا سکتی تھی یہ ہی سبب تھا جو اسے جھوٹ بولنا پڑا۔
ضرورت نہیں ہے ناہید تمہاری پسند کا جھینگا بنا رہی ہے اور آج رات کچھ لوگ ڈنر پر انوائیٹ ہیں لہٰذا تم لنچ کے بعد کچھ دیر آرام کرو اور پھر ڈنر کے لیے اچھی سی تیاری شروع کرنا۔
اسے اچھی طرح سب سمجھانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی اب اس کا گھر سے باہر نکلنا تقریباً ناممکن تھا وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی اور میسج کر کے تمام صورتحال جوہی کو بھجوا دی وہ جانتی تھی جوہی ہر بات اچھی طرح سمجھ جائے گی کچھ دیر قبل والی خوشی کوفت میں تبدیل ہوگئی اس کا ڈنر اٹینڈ کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا لنچ کرتے ہی وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا جواب اسے ڈنر کے اختتام پر ہی کھولنا تھا۔

☆......☆......☆

تم بیگم روحی کو جانتی ہو؟
نشاء نے اس کی آئی برو بناتے بناتے یک دم رک کر سوال کیا فرحین نے اس سوال پر گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔
''میرا خیال ہے کہ نہیں۔''
اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا بیگم روحی کون ہے؟
''ارے وہ فیشن ڈیزائیز دبلی سی بطخ جیسی گردن والی۔''
نشاء نے ہنستے ہوئے روحی کا حلیہ سمجھانے کی کوشش کی۔
''یاد نہیں پچھلے ہفتہ اپنا فیشل کروانے آئی تھی۔ تو ماریہ پر ریشہ خطمی ہوتی جارہی تھی۔''
''اوہ ہاں یاد آیا آپا کیا ہوا اسے؟''
فرحین کے تصور میں بیگم روحی کا سراپا چھم کر کے اتر آیا۔

اسے کیا ہونا ہے اپنے ڈریسز لانچ کر رہی تھی مقامی ہوٹل میں اس کے لیے، اسے کچھ ماڈلز درکار ہیں میرے پاس آئی تھی ماریہ کے لیے آفر لے کر لیکن ظاہر ہے میں تم سے پوچھے بغیر تو ہاں نہ کر سکتی تھی اس لیے میں نے جواب دینے کے لیے کچھ وقت مانگ لیا ہے۔ اب تم بتاؤ کیا چاہتی ہو۔

''آفر تو بری نہیں ہے مگر۔'' وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

مگر کیا؟

تم غلام حسین کو اچھی طرح جانتی ہو وہ کبھی یہ برداشت نہ کرے گا کہ ماریہ ماڈلنگ کرے۔

تو کیا ماریہ ماڈلنگ غلام حسین سے اجازت لے کر کرے گی؟

نشا نے تمسخرانہ آمیز لہجے میں سوال کیا فرحین کچھ نروس ہو گئی۔

''دیکھو فرحین میں بہت صاف گو عورت ہوں میری بات ہو سکتا ہے کہ تمہیں بری لگے مگر سچ تو یہ ہے کہ تم آج تک جو کچھ کر رہی ہو غلام حسین سے پوچھ کر رہی ہو؟ نہیں نا تو پھر اب تمہیں غلام حسین کا خیال کیسے آ گیا۔

نشاء اسے آہستہ آہستہ آئینہ دکھا رہی تھی۔ فرحین شرمندہ سی ہو گئی میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ میں تمہیں صرف یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ وہ سب کچھ جو تم کر رہی ہو اگر غلام حسین اس سے لاعلم رہ سکتا ہے تو پھر بھلا ماریہ کی ماڈلنگ کا اسے کیسے پتہ چلے گا۔ دوسرے کاموں کی طرح یہ بھی پردے میں رکھ کر کرو۔ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

اگر کبھی کہیں کوئی تصویر وغیرہ دیکھ لی تو قیامت آ جائے گی تم تو جانتی ہو ماڈلز کی تصویریں سائن بورڈ پر لگ جاتی ہیں۔

وہ جانتی تھی یہ ایک ایسا بودا سا جواب ہے مگر سچ یہ تھا کہ وہ اس مسئلے پر غلام حسین سے خوفزدہ تھی اس کے غصہ سے ڈرتی ہوئی جو کبھی کبھی آتا مگر تباہی مچا دیتا۔

میک اپ ماریہ کو اس قدر تبدیل کر دے گا کہ تم بھی نہ پہچان پاؤ گی۔

اور ویسے بھی یہ مقامی ہوٹل میں ہونے والا ایک فیشن شو ہے اور ایسے شوز میں کسی نئی ماڈل کی تصاویر اخبار کے صفحہ اول پر شائع نہیں ہوئیں اور نہ ہی کہیں سائن بورڈ پر نظر آتی ہیں۔ سوچ لو اچھی طرح بیگم رومی اس آفر کے بدلے تمہیں ایک معقول رقم دے گی۔

وہ پیار سے چارہ ڈالتے ہوئے اسے رام کر رہی تھی۔

اچھا اگر تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے ویسے میں ایک بار ماریہ سے بھی مشورہ کر لوں اب کہ اس کی آواز پہلے سے بھی کمزور تھی۔

ماریہ کو اس سلسلے پر کوئی اعتراض نہ تھا وہ فوراً سے بیشتر تیار ہو گئی۔ اب اصل مسئلہ رات کے وقت گھر جانے کا تھا۔

غلام حسین آج کل فجر کے وقت جو گھر سے نکلتا تو رات گئے ہی واپس گھر کا رُخ کرتا ایسے میں وہ اتنا تھکا ہوتا کہ گھر کی طرف دھیان دینے کی اسے فرصت ہی نہ ملتی آتا نہا دھو کر کھانا کھاتا اور سو جاتا فرحین گھر کی مکمل مختیارِ کل تھی۔ اب تو دو تین بار ملک وقار غلام حسین کی غیر موجودگی میں گھر بھی آ چکا تھا۔ جس کا علم غلام حسین کو بالکل بھی نہ ہوا تھا ان ہی سب باتوں نے مل کر فرحین کے حوصلہ کو تقویت بخشی تھی۔ غلام حسین کی محلے میں بھی کسی سے اتنی سلام دعا نہ تھی جو کوئی اس

کے کان فرحین کے خلاف بھرتا بیگم رومی سے ہونے والے ایگریمنٹ کے بعد نشا کے پارلر سے ہی تین چار باران کے بوتیک گئی تھی۔ جہاں ایک انسٹریکٹر کی ہدایت کی روشنی میں اسے چلنے کا ڈھنگ سکھایا جارہا تھا جس دن فیشن شو تھا اس دن بھی یہ دونوں شام سے ہی بیگم روجی کے ساتھ تھیں غلام حسین نشا کا گھر نہ جانتا تھا اس لیے وہ مطمئن تھی اسے خدشہ نہ تھا کہ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا نشا کے گھر آجائے گا ویسے بھی اس نے نشاء کی ہدایات کے پیش نظر جب سے گھر کے چھوٹے موٹے اخراجات میں حصہ ڈالنا شروع کیا غلام حسین پہلے سے کافی تبدل ہوگیا تھا معمولی معمولی باتوں پر جرح کرنے والی اس کی عادت میں نمایاں کمی واقع ہوئی تھی نشاء کا کہنا تھا اگر عورت کے ہاتھ میں پیسہ ہو تو مرد کی زبان بند رکھی جاسکتی ہے لیکن فرحین جانتی تھی کہ وہ اپنے پیسہ کا استعمال ایک خاص حد تک کرسکتی ہے۔

زیادہ پیسہ جو غلام حسین کو کسی شک میں مبتلا کردے فرحین کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا وہ چھپ چھپا کر بے جا پیسہ اپنی اور ماریہ کی ذات پر خرچ کرتی، جواہر کو بھی کھلا خرچہ ملنے لگا۔ احسن بھی دن میں سو روپے کا ویڈیو گیم ہی کھیل آتا صرف ایک فیما کی ذات ایسی تھی جو آج بھی پانچ روپے لے کر اسکول جاتی اسے چاکلیٹ، کولڈ ڈرنک کچھ پسند نہ تھا اب تو فرحین نے اسے اُس کے حال پر ہی چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

سر میں ایک بات آج تک سمجھ نہ پایا۔

ڈاکٹر صمد نے اپنے سامنے بیٹھے پروفیسر کمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو باباجی کی فائل کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کررہے تھے۔

کیا بات؟ انہوں نے سر اوپر اٹھا کر چشمہ کی اوٹ سے جھانکا۔

وہ یہ کہ بابا ظاہری طور پر ایک معذور، ضعیف اور دھان پان سا شخص ہے پھر کسی لڑکی کو دیکھ کر اس میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے جو اس لڑکی کو چھڑوانے کے لیے چار چار گارڈ کم پڑجاتے ہیں۔

کئی دنوں سے دل میں آیا سوال ڈاکٹر صمد کی زبان پر آگیا۔

''شاید اس شخص کے اندر کسی لڑکی کے خلاف اس قدر نفرت بھری ہوئی ہے کہ کسی بھی ایسی لڑکی کو دیکھ کر باہر آجاتی ہے جو عمر میں اس لڑکی کے برابر ہو جس سے یہ شخص نفرت کرتا تھا اور وہ نفرت ہی اسے طاقت بخشتی رہی ہے۔

ڈاکٹر کمال نے پرسوچ لہجہ میں جواب دیا۔

ممکن ہے ایسا ہی ہو جو آپ کو شاید یاد ہوگا پچھلی دفعہ ایک ٹی وی اینکر پر اس شخص نے اس وقت حملہ کیا جب وہ زبردستی اس کے بیرک میں انٹرویو لینے گھس گئی تھی شاید وہ بیس بائیس سال کی تھی۔ اس سے پہلے ایک سوشل ورک کی طالبہ پر بھی ایسا حملہ کرچکا ہے جبکہ وہ طالبہ بمشکل 18 سال کی تھی این جی او والی صاحبہ بھی شاید بیس بائیس سالہ ہی تھیں۔

اصل میں یہ عمر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حملے کی زد میں ہمیشہ نوجوان لڑکیاں ہی آتی ہیں جبکہ دوسرے تمام لوگوں کے لیے یہ بالکل بے ضرر ہے جس کے پیچھے وہ ہی وجہ ہے جو میں تمہیں بتارہا ہوں۔

پروفیسر کمال جواب دے کر پھر سے فائل کے مطالعہ میں غرق ہوگئے۔ ڈاکٹر عبدالصمد اپنا کوٹ اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا یہ وقت اس کے وارڈ

کے راؤنڈ لینے کا تھا۔

☆......☆......☆

جمعرات آ گئی اور گزر گئی شرجیل کا کوئی نام ونشان نہ تھا وہ جس دن سے جوہی سے مل کر گیا تھا اس نے کوئی رابطہ بھی نہ کیا تھا پہلے دو دن تو جوہی نے بھی خود سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کی وہ چاہتی شرجیل ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرے جس میں جوہی کی طرف سے کوئی دباؤ شامل نہ ہو مگر تیسرے دن مجبور ہو کر اس نے میسج کیا جس کا شام تک جواب نہ آیا، رات میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ فون پر کال کرتی رہی ،بیل جا رہی تھی لیکن دوسری طرف سے ریسو کیے بغیر ہی کاٹ دیا گیا جوہی دل برداشتہ ہو گئی مجھے شرجیل کے وعدے کے مطابق جمعرات تک انتظار کرنا چاہیے۔

اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا گھر والوں سے چھپ کر وہ اپنا بیگ تیار کر چکی تھی۔ جس کے بارے میں صرف اس کی چھوٹی بہن کو علم تھا جو اسے ایک بار سمجھانے کی ناکام کوشش کر چکی تھی۔

سوچ لو اگر اس نے تمہارا ساتھ دھوکہ کیا تو کیا ہو گا؟

پھر میرا نصیب ویسے بھی ہماری ماں کی دی ہوئی تربیت کے مطابق ہمارا مصرف صرف مرد کا دل بہلا کر اس سے پیسہ حاصل کرنا ہے، ہم کون سی معاشرے کی نظر میں عزت دار لڑکیاں ہیں، آج اگر شرجیل دھوکہ دے کر چھوڑ جائے گا تو واپس اسی ماحول میں آ جاؤں گی جس سے فرار کے لیے یہ راستہ اختیار کر رہی ہوں اور مجھے امید ہے کہ ہماری ماں مجھے پھر سے گلے لگا لے گی بلکہ زیادہ خوشی سے لگائے گی کیونکہ اس کے بعد میں اس کی ہر وہ بات ماننے لگوں گی جسے آج مانتے ہوئے میری جان جاتی ہے۔

وہ دکھی لہجہ میں وضاحت کرتے ہوئی بولی اس کی وضاحت نے چھوٹی بہن کو لاجواب کر دیا وہ جانتی تھی جوہی جو کچھ کہہ رہی ہے وہ بالکل سچ ہے۔

تو پھر میں تمہارے لیے ہمیشہ اچھے نصیب کی ہی دعا کروں گی خدا کرے تم ہمیشہ ایک عزت کی زندگی گزار سکو۔ اپنے بچوں کو کم از کم ایسی زندگی نہ دو جو ہم گزار رہے ہیں۔

وہ اس کے ہاتھ تھام کر بڑے ہی خلوص سے بولی۔

مگر پھر جمعرات آ کر گزر گئی جوہی بالکل نا اُمید ہو گئی شاید شرجیل اس کی فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں جان چکا تھا سمجھ چکا تھا کہ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے۔

اس کی بظاہر باعزت ماں لڑکیوں کی دلال ہیں جس کے لیے باقاعدہ وہ اپنا بنگلہ استعمال کرتی تھی پولیس کو باقاعدہ بھتہ دے کر ان کا منہ بند کیا گیا تھا اس دلالی میں اس نے اپنی سگی اولاد کو بھی نہ بخشا بلکہ اس نے تو اس کام کی ابتدا ہی اپنے ساتھ ساتھ اپنی جواں سال بیٹی سے کی تھی۔

اس خیال نے جوہی کو بالکل مایوس کر دیا وہ دریا سے نکلی ہوئی ایک ایسی مچھلی تھی جسے واپس پانی میں جانے کے لیے ہمدرد ہاتھوں کی ضرورت تھی لیکن ابھی شاید اس کے نصیب میں دریا کا پانی نہ تھا جمعرات کے بعد آنے والا ہر دن جوہی کو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرف دھکیل رہا تھا ہر ڈوبتے سورج کے ساتھ اس کی امید بھی دم توڑ جاتی تھی مگر پھر بھی وہ اپنے خدا سے مایوس نہ تھی۔

بیگم روحی کے فیشن شو کے بعد ماریہ کو کوئی

دوسری آفر تو نہ ملی البتہ وہ لوگوں کی نظروں میں ضرور آ گئی تھی چونکہ فرحین نہیں چاہتی تھی وہ بے وقوف نہ تھی جانتی تھی اگر ماریہ فرحین کی بیٹی کی حیثیت سے سامنے آ گئی تو اس کا سراسر نقصان فرحین کو ہی ہوگا ایک جوان بیٹی کی ماں کی حیثیت سے اس کی ویلیو بالکل ختم ہو جائے گی۔

اگر ماریہ کو ماڈلنگ کی مزید آفر ملے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس سے جو امید کرنل صاحب لگائے بیٹھے ہیں وہ تقریباً ناممکن ہے اس لیے تم انہیں اس سلسلے میں صاف انکار کر دو۔

وہ نشا کو صاف لفظوں میں اپنا انکار سنا کر بالکل مطمئن ہو گئی وہ خود تو غیر مردوں سے تعلقات استوار کر سکتی تھی مگر ماریہ کے سلسلے میں ابھی وہ اتنا بڑا رسک لینے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

جو بھی تھا غلام حسین کا تھوڑا بہت خوف اسے اپنے اس امر سے باز رکھنے کا سبب بن رہا تھا۔ اس لیے آس پاس کے بے ضرر لڑکوں سے ہی ماریہ کا افیئر تھا جس کے نتیجہ میں ان کی کافی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں اور ان باتوں سے ماریہ کی ذات کو بھی کوئی نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ تھا ویسے بھی ابھی وہ خود اس قابل تھی کہ ملک اور خان جیسے لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچا کر اپنے نفس کی خواہشات کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات بھی پور کر سکے۔

☆......☆......☆

میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرا دی ہے میرا خیال ہے تم حرم کے ٹیسٹ باآسانی کروا سکو گے پھر بھی اگر کم ہو تو بتا دینا میں ایک ہفتہ تک کراچی کا چکر لگاؤں گی جو رقم کم ہوئی وہ تمہیں پہنچا دوں گی۔''

اس کی آج یورپ کی فلائیٹ تھی صبح ہی اسے نوفل نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ حرم کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہونے ہیں جس کے لیے ایک خطیر رقم درکار ہے نوفل کے فون کے بعد اس نے فوراً بینک فون کیا اور مطلوبہ رقم نوفل کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا دی اس اکاؤنٹ میں رقم وہ پہلے بھی ٹرانسفر کرتی رہتی تھی اس لیے اسے اب اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی مینیجر اعتماد کا بندہ تھا یہ ہی وجہ تھی کہ ابھی اس کی ماں کو ان تمام سرگرمیوں کا علم نہ ہو سکا تھا یقین مانو سویٹ ہارٹ میں تمہارا یہ احسان مر کر بھی نہیں اتار سکتا۔ نوفل کی آواز میں نمی سی اتر آئی اس کے لفظ سویٹ ہارٹ نے میلوں دور بیٹھی اس لڑکی کی دل کی دھڑکنوں کو درہم برہم کر دیا جو نوفل کی محبت میں غرق اپنا سب کچھ مٹانے کو تیار تھی یہ معمولی رقم اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ رکھتی تھی۔

تم کیا جانو نوفل احسان تو تم نے مجھ پر کیا ہے ایک تہی دامن لڑکی کو اپنی محبت کا اعتماد بخش کر اس نے دل میں یہ سوچا ضرور لیکن جب بولی تو الفاظ بدل چکے تھے۔

تمہیں میرا احسان اتارنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی احسان نہیں ہے بلکہ وہ محبت ہے جو میں تم سے اور حرم سے کرتی ہوں اچھا چلو خدا حافظ میری فلائیٹ کا ٹائم ہو گیا ہے واپس آ کر تم سے ملوں گی اپنا خیال رکھنا۔

مائک پر کریو کے ناموں کا اعلان کیا جا رہا تھا انہیں جہاز پر جانا تھا اس نے جلدی جلدی الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے فون بند کیا اور اپنا ہینڈ بیگ لے کر جہاز کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

وہ تیز بارش میں نہا رہی تھی سخت گرمی میں برستی بارش اسے بہت اچھی لگ رہی تھی اس کا

سارا جسم بارش سے بھیگ چکا تھا۔ ٹھنڈک کا احساس اس کے وجود میں سرائیت کر کے اسے لذت دے رہا تھا۔ یک دم بارش کا پانی گرم ہو گیا ،گرم پانی کی بوچھار اس کے چہرے اور جسم کو جھلسانے لگی ایسا محسوس ہوا جیسے بارش کی جگہ تیزاب اس کے جسم پر ڈالا جا رہا ہو وہ گھبرا اٹھی اس نے اندر کی سمت بھاگنا چاہا لیکن سامنے چھائے اندھیرے میں اسے راستہ ہی سجھائی نہ دیا خوف کے عالم میں اس کے حلق سے تیز چیخ برآمد ہوئی اس چیخ کے ساتھ ہی وہ اٹھ بیٹھی کمرے میں مکمل طور پر تاریکی چھائی ہوئی لیکن بارشوں کی تپش اسے ابھی بھی اپنے جسم پر محسوس ہو رہی تھی اس کا جسم جھلس رہا تھا وہ اپنی تنہائی کے احساس سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

آج اس کا نکاح تھا۔ جس میں شرجیل کی والدہ ، دونوں بڑی بہنیں ، ایک عدد ماموں اور چند دوسرے قریبی عزیز شامل تھے سب کو یہ بتایا گیا تھا شرجیل ایک لاوارث لڑکی سے نکاح کر رہا ہے تقریباً تمام ہی لوگوں نے شرجیل کے عمل کو دل کھول کر سراہا وہ بھی دل سے شرجیل کی نیکیوں کے معترف ہو چکی تھی۔ نکاح کے دو بولوں کے ساتھ ہی اس کے دل میں موجود شرجیل کی عزت میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا تھا شرجیل وعدے کے مطابق جمعہ کو نہ آیا تھا نہ ہی اس نے دوبارہ کوئی رابطہ کیا تھا ایسے میں جب تقریباً ایک ماہ بعد اس نے جو ہی کو فون کر کے اپنی تیاری کا بتایا تو مانو اس کے تن مردہ میں جان سی پڑ گئی۔ وہ جو مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھی پھر سے جی اٹھی۔ اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ پورے ایک ماہ سے کہاں غائب تھا اس کے لیے صرف اتنا ہی کافی تھا کہ اس کا نجات دھندہ آن پہنچا۔ اس کی امید ضائع نہ گئی خدا پر اس کا یقین پہلے سے کئی گناہ بڑھ گیا پھر شرجیل کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے گھر سے کچھ زیورات اور خاصی خطیر رقم لے آئی تھی جب کہ اسے امید تھی اس کی ماں کو بھی یاد نہ ہو گی۔

نکاح کے بعد مبارک سلامت کے شور میں یک دم اسے اس کا باپ یاد آ گیا کاش آج وہ زندہ ہوتا تو شاید حالات قدرے مختلف ہوتے مگر وہ زندہ کیسے ہوتا؟ جہاں اس کی ماں جیسی عورتیں ہوں وہاں کوئی غیرت مند کس طرح زندہ رہ سکتا ہے اسے اپنی چھوٹی بہن بھی شدت سے یاد آئی جو یقیناً ابھی بھی اس کے اچھے مستقبل کے لیے دعا گو ہو گی اب اس سے دوبارہ ملنا کب نصیب ہو، اس کی ماں اسے دوبارہ اپنے گھر نہ گھسنے دے گی یہ تو طے تھا حالات بہتر ہوئے ہی اپنی بہن سے ملنے کے لیے کوئی راستہ ضرور نکالے گی اس سوچ نے اسے ذہنی طور پر پرسکون کر دیا۔

☆......☆......☆

تم اس طرح غلام حسین سے ڈر ڈر کر کب تک زندگی گزارو گی اس طرح تو تم اپنے قیمتی وقت کو ضائع کر رہی ہو۔ یاد رکھو وقت ایک دفعہ گزر جائے تو دوبارہ واپس نہیں آتا اس سے جو کشید کر سکتی ہو کر لو اس میں ہی فائدہ ہے۔'' شاید نشا پچھلے پندرہ منٹ سے مسلسل اس کی برین واشنگ کر رہی تھی۔

اب دیکھو نا بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے تم اپنے قیمتی لباس گھر نہیں لے جاسکتیں گھر میں ایک اے سی نہیں لگا سکتیں رقم ہوتے ہوئے بھی ایک عدد فریج نہیں خرید سکتیں۔ تو کیا فائدہ تمہارے اس قدر محنت کرنے کا جب تم اپنا روپیہ کھل کر خرچ نہ کر سکو۔

نشاء کے نزدیک جو کام وہ کر رہی ہے وہ محنت کا کام تھا۔ پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔

بالآخر وہ تھکے تھکے لہجہ میں بولی۔

''نجات حاصل کرو کسی طرح اس غلام حسین نامی بلا سے جو تمہارے کسی کام کی نہیں ہے۔''

کیسے نجات حاصل کرلوں جو بھی ہے میرے بچوں کا باپ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے ایک تحفظ کا احساس رہتا ہے کہ کوئی میری ذات کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔''

اس کی دلیل خاصی کمزور تھی۔ جس کا احساس اسے خود بھی تھا یا تو تم بہت بے وقوف ہو یا بننے کی کوشش کر رہی ہو۔

نشا برا مانتے ہوئے بولی۔

بھلا بتاؤ جب تم غلام حسین سے نجات حاصل کرلو گی تو کیا تمہاری زندگی اس گندی کالونی کے دو کمروں میں ہی گزر جائے گی؟ بے وقوف عورت میرا گھر دیکھو کتنا لگژری ہے کیا یہ ساری لگژریات اور تحفظ کسی مرد کا عطا کردہ ہیں؟ بالکل نہیں یہ سب کچھ میں نے اپنے بل بوتے پر حاصل کیا ہے جو تم بھی کرسکتی ہو بس ذرا سی ہمت، حوصلہ اور عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو مگر۔

چلو جب تم اگر مگر میرے جیسے لفظوں سے نجات حاصل کرلو تو پھر مجھے بتانا میں تمہارے ساتھ مل کر نجات کا کوئی راستہ تلاش کرلوں گی۔ نشاء نے برا سا منہ بناتے ہوئے بات ختم کر دی۔

☆......☆......☆

یہ موبائل کس کا ہے؟

ویسے تو غلام حسین کبھی بھی اس کمرے میں نہ آیا تھا جہاں اس کی تینوں بیٹیاں سوتی تھیں مگر آج نجانے وہ کیا تلاش کر رہا تھا۔ جو لوہے کی پرانی الماری کھولتے ہی کپڑوں کے نیچے رکھا قیمتی موبائل اس کی نظر میں آ گیا۔ جسے اب وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

کون سا موبائل فون؟

اس کی بات سن کر فرحین گڑبڑا سی گئی جواب میں غلام حسین نے بنا کچھ کہے ہاتھ میں پکڑا موبائل اس کی نظروں کے سامنے کر دیا۔

''افوہ یہ موبائل یہ تو نشا کا ہے۔'' اسے بروقت ہی بہانہ سوجھ گیا۔ کل مجھ سے ملنے آئی تھی جاتے جاتے اپنا موبائل یہاں بھول گئی لاؤ دو مجھے شام میں جا کر دے آؤں گی۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا غلام حسین نے خاموشی سے موبائل اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''لاؤ کچھ پیسے دو گھر میں پکانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سبزی وغیرہ منگوانی ہے۔''

اُسے پتہ تھا غلام حسین کی جیب آج کل خالی ہی ہوتی ہے کیونکہ فی الحال اس کے پاس کوئی کام نہ تھا ایسے میں جان بوجھ کر وہ اسے ذہنی ٹارچر کرتی، ابھی بھی اس کی بات سن کر غلام حسین نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور مرے تڑے پچاس روپے برآمد کیے۔

''گھر میں دال تو تھی وہ ہی پکا لو۔''

اس کی طرف نوٹ بڑھاتے ہوئے وہ دھیمے سے بولا۔

''تم رکھو یہ پچاس روپے اپنے پاس کام آئیں گے۔ میں کچھ انتظام کرلیتی ہوں بظاہر ہمدردی کی مار اسے مارتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

خالہ کیا تمہارا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں

ہے......؟

وہ آج کئی دنوں بعد یاسیت کی کیفیت سے باہر نکلی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ وہ خالہ ثریا کے ساتھ باہر چھوٹے سے صحن میں تخت پر بیٹھی جبکہ اوپر والی زہرہ بھی لکڑی کی سیڑھی پر بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی اس بستی میں رہنے والے تمام افراد کا ایک ہی دکھ تھا سب جذام کے مریض تھے جنہیں آبادی سے دور اس بستی میں بسایا گیا تھا اس چھوت کی بیماری نے ان سب کی زندگی سے رونقیں چھین لی تھیں۔

سب ہیں بیٹا...... خالہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر اس کی جانب دیکھا بیٹا، بہو، بیٹی، داماد اور بھی جانے کون کون اب تو کوئی یاد ہی نہیں رہا اب تو میرا سب کچھ تم ہی لوگ ہو۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے اس بستی میں تھی۔ ان سالوں کی تعداد وہ بھول چکی تھی اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ آج کیا دن اور تاریخ ہے ویسے ہی اس کے نزدیک اب دنوں کی گنتی یاد رکھنا بے کار تھا ہر نیا سورج اسے یہ احساس ضرور دلاتا کہ ایک دن اس کی زندگی میں باقی ہے اور جانے کتنے دن ابھی بھی اس کی آزمائش کے تھے۔

جو اس نے پل پل مر مر کر جینے تھے وہ جب یہاں لائی گئی تھی خالہ ثریا برابر والے کمرے میں پہلے سے ہی موجود تھی جبکہ زہرا اس کے بعد آئی تھی تم بتاؤ تمہارے اپنوں کو بھی کبھی تمہاری یاد نہ آئی اس بھری جوانی میں تم کو جو یہاں چھوڑ کر گئے تو کبھی کسی نے آ کر پوچھا بھی نہ اس نے کبھی کسی سے اتنی بات نہ کی تھی آج جو کی تو خالہ ثریا بھی اپنے دل کی بات زبان پر لے آئی۔

نہیں خالہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے میں لاوارث ہوں۔ اس کی آواز رندھ گئی۔

کوئی بات نہیں بیٹا ادھر دیکھو میری طرف جب تک یہاں ہو مجھے اپنی ماں ہی سمجھنا۔ اس نے شفقت سے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سوری خالہ دوبارہ زندگی میں کبھی خود کو میری ماں مت کہنا شدید نفرت ہے مجھے اس رشتہ سے گھناؤنا ترین رشتہ اس نے نفرت سے زمین پر تھوک پھینکا اور اندر کمرے میں چلی گئی خالہ اس کے اس طرح بدکنے پر کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔

☆......☆......☆

نوفل تم نے میرے کام کا کیا کیا؟

وہ دو دن سے کراچی میں تھی آج نوفل اسے لے کر بیچ پر آیا تھا۔

جہاں ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اسے کچھ یاد آ گیا تمہارا کون سا کام......

نوفل جانے کس سوچ میں گم تھا۔ اس کے پکارنے پر چونک گیا افوہ میں تو سمجھی تم نے اب تک ضرور کچھ معلوم کر لیا ہوگا مگر تم تو شاید بھول ہی گئے تھے چلو کوئی بات نہیں میں خود پتہ کرتی ہوں۔

نوفل کی غائب دماغی نے اسے کچھ مایوس سا کر دیا۔

نہیں یار بھولا نہیں تھا اصل میں اس وقت میرا دھیان حرم کی طرف تھا جانتی ہو دو دن سے اس کا بخار کم نہیں ہو رہا انشاء اللہ ہو جائے گا وہ پریشانی سے بولا۔ میری ڈاکٹر شہلا سے بات ہوئی ہے انہوں نے کہا ہے کہ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے ویسے بھی اب ماشاء اللہ وہ پہلے سے کافی بہتر ہو گئی ہے اب مجھے بتاؤ اگر تم نے کچھ بھی کوشش کی ہے تو...... وہ جلد از جلد اپنے کام کے بارے میں جاننا چاہتی تھی اسی لیے تسلی دیتے ہوئے پھر سے اپنے مدعا پر آ گئی۔

ہاں یار میرے ایک دوست کا بہنوئی ایس پی

ہے میں نے اسے تصویر دی ہے دیکھو جیسے ہی کچھ پتہ چلے میں ضرور آگے کوشش کروں گا۔

''اللہ کرے جلد ہی کچھ پتہ چل سکے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

پھر نوفل سے کچھ کہے بنا ہی آگے کی جانب بڑھ گئی نوفل کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر خود بھی اس کی تقلید میں آگے چل دیا۔

☆......☆......☆

اسے یہ چہرہ جانا پہچانا سا لگا مگر بار بار سوچنے پر بھی یاد نہ آیا وہ کون تھی ......؟ شہر کے پوش ایریا کے بیش و قیمت اپارٹمنٹ تھے جہاں وہ کسی صاحب کے گھر ٹائلز کا کام کرنے آیا تھا ٹھیکدار اندر ریسیپشن پر کوئی بات کر رہا تھا جبکہ وہ اور اس کا ساتھی نورالدین باہر ہی بیٹھے تھے جب وہ گاڑی اس کے پاس سے گزری سیکیورٹی گارڈ نے جلدی آگے بڑھ کر بیسمنٹ کو جانے والی پارکنگ کی رکاوٹ کو ہٹا دیا۔

گاڑی تیزی سے اندر داخل ہوگئی مگر اس کی فرنٹ سیٹ پر موجود عورت کے چہرہ کی ہلکی سی جھلک نے ہی اسے الجھا دیا پھر جب تک وہ وہاں کام کرتا رہا اس کا ذہن بھٹک کر اسی سمت جاتا رہا، یک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اسے یاد آ گیا کہ اس نے گاڑی میں موجود عورت کو کہاں دیکھا تھا وہ عورت اس کی بیوی سے بہت مشابہہ تھی وہ عورت بالکل فرحین جیسی تھی مگر ظاہر ہے فرحین نہیں ہو سکتی تھی فرحین کا اتنی بڑی بڑی گاڑی میں کسی غیر مرد کے ساتھ کام کیا اس کی الجھن کافی حد تک دور ہوگئی تھی اور وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

☆......☆......☆

تم آج بھی آفس نہیں گئے؟

جوہی کی آنکھ کھلتے ہی پہلی نظر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے شرجیل پر پڑی جو سگریٹ ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسائے جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

نہیں ...... مختصر سا جواب دے کر اس نے سگریٹ کا کش لگایا۔ جوہی سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی جانب دیکھنے لگی جو دوپہر کے بارہ بجا رہی تھی۔

جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی بڑے سکون کی نیند سوئی تھی۔ اس کو حیرت ہوتی تھی اپنے پر آسائش گھر میں اے سی کی کولنگ میں اسے وہ سکون نصیب نہ تھا جو پچھلے پندرہ دنوں سے اسے یہاں حاصل تھا آفس سے چھٹیاں لی ہیں کیا تم نے؟

ان پندرہ دنوں میں وہ جان چکی تھی شرجیل کے گھر کے حالات اس کی ظاہری شخصیت سے کافی مختلف تھے اس کا گھر غربت کا منہ بولتا نمونہ تھا جہاں کے در و دیوار سے کسمپرسی برس رہی تھی ۔اس کی چھوٹی بہن سارا دن سلائی مشین چلاتی رہتی بڑی آپا اسکول سے آکر بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی اماں ویسے ہی بیمار تھیں۔ ایسے میں شرجیل کی گھر میں موجودگی اسے الجھن میں ڈال رہی تھی شروع کے ایک ہفتہ اس کا خیال تھا کہ شرجیل نے آفس سے چھٹیاں لی ہیں مگر جیسے جیسے دن گزر رہے تھے شرجیل کی گھر میں موجودگی اسے پریشان کر رہی تھی یہ ہی وجہ تھی جو شرجیل کے مختصر ترین جواب کے باوجود اس نے اپنا اگلا سوال بھی کر ڈالا۔

نہیں میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔

اس نے سگریٹ کی راکھ قریب رکھی ایش ٹرے میں جھاڑی اور مڑ کر جوہی کی جانب دیکھا۔

(اس دلچسپ ناولٹ کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

دوسری طرف تایا کی آمد ننھے افضال کے لیے کسی لاٹری سے کم نہ تھی کیونکہ تایا صرف بھائی کا نہیں بلکہ اس کے کنبے کا بھی خیال کر رہا تھا۔ گھر کی غربت اور افلاس سے متاثر ہو کر اس نے کسی سے بنا کچھ پوچھے بھاوج اور بھتیجے کی ضروریات کو بھی مدنظر رکھا اور......

سات سالہ افضال کا من بھاتا کھاجا کھیر تھی ماں کے ہاتھ سے پکی خوشبودار ٹھنڈی کھیر...... مٹی کی پیالی میں جمی گاڑھے دودھ کی سی رنگت والی، قلفی کے سواد جیسی کھیر...... جب افضال کے

سامنے آتی تو طبیعت للچا کر رہ جاتی اور وہ بے صبر، ندیدے بچے کی طرح پیالی پر اس طرح ٹوٹ پڑتا جیسے کھیر نہ ہو موسیٰ کا من وسلویٰ ہو۔

پھر زبان سے چاٹ کر وہ پیالی کو تب تک صاف کرتا جب تک کوری مٹی کی پیالی سے کچھ ذرات اپنے آپ اکھڑ کر اس کے منہ میں نہ آجاتے۔

پیالی کو دھلے برتن کی طرح صاف کرتے ہی وہ اسے ماں کے ہاتھ میں تھما دیتا تو وہ اس کی ہوس اور اشتہا پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور دوسری پیالی اس کے خالی ہاتھ میں بھر دیتی۔ تب افضال کا چہرہ آسمان پر دمکتے روشن چاند کی ضیاء سا منور ہو جاتا۔ وہ ماں کو شکر گزاری سے دیکھتا اور پھر اسی عمل پر اتر آتا جو اس نے پہلے کھیر کی پیالی سے روا رکھا ہوتا۔ اس کی پسند اس کی چاہت بھی تھی۔

افضال گو کہ چھوٹا سا تھا پھر بھی جانتا تھا کہ کھیر جیسی من پسند نعمت اسے پورے سال میں دو سے تین بار کھانے کو مل سکتی تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ جب غریب باپ کا دھندا کچھ بہتر چلا جاتا۔ وہ ایک لاچار اور لاغر سے خوانچہ فروش کا بیٹا تھا جو اپنی ریڑھی پر سستے بسکٹ، ٹچ اور ٹافیاں، غبارے بیچ کر گزارہ کیا کرتا تھا۔ گلی گلی گھوم کر آوازیں لگاتے اس کا دم پھول جاتا اور شام ڈھلے کچھ روپے ریزگاری کی صورت جیب میں ڈالے وہ تھکا ہارا گھر لوٹ آتا تھا۔ وہ چند روپے چند منٹوں میں ضروریاتِ زندگی کی مد میں خرچ ہو جاتے اور اگلے دن وہی خالی ہاتھ اور خالی پیٹ ہوتا تھا۔ جسے بھرنے کے لیے افضال کے باپ کو محنت کی چکی میں نئے سرے سے پسنا پڑتا تھا۔

اس بار عید بھی یونہی آ کر گزر گئی تھی۔ عید کے خوشیوں بھرے دن بھی افضال کو کھیر نصیب نہ ہوئی تھی۔ وجہ بگڑے حالات اور بیمار باپ کی دوا دارو تھی۔ ابا کئی دن سے اپنا خوانچہ لے جا نہ سکا تھا۔ اسے ٹھنڈ کی کھانسی لگ گئی تھی۔ وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو جاتا، چہرہ سرخ اور سانس اکھڑنے لگتی، تب ماں روتے ہوئے اس کی پیٹھ سہلایا کرتی تھی۔ اب گھر گرہستی کا سارا بوجھ ماں کے سر پر آ پڑا تھا۔ بے چاری آس پڑوس سے دور کہیں آگے بنگلوں میں جا کر دو چار گھروں میں جھاڑو برتن کا کام کر کے کچھ روپے کما لاتی اور وہی روپے گھر کی ہانڈی اور ابا کی دوا پر خرچ ہوتے رہتے تھے۔

عید کے روز بھی اماں کئی گھروں کا جھوٹا اور بچا کچا کھانا اٹھا لائی تھی۔ وہ کھانا اچھا تو تھا لیکن ماں کی پکائی کھیر کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی طرح چاند رات کو کھیر کا ڑھتی اور اپنے ہاتھوں سے مٹی کی کوری پیالوں میں بھر کر ٹھنڈی کیا کرتی تھی۔

عید کے دن اس نے بنگلوں کے خانساماں کی پکائی سویاں اور خرمہ کھایا ضرور تھا لیکن کھیر کھانے کی حسرت پھر بھی من میں طوفان اٹھائے ہوئے تھی۔ بس اسی دن سے افضال نے ماں کا پیچھا پکڑ لیا تھا اور کھیر پکانے کی رٹ لگالی تھی۔ گھر کے دگرگوں حالات اور باپ کی بیماری بھی اسے یاد نہ رہی تھی۔ یاد تھی تو بس قلفی سی کھیر جو کھانے کو مل جاتی تو تسلی ہو جاتی۔

ماں اس کی فرمائش پر دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ جانتی تھی افضال کی فرمائش پوری کرنا آسان نہیں تھا۔ دودھ، چاول چینی اور بادامی گریاں، کشمش ہوتی تو کھیر پکتی۔ اب اتنی ساری چیزوں کے لیے بہت سے روپے بھی درکار تھے۔ وہ حساب کرنے بیٹھی تو کھیر بنانے کے لیے اسی نوے روپے کی

حاجت پڑتی اور وہ نوے روپے اس کی بساط سے باہر کی بات تھے۔ وہ صاحبِ فراش شوہر کی تیمارداری اور دوا دارو کے ساتھ اس طرح کی کسی عیاشی کو افضال کے لیے چن نہ سکتی تھی۔

سو مجبور ہو کر وہ مسلسل افضال کی فرمائش کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑائے دے رہی تھی۔ ماں جتنا لاپرواہی کا مظاہرہ کرتی افضال کا دل کھیر کی چاہ میں اتنا ہی ہُڑکنے لگتا۔ کھیر کی طلب نے ماں کے سامنے اسے کسی فقیر کی طرح ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن ماں تھی کہ اس کی درخواست پر کان دھرنے کو تیار ہی نہ تھی۔

انہی تھکے ہارے دنوں میں افضال کا تایا چھوٹے بھائی سے ملنے اور حال چال پوچھنے چلا آیا تھا۔ وہ دوسرے شہر سے آیا تھا اپنے حلیے اور رکھ رکھاؤ میں خاصا آسودہ حال اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ بھائی کی ابتر حالت اور اجڑے حالات دیکھ کر اس نے فوری طور پر اسے سرکاری دوا خانے سے نکال کر پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا اور اپنے خرچ پر ڈاکٹر کے بتائے نسخے کے مطابق ابو کو بازار سے اچھی دوا خرید کر دی۔ کھانے کے لیے پھل گوشت اور دودھ بھی وافر مقدار میں مہیا کر دیا۔ بھائی کا وہ احسان افضال کے باپ کو جیسے نئی زندگی عطا کر گیا، وہ مرگھلا وجود جیسے توانائی حاصل کرنے لگا تھا۔

دوسری طرف تایا کی آمد ننھے افضال کے لیے کسی لاٹری سے کم نہ تھی کیونکہ تایا صرف بھائی کا نہیں بلکہ اس کے کنبے کا بھی خیال کر رہا تھا۔ گھر کی غربت اور افلاس سے متاثر ہو کر اس نے کسی سے بنا کچھ پوچھے بھاوج اور بھتیجے کی ضروریات کو بھی مدنظر رکھا اور سبزی، آٹا، چاول گھی غرض بہت سی نعمتیں لا کر ان کے باورچی خانے میں ڈھیر کر دی تھیں۔ اب افضال کے لیے دن عید اور رات شب برأت بن گئی تھی۔ ماں اب ہر روز اچھا کھانا پکاتی، باپ اور تایا کو کھلانے کے بعد افضال کو اپنے ہاتھ سے کھلاتی اور خود بھی پیٹ بھر کر کھاتی اور تایا کو جھولی پھیلا کے دعا دیا کرتی تھی۔ اس شخص کی اچانک آمد نے جیسے ان کے گھر کے سارے دلدر ہی دور کر دیے تھے، یوں کہ بس زندگی آسان ہو گئی تھی اور فاقے کی نیند کا عذاب ختم ہو گیا تھا۔

اس دن بھی جب وہ دونوں ماں بیٹا...... باپ اور تایا کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھانے کو بیٹھے تو افضال چپکے سے بولا۔

''اماں! یہ تایا بڑا اچھا بندہ ہے۔ کتنا خیال ہے اس کو ہمارا...... کیا یہ سدا ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتا؟'' اماں اس کے سوال پر بے ساختہ مسکرائی تھی۔

''پتر! تایا اس گھر میں مہمان بن کے آیا ہے وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر سدا اس گھر میں بھائی کا منجا پکڑ کے تھوڑا ہی بیٹھے گا۔ اتنی دور سے بس وہ تیرے باپ کی خبر لینے آیا ہے۔ تیرا ابا بستر سے اٹھ جائے تو وہ بھی اطمینان سے اپنے گھر کی راہ لے گا۔''

''اچھا......!'' افضال نے بے قراری سے ماں کی صورت دیکھی۔

''کیا سچ مچ تایا اپنے گھر لوٹ جائے گا؟''

''ہاں......! کیونکہ اپنا گھر بار اور کام دھندا چھوڑ کے کوئی کب تک کسی دوسری جگہ پر ٹک کے رہ سکتا ہے۔''

''چل وہ تو ٹھیک ہے اماں پر ابا ابھی پورا ٹھیک کہاں ہوا ہے...... تایا کو ابا کے لیے کچھ تو سوچنا چاہیے نا؟''

"ارے وہ سوچ نہیں رہا، کر رہا ہے اپنے بھائی کے لیے، فکر نہ کر تیرا ابا جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اور اگر ابا ٹھیک نہ ہوا تو؟" افضال نے دل میں آتے سوال کو دبانے کی کوشش نہیں کی تھی، ماں تڑپ اٹھی۔

"آئے ہائے، پاگل ہو گیا ہے افضال، بھلا وہ ٹھیک کیوں نہ ہوگا۔ تیرے تایا نے اسے سب سے اچھے اور مہنگے ڈاکٹر کو دکھایا ہے، اتنی مہنگی دوائیاں لا کر دی ہیں پھر اوپر سے اچھی خوراک بھی فراہم کی ہے، تو اچھا کیسے نہ ہوگا تیرا باپ؟"

"نہیں اماں! میری دعا ہے ابا کبھی اچھا نہ ہو۔ وہ اچھا ہو گیا تو تایا اپنے گھر لوٹ جائے گا اور ہم سب پھر بے آسرا ہو جائیں گے۔ کھانے کو سوکھی روٹی اور پانی کے سوا کیا ملے گا؟" وہ اُداس تھا لیکن ماں نے بلبلا کر ایک دھموکا اس کی کمر پر جڑ دیا۔

"توبہ توبہ، یہ کیا بات کی تو نے...... بڑا ناشکرا ہے افضال، باپ کی صحت کی دعا کرنے کی بجائے تو اسے سدا بیمار دیکھنا چاہتا ہے...... ارے کیسا بیٹا ہے تو، تیرے باپ نے کبھی تجھے بھوکا سونے دیا ہے جو تجھے ایسی باتیں سوجھنے لگیں؟"

"یوں مار نہ اماں......" افضال نے سنجیدگی سے کسی بردبار مرد کی طرح ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بے شک ابا نے کبھی بھوکا سونے نہیں دیا لیکن پیٹ بھر کے ایسے لذیذ کھانے بھی نہیں کھلائے۔ اب دیکھ لو، ابا کے خوانچے والے پیسوں سے ہم کھیر تک نہیں پکا سکتے جبکہ تایا چاہے تو ہم یہ کام بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے افضال پر یہ ساری نصیب کی بات ہے۔ گھر آنے والا اپنا نصیب بھی ساتھ لاتا ہے بیٹا تیرا تایا جب سے ہمارے گھر آیا ہے۔ تو نے دیکھا کیسے ہم سب کے دن پھر گئے ہیں، نصیب جاگ اٹھے ہیں۔ یہ سب مہمان کی برکت ہوتی ہے افضال کیونکہ مہمان اللہ کی رحمت ہے اس کے آنے سے چہار سو رحمتیں برستی ہیں۔ بس تو دعا دے اپنے تایا کو جس نے اللہ کے فضل سے ہم سب کا پیٹ بھرا اور خود بھی آسودہ حال رہا ہے۔"

"ہاں اماں...... پیٹ ضرور بھرا ہے پر نیت ابھی بھی نہیں بھری۔ اللہ کے واسطے تایا کو کہہ کر دودھ چینی منگوا لینا، اگر ایک وقت کھیر بھی بنا لو گی تو کیا برا ہو جائے گا۔ میری تمنا پوری ہو جائے گی اور تیرے ہاتھ کی کھیر تایا بھی چکھ لے گا، دیکھ لینا وہ بھی بہت خوش ہوگا کھیر کھا کر......" افضال نے دل کی حسرت کو جیسے تایا کی صورت برسنے والی رحمت سے دھونے کی کوشش کی تھی۔ اماں روٹی بھول کر اس کی صورت تکنے لگی۔ وہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ ماں کی خموشی پر افضال مسکرایا پھر شوخی سے بولا۔

"شاید تو تایا سے کہتے ڈرتی ہے اماں، چل رہنے دے میں آپ کہہ دوں گا مجھے معلوم ہے وہ مجھے منع نہیں کرے گا۔"

"پر یہ بری بات ہوگی افضال، تیرے تایا کا احسان بہت بڑا ہے بیٹا، اس نے تیرے باپ کی آڑے وقت میں مدد کی ہے، اسے کھیر کی فرمائش کر کے تنگ نہ کرنا...... وہ برا نہ مان جائے کہیں۔"

"ارے برا ماننے والی کیا ہے اماں، وہ کوئی غیر تھوڑا ہی ہے، تایا ہے میرا...... جہاں ہم پر اس نے اتنے روپے خرچ کیے ہیں تھوڑے اور کر دے گا تو کنگال نہیں ہو جائے گا، میں کہہ دوں گا آج تایا کو ہمیں دودھ، چینی اور بادام کی گریاں

لا دے، ہم کھیر پکائیں گے۔ دیکھ لینا اماں وہ منع نہیں کرے گا۔'' اس کا انداز پرجوش تھا لیکن ماں چپکی بیٹھی تھی۔ افضال ماں کی خموشی بھول کر جھٹ پٹ کھانا کھانے میں جت گیا تھا۔

☆......☆......☆

اماں کو جانے کیا ہوا تھا اسے تے ہو رہی تھی۔ وہ بار بار دیوار کے پار جاتی، ابکائیاں لیتی اور ایک لمبی سی تے کر کے پلٹ آتی تھی۔ بستر پر لیٹ کر بھی اُسے چکر آ رہے تھے۔ افضال اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر بے حد پریشان اور روہنسا ہو رہا تھا کہ گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ابا نے بستر چھوڑا تھا تو ماں ہاتھ چھوڑ کے بیٹھ گئی تھی۔ صبح سے نڈھال تھی لیکن اب سدھ بدھ بھی کھو رہی تھی۔ تایا ابا کو ساتھ لے کر کسی سے ملاقات کو گیا ہوا تھا، ان کی واپسی جانے کب ہو یہی سوچ کر وہ پڑوس کی نگینہ کی ماں کو بلا لایا اب وہی ماں کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی اور ماں کی ابتر حالت دیکھ کر بھی ہنس ہنس کے جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ ماں کا زرد نقاہت بھرا چہرہ بھی کھلتے پھول کی صورت مہکنے لگا تھا۔ افضال کچھ چونکنا سا ہو گیا، تجسس نے دل کو گھیرا تو ماں کی چارپائی کے نزدیک آ کھڑا ہوا اور قدرے نروٹھے پن سے بولا۔

''خالہ ماں کی طبیعت خراب ہے اور تم ہنسی ٹھٹھول میں پڑی ہو، تمہیں اماں پر ترس نہیں آتا......؟''

''ترس کیسا......؟ یہ تو خوشی کی گھڑی ہے افضال، خیر سے تیرے گھر میں ننھا مہمان آنے والا ہے۔''

''ننھا مہمان......؟'' نگینہ کی ماں کی بات پر وہ چونک کر ماں کو دیکھنے لگا اِدھر ماں نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں، افضال جانے کیوں خجل

سے ہو گیا۔

''کیا مطلب خالہ......؟''

''مطلب یہ کہ ماں کا خیال رکھا کر...... وہ دوسری بار ماں بننے جا رہی ہے۔'' نگینہ کی ماں ہنس پڑی۔

''ماں......؟'' افضال کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

''پر وہ میری ماں ہے خالہ پھر دوسری بار کیسے؟''

''ہاں تو کیا ہوا؟'' خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیا تیرے علاوہ وہ کسی اور کی ماں نہیں بن سکتی، ارے بھولے شاہ، اللہ تجھے بہت جلد ایک بھائی یا بہن دے گا۔ کھلونا سا، خوش ہو جائے گا تو......''

''اچھا......'' افضال کے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھے۔

''کب آئے گا میرا بھائی......؟''

''یہ لو......'' خالہ زور سے ہنس پڑی۔

''ہے نا آخر مرد کا بچہ، بھائی ہی کی خواہش ہے اُس کی بھی، لڑکے کی آس رکھ رہا ہے افضال کی ماں، لڑکی کو بھول گیا ہے شاید بتا اسے بہن بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

''بہن کون......؟'' افضال کے ماتھے پر بل ابھر آئے اسے خالہ زہر لگی تھی۔

''ارے تیری بہن......'' وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

''آنے والا مہمان تیری بہن بھی ہو سکتی ہے۔''

''چلو بہن ہی سہی، پر وہ آئے گی کب؟'' اس کی عجلت قابل دید تھی۔ خالہ نے اسے اپنے

قریب کرلیا۔

"جلد آجائے گی افضال' ابھی تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا تجھے......"

"کتنا انتظار......؟" وہ اتاوَلا ہوا کھڑا تھا۔

"کیا کل تک خالہ......؟"

"ارے......" نگینہ کی ماں قہقہہ مار کر ہنسی۔

"ارے نہیں افضال' کل نہیں ابھی بہت دن باقی ہیں۔"

"اوہ......" افضال نے مایوسی سے پھر ماں کو دیکھا تھا، اس کی صورت پر بے چینی دیکھ کر ماں نے ہاتھ بڑھا کر اسے گود میں گھسیٹ لیا اور ماتھا چوم کر دلار سے بولی۔

"تو میرا راجا بیٹا ہے افضال' اللہ سے دعا کر وہ تجھے بہن ہی دے، مجھے بھی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں، پتا ہے رحمت ہوتی ہیں وہ گھر کی، بے حد سگھڑ، محبت کرتی ہیں تو جان دے دیتی ہیں ماں باپ کے لیے، ان کے دم سے گھر میں رحمتوں کا اجیارہ رہتا ہے، بہن رحمت ہے بیٹا۔"

"اچھا...... اگر وہ رحمت ہے تو کیا مہمان بھی ہے اماں......؟"

"مہمان......؟" افضال کے سوال سے اماں نے اُلجھ کر اس کے لفظ دہرائے۔

"ہاں اماں، تم کہہ رہی ہو نا وہ بھی رحمت ہے، جیسے تایا رحمت ہے ہمارے گھر میں...... وہ جب سے مہمان بن کے ہمارے گھر آیا ہے کیسے چاروں طرف رحمت برس رہی ہے۔" افضال نے عجلت سے وضاحت کی تو ماں نے نہال ہو کر اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

"ہاں میرے چاند، لڑکی بھی مہمان ہی ہوتی ہے، پرایا دھن بن کر آتی ہے بابل کے گھر میں...... اسی لیے رحمت بن کر جیتی ہے اور جب تک رہتی ہے والدین کو اپنی محبت اور خدمت کا سکھ دینے کی کوشش کرتی ہے اور جب بابل کے آنگن سے رخصت ہوتی ہے تو اپنے سسرال والوں کا من موہ لیتی ہے، خدمت اور سگھڑاپے سے۔"

"ارے واہ بھئی...... پھر مجھے صرف بہن چاہیے اماں۔" افضال فوراً ہی راضی ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر دعا کر......" اماں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا تھا۔

☆......☆......☆

افضال کو بے چینی لگی تھی وہ اطراف میں گھوم پھر کر تیسری بار ماں کے پاس آیا تھا وہ اب باورچی خانے میں سِل پر مصالحہ پیسنے کی مشقت کر رہی تھی۔ افضال نے اندر آتے ہی اس کے کام کرتے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"اماں تایا کل اپنے گھر جا رہا ہے کیا؟"

"ہاں......" ماں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر مصروف انداز میں بولی۔

"تایا جا رہا ہے بیٹا، اتنے دنوں سے اِدھر آیا بیٹھا ہے تو گھر بھی اب جائے گا نا۔ اس کا بھی گھر ہے بیوی بچے ہیں۔"

"آئے ہائے نہیں اماں...... اُسے کچھ دن کے لیے اور روک لو نا۔" وہ حد درجہ مضطرب تھا۔

"بھلا کیسے روکوں گی افضال وہ مہمان ہے اور مہمان کو لوٹ کے ایک دن جانا ہوتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن کچھ اور اماں...... تم نے ابھی کھیر تو پکائی ہی نہیں...... کھیر کے بنا تایا کیسے جا سکتا ہے۔"

"وہ بھی پکا لوں گی بیٹا...... تجھے کاہے کو فکر ہے، کھیر بھی پک جائے گی کسی دن......"

"ارے فکر تو رہے گی اماں، بغیر پیسوں کے

کھیر نہیں پکتی، تمہیں کھیر کے لیے بہت سارے روپے چاہییں۔"

"تو کیا ہوا...... ہیں میرے پاس تھوڑے پیسے، آج ہی تیرے تایا نے پانچ سو روپے کا ہرا نوٹ دیا ہے کہہ رہا تھا میں اس کے بعد تیرا اور تیرے باپ کا خیال رکھوں......اسے تیرے ابا کی بہت فکر ہے اسی لیے رقم دی ہے۔"

"اوہ اچھا......" افضال خوش ہو گیا۔

"پھر ٹھیک ہے اماں' تایا جاتا ہے تو جانے دے، اب ہم اسے کیوں روکیں گے۔"

"توبہ توبہ، کتنا مطلبی ہے تو......" اماں بے ساختہ ہنس پڑی اِدھر افضال جھینپ کر باہر نکل گیا تھا دو ہفتے کے مختصر قیام میں تایا نے ان سب کو بے پناہ سکھ دیا تھا، انہیں اچھا کھلایا تھا، بہترین کپڑے دلائے اور افضال کو بھی پرانی بوسیدہ بدرنگی شلوار قمیض سے نجات دلا کر ایک قیمتی سوٹ خرید کر دیا تھا۔

ساتھ چمڑے کا خاکی کھسہ بھی تھا، جانے سے پہلے تایا نے اس سے وہی کپڑے اور جوتا پہننے کی فرمائش کی تھی، افضال تیار ہو کر آیا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے بازار لے گیا اور بہت سے فروٹ' ٹافیاں اور چھوٹے موٹے کھلونے دلوائے، لکڑی کا بلا اور گیند بھی لے کر دی اور ساتھ ہی اس کے نئے سوٹ کی جیب میں پچاس کا نوٹ بھی ڈال دیا یہ کہہ کر وہ صرف افضال کے لیے ہے۔

افضال پھولے نہ سمایا، مانو ہفتِ اقلیم مل گئی ہو، پچاس کا نوٹ گویا قارون کا خزانہ بن گیا تھا۔ جس نے افضال کی چھاتی از خود چوڑی کر دی تھی۔ پیسے کا نشہ کیا ہوتا ہے، آٹھ سال کے افضال کو بھی اس دن خوب پتا چلا تھا، پچاس روپے جیب میں آتے ہی وہ پچاس سپنے لمحوں میں دیکھ گیا تھا اور ہر سپنا ان روپوں کو مثبت انداز میں خرچ کرنے سے متعلق تھا۔ اُسے بہن کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ تایا کے دیے پچاس روپے اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد خرچ کیے تھے وہ ان پیسوں سے اپنی ننھی بہن کے لیے ایک گھنگھرو والا جھنجھنا خرید لایا تھا، جسے ماں نے یہ کہہ کر صندوقچے میں رکھ دیا تھا کہ جب بہن اس سے کھیلے گی تو افضال کو اچھا لگے گا۔ یہ کھلونا افضال کی طرف سے بہن کو پہلا تحفہ تھا۔

اِدھر تایا کیا گیا گھر کی ساری رونق ہی چلی گئی تھی۔ ابا نے تایا کے جاتے ہی اپنا خوانچہ پھر سنبھال لیا تھا۔ ماں کے وہی پرانے دھندے اور پرائے گھروں کا جھاڑو پوچا تھا۔ وہ سارا دن مختلف کاموں میں اُلجھتی رہتی تھی۔

افضال نے اسے کئی بار چھوٹے چھوٹے فراک سیتے بھی دیکھا تھا۔ ننھے ننھے خوبصورت رنگ برنگے فراک......جنہیں دیکھ کر افضال بہن کو تصور کی نگاہ میں وہ سب پہنے دیکھا کرتا تھا۔ یہ ساری تیاری اس بہن کے لیے تھی جو عنقریب اس کے گھر رحمت بن کر آنے والی تھی۔ افضال یہ خوبی جانتا تھا کہ اس کا ابا یاں کی خواہش سے متفق نہ تھا۔ اسے بیٹے کی چاہ تھی ابھی گزری شام ہی اس نے والدین کو اسی ایک موضوع پر اُلجھتا پایا تھا، ابا بےزاری سے کہہ رہا تھا۔

"تو نے یہ کیا لڑکی لڑکی لگا رکھی ہے پاگل عورت...... مجھے نہیں چاہیے لڑکی جسے پال پوس کے آگے کرنا پڑے اور ساتھ ہزاروں کا مال بھی سامان کی صورت لاد کر دینا پڑے اور صرف یہی نہیں، ساری عمر اس کے دکھ سکھ پر جلتے کڑھتے زندگی گزارو کہ وہ اپنے گھر خوش تو ہم بھی خوش...... وہ دکھ جھیلے تو ہماری جان بھی عذاب

ارے تجھے ضرورت کیا پڑی ہے بیٹی کی آس رکھنے کی، احمق عورت رب سے ایک اور بیٹا مانگ جو بڑھاپے کا سہارا بنے، کما کر بلکہ بٹھا کر کھلائے بیٹا ہوگا تو زندگی کے آخرم ایام اس گھر میں چین و آرام سے گزریں گے، رانی بن کر جیئے گی تو بھی......"

"اونہہ...... مجھے نہ چاہیے چین و آرام...... مجھے بس بیٹی چاہیے، ماں کا ساتھ نبھانے والی اس کا دکھ سکھ بانٹنے والی، تو کیا جانے افضال کے ابا، بیٹی ایک ماں کے لیے کتنا بڑا سہارا ہوتی ہے۔ اس کے لیے سب کچھ کرتی ہے گھر داری سے لے کر کوٹھری کی صفائی تک، آرام و آسائش سب کا خیال رکھتی ہے بیٹی ناز و نعم کے ساتھ پر ہوتی تو پرائی امانت ہی ہے نا...... پھر اسے مانگنے کا فائدہ؟

فائدہ بہت ہے افضال کے ابا...... پرائی ہو کر بھی والدین پر قربان رہتی ہے اپنے گھر سے آ کر انہیں دیکھتی بھالتی ہے، دعا دیتی ہے کہ اس کا میکہ سدا سلامت رہے۔ تجھے پتا ہے نا اللہ نے بیٹی کو رحمت کہا ہے۔

"اری جا...... مجھے ایسا کچھ نہیں پتا...... پتا ہے تو بس اتنا تو جھلی ہو گئی ہے افضال کی ماں، تجھ سے بحث کر کے مجھے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ پر دیکھ میری ایک بات یاد رکھنا۔ بیٹا ہوا تو میرا ہوگا اور بیٹی ہوئی تو تیری ہوگی۔ مجھ سے کوئی آس امید مت رکھنا۔ اس کی پرورش میں ایک دھیلہ خرچ نہ کروں گا۔ سمجھ لے اچھی طرح......

ارے توبہ کر توبہ...... بیٹی جیسی رحمت سے منہ موڑنے والا کیا کبھی خوش رہا ہے؟ اور سن، بھلا تو کیا پالے پوسے گا میری بیٹی کو۔ پالنے اور کھلانے والا بادشاہ وہ اوپر بیٹھا ہے، وہ روح بعد میں بھیجتا ہے، اس کا رزق پہلے اتار دیتا ہے، تم بھی دیکھنا افضال کے ابا کیسی قسمت والی ہوگی میری بچی۔ تیرے دن بھی پھیر دے گی۔ ایسی رحمت برسے گی اس گھر میں کہ چاندی ہو جائے گا چار پھیرے...... اماں کی محبت لہجے میں بول رہی تھی۔

"اونہہ...... ایسے چاندی کا کیا فائدہ ہوگی تو وہ پرایا دھن...... چار دن کی چاندنی کے بعد اندھیری رات بن کر رہ جائے گی اس گھر کے لیے...... اس کا چانن دوسرے سمیٹ کر لے جائیں گے۔ افضال کے باپ نے طنز کے تیر چھوڑے۔

"تو کیا ہوا......" بے چاری عورت اپنا سا منہ لے کر بولی تھی۔ جب دنیا کا دستور یہی ہے افضال کے ابا تو ہم کیا کر سکتے ہیں میں نے بھی تو اماں باوا کا انگنا چھوڑ کر تیرا آنگن دیکھا ہے۔ لڑکی ذات ہے ہی مہمان کے جیسی بابل کے گھر اسے کہاں روک کے رکھا جا سکتا ہے۔ جب پیروں پیغمبروں نے نہ رکھی تو کون روک سکا ہے ان کو۔

"ارے ہاں میں بھی یہی کہہ رہا ہوں نا...... اب بتا ایسی رحمت کا کیا فائدہ جو دوسروں کے لیے ہو۔"

آئے ہائے چپ کر جا افضال کے ابا، خوامخواہ دماغ نہ کھا، تجھ جیسے ناشکرے کو کچھ پلے پڑنے والا نہیں ہے۔ تیرے سامنے بولنے سے بھینس کے آگے بین بجانا بہتر ہوگا۔ وہ جیسے زچ ہو گئی تھی اس نے دھاڑ سے دروازہ کھولا تھا اور اندر کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی۔ ماں کی ناراضگی سے ڈر کر افضال باپ کو دیکھنے لگا تھا جو ماں کے زچ ہو جانے کے بعد اب قہقہے لگا رہا تھا، اس کا انداز بے فکری کو ظاہر کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

آج اماں کھیر پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فضا میں الائچی والے دودھ کی مہک نے جیسے نشہ سا بھر دیا تھا۔ اِدھر افضال کا چہرہ جیسے دمک رہا تھا وہ بار بار باورچی خانے کے چکر کاٹتا اور ایک ہی سوال دہراتا تھا۔

"کتنی دیر رہ گئی کھیر پکنے میں۔"

اماں اس کی بے تابی پر ہنس رہی تھی اور اسے نچلا بیٹھنے کی تلقین کے ساتھ یہ بھی بتا رہی تھی کہ ابھی دیر تھی کھیر پکانے کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہ تھا، اسے جمانے میں خوب محنت لگتی تھی، سوا انتظار کے سوا چارہ نہ تھا۔

لیکن افضال کو لمحہ بھر کا قرار نہ تھا اسے بس کھیر چاہیے تھی۔ ٹھنڈی میٹھی قلفی سی کھیر جو مٹی کی کوری پیالی میں جم کر اور بھی سوندھی ہو جاتی ہے۔ ماں کو افضال کی پسند کا خوب علم تھا اس لیے وہ دل سے خواہشمند تھی کہ اچھی سی کھیر پکا کر بیٹے کا دل اور نیت بھر دے...... افضال کو اتنی بہت سی کھیر کھلائے کہ وہ سیر ہو جائے۔

سو اس نے بڑے چاؤ سے دل لگا کر کھوئے جیسی کھیر بنائی، اس میں ڈھیر ساری بادام کی گریاں اور کشمکش بھی ڈالی اور پھر مٹی کی کوری پیالیوں میں ڈال کر جمنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ساتھ ہی ہر پیالی پر چاندی کا ورق بھی لگا دیا تھا جس سے کھیر چودھویں کے چاند کی صورت جھلملانے لگی تھی اور اب وہی چاندی کے ورق والی چمچاتی کھیر دیکھ کر افضال کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو کھیر کو ٹھنڈا بھی نہ ہونے دیتا بلکہ گرما گرم کھیر سے اپنا منہ جلا لیتا لیکن افضال کو گرم کھیر پسند نہیں تھی، کھیر ٹھنڈی ہو کر اپنے سواد میں دو آتشہ ہوئی ہے کہ جب پیٹ میں جائے تو نیت بھی بھر جائے۔ ٹھنڈی کھیر وہ خوب جم کر کھاتا اور ساتھ ماں کی تعریف بھی کرتا جاتا۔ جس کے ہاتھوں کی مٹھاس سے اس کا ذہن لذت کی اصل کیفیت اور مزے سے آشنا ہوتا تھا۔

ماں نے کھیر کے ساتھ آج کھانا بھی بہت عمدہ بنایا تھا۔ آلو گوشت کے ساتھ سفید ابلے چاول تھے، کھیر اسے کھانے کے بعد ملنے والی تھی۔ سو افضال کو کھیر کی آس میں بھوک زوروں کی لگ رہی تھی۔ ماں کا اشارہ پاتے ہی اس نے جھٹ سے چادر بچھا کے دستر خوان پھیلا دیا تھا۔ ابا اور وہ ہاتھ دھو کر دستر خوان پر آ کر بیٹھ گئے تب ماں فٹافٹ کھانا نکالنے لگی تھی اس نے ابھی پتیلی کا ڈھکن ہی اٹھایا تھا کہ باہر کا دروازہ تیز دستک

غزل

مسکراہٹ ہی ڈھال ہو جیسے
تیرا آیا خیال ہو جیسے
چند لمحے جو ساتھ تم تھے میرے
کوئی خواب و خیال ہو جیسے
تیرے بن سانس ہی نہیں آتی
زندگی بس وبال ہو جیسے
جھلملاتا جمال ہے اُس کا
پر سراپا سوال ہو جیسے
وہ ہمیشہ ہی میرے ساتھ رہا
لیکن ایسے بے حال ہو جیسے
یوں کبھی فاتحانہ ہنستا ہے
کر دکھایا کمال ہو جیسے
شگفتہ کی ہنسی بناتی ہے
بہت غم سے نڈھال ہو جیسے

شاعرہ: شگفتہ شفیق

سے بج اٹھا تھا۔

دستک کسی بھاری ہاتھ کی تھی ابا واماں ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے تھے گرمی کے چلچلاتے دن میں عین دوپہر کے دو بجے بھلا کون آیا تھا۔ وہ کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھے۔

''جا پتر...... دروازہ کھول جا کر......'' ماں نے افضال کو ٹہوکا دیا تھا وہ فوراً اُٹھ کر دروازے کی طرف چلا آیا اس اثناء میں دستک دوبارہ ہوئی تھی جو بھی تھا بڑا بے صبرا تھا۔

''کون ہے بھائی......'' افضال نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا بہتر سمجھا تھا۔

''ارے کھول پتر' میں ہوں رحیم...... تیرا ابا......!''

''تایا......!'' افضال نے حیرت سے مڑ کر ماں باپ کو دوبارہ دیکھا پھر جھٹ سے دروازہ کھول دیا دروازے کے کھلتے ہی تایا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے اندر چلا آیا تھا۔

''بلے بھئی بلے...... یہاں ہمارے آنے سے پہلے ہی دستر خوان سجا ہوا ہے۔ او بادشاہو، کیسے پتا چلا کہ ہم سب آرہے ہیں؟'' تایا ابا کے گلے لگتے ہوئے بڑی گرمجوشی سے بولا تو اماں تائی کو خوش آمدید کہتے ہوئے بولی۔

''جی آیا نوں...... مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں بھابی...... وہ اپنا نصیب لے کر آتے ہیں۔''

''سو تو ہے بھرجائی، چل پہلے روٹی شوٹی ہی ہوجائے۔ سفر کے بعد بھوک بھی خوب چمک اٹھتی ہے۔''

''ہاں کیوں نہیں پاء جی...... اِدھر آکے بیٹھو آرام سے...... کھانا تیار ہے۔ ابا نے اپنی جگہ تایا اور تائی کو دے دی۔ جبکہ ماں اور افضال کی جگہ پر تایا کے دونوں بچوں نے قبضہ جما لیا تھا...... وہ کھانا جو اماں نے محبت اور محنت سے اپنے افضال کی نیت بھرنے کے لیے پکایا تھا اب تایا اور اس کے گھرانے کی دعوت میں صرف ہو رہا تھا۔

تایا نے کھانے کے دوران ابا کو بتایا تھا کہ وہ جب سے گھر لوٹا تھا ایک پل بھی بھائی کے خیال سے غافل نہ رہا تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر سب کو اس کی بیماری کا فسانہ سنایا تو بیوی بچے بھی سر ہو گئے کہ ہم بھی چاچے کو دیکھنے چلیں گے۔ سو ان کے اصرار پر محض ایک ماہ سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ اس سے ملنے چلے آئے تھے۔ ابا ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کر رہا تھا، تائی اس کی خیریت پوچھ رہی تھی۔

وہ سب باتوں میں مگن تھے اور ساتھ عمدہ سی ضیافت کا لطف بھی اٹھا رہے تھے لیکن افضال کا دل ڈوب رہا تھا، کھانا تو پرائے پیٹ میں اتر گیا تھا اور اب کھیر کی باری تھی، افضال کا دل کھیر کھانے کے لیے مچلا جارہا تھا۔ ماں اس کی صورت دیکھ کر ہولتی ہو رہی تھی مگر اس میں ہمت نہ تھی کہ جیٹھ اور جیٹھانی کے سامنے پہلے اپنے بیٹے کو میٹھا کھلاتی، وہ بے چارہ کتنے شوق و ذوق سے دستر خوان پر آکر بیٹھا تھا لیکن افسوس آج کے رزق میں اس کے حصے کا ایک نوالہ بھی نہیں تھا۔ مہمانوں کا نصیب آج گھر کے ہر دانے پر لکھا تھا سو اماں اور افضال کے دیکھتے ہی دیکھتے تایا اور اس کی گھر والی، بچوں سمیت سارا کھانا چٹ کر گئے۔ ابا کے اصرار پر ماں کو کھیر بھی لا کر دینا پڑی تھی۔ افضال کی بے کسی و بے چارگی قابلِ دید تھی۔ مٹی کی کوری پیالی میں جمی ٹھنڈی خوشبودار ورق لگی کھیر وہ تایا کے بچوں کو اڑاتے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں پانی سے بھر رہی تھیں مگر قسمت مہربان نہ

تھی۔

کھیر ذائقے میں بے مثال تھی۔ کیوں نہ ہوتی اماں نے آج پورے دل سے بنائی تھی۔ تایا تو جیسے ماں کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے لگا تھا۔ وہ سب خوش تھے اور رج رج کے کھا رہے تھے۔

پھر افضال نے دیکھا ایک ایک کر کے مٹی کی کوری پیالیاں خالی ہو کر اس کا منہ چڑھانے لگی تھیں۔ کھیر سب کو اس قدر پسند آئی تھی کہ ایک پیالی بھی نہ بچ سکی اور افضال منہ تکتا رہ گیا تھا۔ کیا مقدر اس طرح بھی کھوٹا ہو جاتا ہے کہ سامنے پڑا رزق اٹھا کر بندہ منہ تک لے جا نہیں سکتا۔

کیا واقعی ہر دانے پر کھانے والے کی مہر ہوتی ہے؟ افضال کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر چکی تھیں دستر خوان پر موجود رہ کر بھی کھیر اس کی قسمت میں نہ تھی آج اللہ نے اس کا نصیب گھر آئے مہمانوں کے کھاتے میں کچھ اس طرح ڈالا تھا کہ وہ آپ دنگ رہ گیا تھا۔ احتجاج تک کر نہیں پایا تھا۔

اس کی اتری صورت اور بھیگی پلکیں دیکھ کر اماں خود بھی آبدیدہ ہوئی کھڑی تھی۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کے چپکے سے بولی تھی۔

''میں کل دوبارہ کھیر پکاؤں گی اور دیکھنا ساری کی ساری تجھے کھلاؤں گی۔''

افضال نے ٹھنڈی سانس بھر کے بڑی زخمی نگاہوں سے ماں کو سر اٹھا کے دیکھا اور پھر ان بلائے جاں قسم کے مہمانوں کو جو اس کی نیت بھرنے سے پہلے ہی اپنا پیٹ بھر چکے تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، افضال جانتا تھا ماں کے پاس اور پیسے نہیں تھے، بھلا کھیر پکانے کو رقم کہاں سے آتی۔

وہ دل مسوس کے رہ گیا تھا۔ ایسے میں اچانک تایا نے اماں کو پکارا تھا۔

''واہ بھرجائی! آج کھیر کھا کے سچ بڑا سواد آیا ہے، خدا قسم بہت ذائقہ دیا ہے اللہ نے تیرے ہاتھ میں، تو مان نہ مان...... ایسی کھیر تو کبھی میری گھر والی نے بھی نہیں پکائی۔''

''آپ سچ بولتے ہو جی، کھیر ایک دم لاجواب تھی۔'' تائی نے شوہر کا ساتھ دیتے ہوئے دیورانی کو سراہا تھا۔

''پھر کیوں نہ کل کھیر دوبارہ کھائی جائے...... کیوں بھرجائی؟'' تایا نے جیسے فرمائش کی تھی۔

ماں کے ساتھ ساتھ افضال کے ستے چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔ تایا کی فرمائش کا مطلب تھا وہ کھیر کے لیے رقم فراہم کرے گا۔ دونوں خوشی سے چمکتے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

''تو نے جواب نہیں دیا بھرجائی...... کل کھیر پکائے گی کہ نہیں......؟''

''ضرور پکاؤں گی پاہ جی...... تُسی کہہ دیا تو بس بات پکی سمجھو، کھیر ضرور بنے گی کل......'' اماں نے عجلت سے کہا۔

تو تایا نے جیب سے سو کے چند نوٹ نکال کے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ افضال کا دل دھڑکنے لگا تھا، تایا کہہ رہا تھا۔

''لے رکھ لے یہ پیسے اور ہاں، کل کھیر تھوڑی زیادہ بنانا، بچے بھی میرے ساتھ ہیں خوش ہو جائیں گے۔''

''کیوں نہیں پاہ جی، آپ فکر نہ کرو جی......''

ماں نے روپے فوراً دوپٹے کی گانٹھ میں باندھ لیے تھے۔ افضال کا سارا دکھ اور ملال جو کھیر کے ختم ہو جانے پر روح کو گھیرے بیٹھا تھا لمحوں میں دور

ہو گیا تھا پھر وہ اک آس کے ساتھ اگلے دن کی گھڑیاں گننے لگا کہ آج نہ سہی کل تو کھیر اس کا مقدر تھی، سو وہ خوب سیر ہو کر کھائے گا۔ اس نے مطمئن انداز میں سوچا اور پھر تایا کے بیٹے سے باتوں میں لگ گیا تھا۔ دل خاصا نراش ہوا تھا آج۔

لیکن دوسرا دن انتہائی بے یقینی کی صورتِ حال کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ موسم بے حد ابر آلود تھا۔ کالے بادل نیچے تک جھک آئے تھے ہوا میں تیزی اور نمی بے حساب تھی وجہ رات بھر برستی بارش تھی۔ جو اب بھی وقفے وقفے سے جاری تھی۔ گھر کا کچا آنگن بارش کے پانی اور کیچڑ سے پھسلن سی پیدا کر رہا تھا۔ اماں صبح سویرے مہمانوں کا ناشتا بنانے اٹھی تو صحن سے باورچی خانے کو جاتے ایسی زور کا پھسلی کہ باوجود کوشش کے کسی طور سنبھل نہ سکی۔ وہ دھڑام کی تیز آواز کے ساتھ پیٹ کے بل اوندھی گری تھی اور گرتے ہی ایک بلبلاتی چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو گئی تھی۔

گھر میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی، تایا اور ابا نے مل کر افضال کی ماں کو بہ مشکل اٹھا کے چارپائی پر ڈالا اور اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر ڈاکٹرنی صاحبہ کو گھر پر ہی بلایا تھا لیڈی ڈاکٹر نے آتے ہی اذیت سے دھری پڑی ماں کو سر سے پاؤں تک جانچا۔ معائنہ کرتے ہی اس نے ابا کو اسقاطِ حمل کی بدترین خبر سنائی تھی۔ پیٹ کے بل گرنے سے چوٹ اندر کو پڑی تھی اور شاید بچہ مر گیا تھا۔ سو مرے بچے کے ساتھ ماں کی حالت بھی لحظہ بہ لحظہ نازک ہوتی جا رہی تھی۔ تائی بے چاری گھبراہٹ اور فکرمندی میں ڈوبی ڈاکٹرنی کے ساتھ مل کر دیورانی کو سنبھالنے کی کوششوں میں تھی۔ بچے کی موت نے جیسے سبھی کے دلوں میں سناٹا اتار دیا

تھا۔ پھر تین چار گھنٹے کی محنت کے بعد کر ماں کی جان بچائی جا سکی تھی۔ ڈاکٹرنی نے جانے سے پہلے ایک کپڑے میں لپٹا ننھا منا مردہ وجود ابا کے حوالے کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ مردہ بچہ درحقیقت بیٹی تھی۔ یہ سنتے ہی ابا کے کاندھے جھک گئے تھے۔

وہ بیٹی جس کی پیدائش پر وہ ایک دھیلہ بھی خرچ کرنے کا روادار نہ تھا وہی بیٹی باپ کو کوئی تکلیف دیے بغیر رخصت ہو گئی تھی۔ بابا کو اس کی ضرورت نہیں تھی سو اللہ نے رحمت بھیج کر بھی واپس بلالی تھی۔ اس اچانک حادثے پر تایا کا چہرہ بھی اتر گیا تھا۔ بھرجائی کی گود اجڑ گئی تھی اسے اس بات کا بے حد قلق تھا پر تائی ذرا سیانی تھی اس نے موقع دیکھ کر دیور کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے دھیرے تسلی کراتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ سب اللہ کی مرضی ہے کرم دین، رب سوہنے کی مصلحت وہی جانے، پر شکر ہے تیری گھر والی کی جان بچ گئی۔ سوچ بیٹی کے ساتھ اگر وہ بھی اللہ کو پیاری ہو جاتی تو تیرا بسا بسایا گھر ہی اجڑ جاتا...... دیکھ کرم دین، گھر والی سلامت ہے تو اولاد کا سکھ اور بھی ملتا رہے گا اب لڑکا لڑکی کا کیا ہے جو دنیا میں آ جائے اسے کوئی پھینکنا تھوڑا ہی ہے...... کیوں؟''

''تو سچ کہتی ہے بھرجائی...... اللہ کا احسان ہے افضال کی ماں خیریت سے ہے۔ مجھے لڑکی کا غم نہیں ہے بیٹی ہوتی ہی پرایا دھن ہے۔ پرائی امانت سنبھال کے رکھنا بڑا اوکھا ہے۔ پر میں سمجھوں گا اسے پیدا ہوتے ہی میں نے اگلے گھر رخصت کر دیا ہے۔ کرم علی نے ٹھنڈی سانس بھر کے یوں کہا جیسے ہمدردی بٹورنے کی کوشش کی ہو۔ تائی مسکرائی کاندھا تھپک کر دوبارہ بولی۔

''تیری سوچ اچھی ہے کرم دین، بیٹی رحمت ہے اور بیٹا نعمت...... اب سوہنے رب نے اپنی رحمت سمیٹ کر بھی تیرا گھر خالی ہونے نہ دیا کیونکہ اسی رحمت نے جاتے جاتے کر ماں کی جان بخش دی ہے۔ یہی اللہ کا فضل ہے، اور تجھے کیا چاہیے۔ بس خیر منا کہ بری گھڑی کسی نقصان کے بغیر ٹل گئی۔

بابا سر ہلانے لگا تھا لیکن افضال کا دل زار و قطار ہڑکنے کو چاہ رہا تھا۔ تائی کس قدر بے کار باتیں کر رہی تھی۔ یہ کوئی تسلی تشفی تھی......؟ وہ بہن جس کی آمد کا احساس افضال کے لیے کسی تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تھا۔ وہ ہوا کا تازہ جھونکا سانسوں کو اُلجھا گیا تھا۔ وہ ننھی بہن......جس کے لیے افضال نے پورے پچاس روپے خرچ کر کے بڑے گھنگھروؤں والا جھنجھنا خریدا تھا۔ وہ صندوقچے میں ہی پڑا رہ گیا تھا اور اس سے کھیلنے والی اب کبھی لوٹ کر آنے والی نہ تھی۔ ماں کی وہ رحمت جس کی آس و امید میں اس نے پریوں جیسے فراک سیے تھے۔

جسے پہن کر وہ گھر بھر میں خوشیاں بکھیرنے والی تھی۔ ماں کے وجود ہی کو خالی کر گئی تھی۔ کیسی رحمت تھی وہ جو محبتوں کی برسات کیے بغیر ہی پلٹ گئی تھی۔ کیسی کالی زبان تھی بابا کی کہ جس نے کہا تھا وہ میری بیٹی نہیں ہوگی سو کوئی آس بھی نہ رکھنا مجھ سے...... اللہ کی رحمت غیرت والی تھی۔ باپ کے لفظوں کو آزمائے بغیر پلٹ گئی تھی۔ اس نے ماں کے لیے آسانی پیدا کر دی تھی۔

افضال اندر کوٹھڑی میں آ کر رونے لگا۔ کیسا دن چڑھا تھا آج......خزاں آنے سے پہلے ہی گھر پت جھڑ سے بھر گیا تھا اور ماں کے ساتھ بہن کی محبت بھی اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر رہی تھی۔ بہن تو مہمان تھی آئی اور چلی گئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے تایا مہمان تھا۔ جب وہ پہلے آیا تھا تو اس کا نصیب چمک کر ان کے گھر کو بھی چمکارے سے بھر گیا تھا۔ لیکن اب وہ بیوی بچوں کے ساتھ لوٹا تھا تو وہ سارے مہمان رحمت کی جگہ زحمت بن کر اس کے گھر کی خوشی کو گھن لگا گئے تھے۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہمان زحمت بن جائیں؟ نعمت کو گھن لگ جائے؟

ننھے افضال کا ذہن قلابازیاں کھا رہا تھا وہ اُلجھ رہا تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ ایک رحمت دوسری رحمت پر حاوی ہو گئی تھی۔ بہن کا قصہ پاک ہوا اور کھیر کھانے کو بھی نہ ملی تھی۔ کاش اس بار بھی تایا اکیلا ہی آیا ہوتا۔

افضال نے اشکوں بھری آنکھوں کو میچ لیا تھا، دل میں کانٹے بھر گئے تھے۔ ذہن میں اترا سوال جواب کے حصول کو ترس رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''ماں کہتی ہے آنے والا مہمان اپنا نصیب ساتھ لاتا ہے...... پر تائی اور اس کے بچے کیسے مہمان تھے جو ماں اور افضال کے لیے شدید منحوس ثابت ہوئے تھے۔ تبھی تو گھر کی رحمت اچانک روٹھ گئی تھی۔

وہ اُلجھا بیٹھا تھا لیکن اس گھر میں کسی کو اس ننھے دماغ میں اٹھتے خیالات کی یورش کا پتا نہیں تھا بھلا کون اُٹھ کر آتا اور افضال کو سمجھاتا کہ رحمت رحمت کو نگلتی نہیں ہے۔ ساتھ مل کر نور کی طرح پھیلتی ہے۔ بس نیت اور مراد ہی بندے کو اس کے اعمال کی جزا عطا کرتے ہیں۔ اگر اس کا ابا بیٹی کے حق میں اچھا بولتا اس کی پرورش کے لیے اللہ پر قناعت کرتا تو ان کے گھر کی رحمت خزاں کی نذر نہ ہوتی۔ بلکہ گھر ننھی بیٹی کی قلقاریوں سے گونجتا رہتا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

ڈاکٹر الماس روحی

خط کہانی

یہ خط اس حرافہ عالیہ کا تھا جو نادر کی نئی سیکریٹری تھی۔ خط پڑھ کر مجھ پر کیا بیتی کیا بتاؤں۔ نادر کے رویے نے تو پہلے ہی مار دیا تھا رہی سہی کسر اس خط نے پوری کر دی۔ ایک چھری تھی میرے سینے پر گھونپ دی گئی۔ مرد اس قدر بدل جاتے ہیں نادر کے بدل جانے کا......

پیاری شبانہ
سدا خوش رہو

تم سوچ تو رہی ہوں گی کہ نازیہ جیسی بے مروت، بے وفا لڑکی کو بھلا کیسے اتنے سال بعد حال احوال لکھنے کی فرصت مل گئی۔ شبو کیا بتاؤں جب من میں بوجھ ہو تو کوئی ہمدرد ہی یاد آتا ہے۔ اگرچہ اب وہ بوجھ نہ رہا مگر ایک عرصے بعد تم سے مخاطب ہونے کا جی چاہا۔ ویسے بھی تم میری واحد سہیلی تھیں۔ جس سے میں ہر بات بے کم و کاست کہہ لیا کرتی تھی۔ تم اور میری دوسری سہیلیاں میری قسمت پر رشک کرتی تھیں۔ میں نے جیسا سوچا وہ پالیا شبو میں نے خواب دیکھا تعبیر بھی پائی۔

نادر سے شادی ایک خواب ہی تو تھی حسین خواب یہ تم جانتی ہو جو شادی سے قبل بار بار ملا مجھ سے ملاقاتیں کیں جس کے نتیجے میں ہم ایک دوسرے کے خیالات کو زبان کے اظہار سے بہت پہلے سمجھ جایا کرتے تھے۔ اس قدر ذہنی ہم آہنگی ہونے کے باوجود شادی کے بعد فوراً ہی ہم دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ ہم مزاج میں مختلف ہیں۔ نادر کا تعلق چونکہ غریب گھرانے سے تھا۔ اس لیے انہیں معمولی کھانوں کی عادت تھی۔ ان کا غذائی مذاق بے پناہ پست تھا۔ تمہیں حیرت ہوگی وہ تو روٹی، پانی اور شکر سے کھانے پر آمادہ رہتے تھے۔ وہ لباس کے معاملے میں بھی بے نیاز تھے۔ جبکہ تمہیں معلوم ہے میں نے اپنے گھر میں عمدہ کھانے کھائے اور قیمتی لباس پہنا۔ میری یہ خواہش تھی نادر لباس کا خاص اہتمام کریں اور پُرتکلف کھانے کھائیں۔ اگر شبو میں اس بات کا اظہار کرتی تو نادر جھنجلا جاتے تھے۔

اُن کے روزمرہ کے معمولات بھی مختلف تھے۔ نادر کی والدہ نے انہیں صبح سویرے اٹھنا سکھایا تھا۔ چنانچہ وہ صبح سویرے اٹھتے ہی اپنے روزانہ کا کام بے حد باقاعدگی سے کرتے تھے۔ جبکہ مجھے گھر کے لاڈ پیار اور آرام دہ زندگی نے صبح سویرے اٹھنے کی زحمت سے بچائے رکھا تھا۔ نادر کو خاموش اور پُرسکون ماحول پسند تھا۔ جبکہ

مجھے ہنگامہ خیز زندگی کی عادت تھی۔ نادر کلاسیکل موسیقی پسند کرتے تھے۔ جبکہ تمہیں معلوم ہے مجھے فلمی گانے اور بھڑکتی ہوئی دھنیں پسند تھیں۔

ہمارے درمیان ان ظاہری اختلافات کے ساتھ شخصی اختلافات بھی موجود تھے۔ نادر جو بظاہر شرمیلے آدمی تھے اندر سے واضح کردار کے آدمی تھے۔ ان کے اپنے طے شدہ نظریات تھے جن سے وہ انحراف کرنے کے قطعاً مجاز نہیں تھے۔ اس لیے وہ سخت ترین حالات سے بھی گزر سکتے تھے جبکہ میں نے تو زندگی آسان گزاری تھی۔ لہٰذا میں کسی چیز کے متعلق حقائق کو سنجیدگی کے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زندگی کے بارے میں میرا یہ رویہ اور یہ انداز نادر کو کھولا دیا کرتا تھا۔ اور وہ غصے سے پیچ وتاب کھا کر رہ جاتے تھے۔

امور خانہ داری کے سلسلے میں بھی میری بے توجہی اور بے حسی نادر کو ناپسند تھی۔ میں ہمیشہ کی ضدی اور اڑیل قسم کی تھی۔ دوسروں کی مجھے نہ فکر تھی اور نہ کسی کی ضرورت کے خیال کا سلیقہ، میں نے ازدواجی زندگی میں قربتوں کے لمحوں میں بھی نادر اور اپنے درمیان کھنچاؤ محسوس کیا۔ اس کھنچاؤ کا احساس انہیں بھی تھا۔ اس لیے ہمارے درمیان اب گھٹن اور جھنجلاہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ وہ مجھے شدید قربت میں بھی بے حس اور جامد محسوس کرتے تھے میں انہیں مطمئن کرنے سے قاصر تھی۔

اب تم سوچ رہی ہوگی کہ میری ازدواجی زندگی کیونکر قائم رہی۔ اس قدر شدید اختلافات کے باوجود یہ ہمیں بھی حیرت تھی ہم دونوں کو محسوس

تو ہو چکا تھا کہ ہمارے مزاج اور پسند میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن چونکہ ہم نے ہنگامہ خیز رومان کے بعد اپنی شادی کی تھی۔ اس لیے علیحدگی میں (......) کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا اس ٹھہری ہوئی زندگی سے فرار کے ہم نے راستے تلاش کر لیے نادر خاصا وقت باہر گزارنے لگے۔ جبکہ میں نے ایک اسکول میں ٹیچنگ شروع کر دی اور اپنا آپ بچوں کو پڑھانے میں مصروف کر لیا۔

تم نہیں سوچ سکتیں شبو وہ کتنا مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا۔ جب میں اور وہ اُلجھن اور گھٹن کو اپنے سینے میں دبائے رہتے ایسے میں ہماری مسکراہٹیں پلاسٹک کی مسکراہٹیں تھیں۔ ایک بناوٹ کا پہلو تھا۔ جذبوں سے عاری سپاٹ لہجوں میں جب ہم ایک دوسرے کو پکارتے تھے تو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ مجھے معلوم تھا انہیں میرے روکنے انداز سے تکلیف ہوتی ہوگی مگر میں بھی کیا کرتی عادت سے مجبور تھی۔

ویسے بھی اپنی اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی بنا پر ہم ایک دوسرے کے ساتھ وقت بہت کم گزارتے تھے اور جو وقت ساتھ گزارتے تھے وہ بہت بھاری ہوتا تھا۔ رات کو مجھے جلدی سو جانا بہتر لگتا تھا اور وہ کسی آفس کی فائل میں سر کھپانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ لیکن میں سوتی کب تھی آنکھیں موندھے ان دنوں کو یاد کرتی تھی۔ جب ہم دونوں نادر اور میں یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ نادر کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی تعلیم کے اخراجات وظیفے پر منحصر تھے یہ کلاس کے ذہین طالب علم تھے میں ایک اونچے طبقے میں ایک تاجر کی بیٹی تھی۔ جس کا شمار اوسط درجے کے طالب علموں میں ہوتا تھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا کہ نادر مجھے یونیورسٹی کے اوبالی چھچھورے لڑکوں سے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ سنجیدہ پروقار' کام سے کام رکھنے والے میں جانتی تھی کہ نادر کو بہت سی لڑکیاں پسند کرتی تھیں۔ لیکن نادر نے ان تمام لڑکیوں میں سے ایک میرا انتخاب کیا تھا۔

تم تو میری اس رومانی زندگی کی رازدار ہو۔ تمہیں خبر ہے وہ کتنی بے چینی اور اضطرابیت کے دن تھے۔ جب نادر یونیورسٹی نہیں آتے یا دیر سے آتے۔ کس قدر میرے گروپ کی لڑکیاں میرا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔

تمہیں میں نے بتایا تھا ناں نادر سے میری محبت کا جب علم میرے والدین کو ہوا تھا۔ تو وہ کس قدر چراغ پا ہوئے تھے۔ وہ تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی ایک معمولی حیثیت کے لڑکے سے شادی کرنے کی خواہش کرے گی۔ یہ بات ہماری محبت کے لیے چیلنج تھی۔ میں نے پھر بغاوت کی اور نادر سے شادی کے لیے شدت اختیار کی، بھوک ہڑتال کی، گھر کے ہر فرد سے بول چال بند کی۔ یہاں تک کے اپنی والدہ کے سامنے گھر چھوڑ جانے کی دھمکی دی۔ اُف وقتی جذبات کے تحت ہم کس قدر سفاک ہو جاتے ہیں۔ اب میں سوچتی ہوں میں کس قدر خود غرض ہو گئی تھی۔ میں نے ذاتی مفاد کی خاطر دوسروں کو تکلیفیں دیں اور اس نادر کے لیے وہ کچھ کیا۔ جس کی اُسے قدر نہیں۔ جو لاتعلقی کے ساتھ سرد راتوں میں اپنی دفتری فائلوں پر سر دیے رہتے ہیں اور جانے کب سو جاتے ہیں۔ کاش میرے والدین اور لڑکیوں کے والدین کی طرح سختی کرتے، میرے ساتھ زبردستی کرتے اور میری شادی کہیں اور کر دیتے۔ لیکن میں تو اپنے والدین کی اکلوتی، چہیتی اور لاڈلی تھی۔ میری خواہش کے سامنے انہیں جھکنا پڑا۔ ہماری تعلیم مکمل ہوتے ہی ہماری شادی

ہو گئی۔ شادی کے بعد مجھے علم ہوا خواب جو دیکھا تھا وہ اک سراب تھا س۔ اور بس سراب......

ہاں تو میں کہہ رہی تھی ۔ شبو میری ازدواجی زندگی میں بھونچال اس وقت آیا جب میں حاملہ ہو گئی۔ تو مجھے مجبوراً اپنے معاشی مشاغل ترک کر کے گھر بیٹھنا پڑا۔ ہمارے درمیان خلیج اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ نادر گھنٹوں گھر سے باہر رہتے اور رات کو دیر سے واپس آتے۔ ان دنوں تو خاص توجہ عورت چاہتی ہے۔ عورت کی طبعی حساسیت کا عروج ہوتا ہے تمہیں معلوم ہے اُسے کتنی دلجوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں بدنصیب اکیلے گھر میں بیٹھی روتی تھی۔ بوکھلائی بوکھلائی گھر کے کمروں اور آنگن میں پھرتی تھی۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے ایک ایک کام نکال نکال کر کرتی ایک روز نادر کے میلے کپڑے دھوبی کو دینے کے لیے نکالے ان کی شرٹ کی جیب سے ایک خط مجھے ملا۔ جس کی ہر سطر رومانی تھی۔

یہ خط اس حرافہ عالیہ کا تھا جو نادر کی نئی سیکریٹری تھی۔ خط پڑھ کر مجھ پر کیا بیتی کیا بتاؤں۔ نادر کے رویے نے تو پہلے ہی مار دیا تھا رہی سہی کسر اس خط نے پوری کر دی۔ ایک چھری تھی میرے سینے پر گھونپ دی گئی۔ مرد اس قدر بدل جاتے ہیں نادر کے بدل جانے کا مجھے شدید دکھ تھا۔ اس نے مجھے کیا سمجھا تھا ٹشو پیپر، مٹی کی گڑیا، یا کوئی اور شوپیس میں بہت ٹوٹی بہت تڑپی اس دوران شبو میں حالات کے دباؤ میں تھی۔ منتشر المزاج ہو گئی تھی۔ تمہیں خط لکھنے کی خواہش کے باوجود، نہیں لکھ سکی۔ لکھنے بیٹھتی کاغذ، قلم لیے تو لفظ ساتھ نہیں دیتے۔

تم اندازہ کر سکتی ہو جو دنیا انسان بڑے چاؤ کے ساتھ بنائے اُسے اجڑتا دیکھے تو اس پر کیا گزرے گی۔ میرے گھر کی دیواریں تو ہل رہی تھی۔ یہ گھر لمحوں میں ڈھنے والا تھا۔ بہرحال دو روز بعد میں اسپتال میں زچگی کے لیے داخل ہوئی۔ وہ لمحہ بھی آیا جب عورت موت کے قریب ہوتی ہے۔ تمہیں حیرت ہو گی نادر اس وقت اپنی سیکریٹری عالیہ کے ساتھ ساحلِ سمندر پر تفریح کر رہے تھے۔

مجھے اسپتال میں سوچنے کا بہت موقع ملا۔ میں عالیہ سے بات کروں گی۔ اسے جھاڑوں گی وہ کون ہوتی ہے میرے شوہر پر ڈورے ڈالنے والی۔ وہ ایک ملازمہ ہے سیکریٹری کی اوقات کیا ہوتی ہے وہ اپنی حیثیت میں کیوں نہیں رہتی۔ کبھی میں سوچتی مگر میں ایسا کیوں کروں۔ کیوں ایک معمولی عورت کے منہ لگوں۔ میں نادر کی بیوی ہوں اور وہ بھی اُس کی پہلی محبت اور پسند۔ کیوں ناں میں نادر کو وہ خط دکھاؤں اور پوچھوں یہ سب کیا ہے؟ مگر مجھے معلوم تھا نادر جو فیصلہ کر چکے ہوں گے وہ کر کے رہیں گے۔ فائدہ زبردستی کا...... پھر اپنے بچے کا خواب دیکھنے لگتی کہ خدا نے مجھے جینے کا سہارا دے دیا ہے۔ اپنے ان دیکھنے بچے کا خیال کس قدر مجھے اطمینان دلاتا تھا۔ یہ تم اندازہ لگا سکتی ہو آخر تم ایک عورت ہو اور ایک ماں ہو۔ بہرحال جب میں اپنے بیٹے کو جنم دیا تو نادر اپنی سیکریٹری کے ساتھ ساحل سمندر پر تفریح کر رہے تھے۔

رات جب نادر اسپتال آئے۔ تو میرے پہلو میں جو بچہ لیٹا تھا۔ اس گول مٹول سرخ و سفید بچے کو دیکھ کر نادر کو بے ساختہ پیار آیا۔ انہوں نے گود میں لے کر اسے بے تحاشہ پیار کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا شبو کہ جب عورت پہلی بار ماں بنتی ہے تو اسے صرف خوشی ہوتی۔ بلکہ جب کوئی مرد پہلی بار باپ بنتا ہے تو اُسے بھی مسرت ہوتی

ہے۔ میں نے بہت عرصے بعد شاید اپنی شادی کی رات کے بعد نادر کو ان لمحوں میں خوش دیکھا۔ جب بچہ ان کی گود میں تھا۔ نادر گھنٹوں گود میں اپنے بیٹے کو لیے بیٹھے رہے۔

دوسرے روز جب اسپتال سے میں گھر جانے لگی تو نادر نے سامان اپنی گاڑی میں رکھا۔ میں بھی بچہ گود میں لیے پہلی نشست پر خاموشی سے بیٹھی تھی۔ نادر دفتر اور جانے کہاں کہاں کی مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا چند لمحون بعد اُن کی خوشی کافور ہو جائے گی۔ کیونکہ میں فیصلہ کر چکی تھی۔ اگلے لمحے ہمیں جدا ہونا تھا۔ گاڑی کا رخ نادر نے جب اپنے گھر کی طرف کیا۔ تو میں نے نادر سے کہا۔

''آپ مجھے میری امی کے گھر چھوڑ دیں۔ میں آپ کے گھر جانا نہیں چاہتی۔''

''کیوں!'' نادر کو جھٹکا لگا۔ گاڑی کے بریک پر پاؤں رکھا۔ گاڑی چرچراتے ہوئے ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

''نادر اسپتال سے آپ کے ساتھ نکلنا مصلحت تھی۔ کیونکہ لوگ دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں زبردستی آپ کے ساتھ میرا یا آپ کا میرے ساتھ رہنا مناسب نہیں۔ ہم مختلف مزاج کے لوگ ہیں۔ آپ کے مطابق مجھ میں گھریلو زندگی کا کوئی شعور نہیں۔ یہ شعور آپ کو عالیہ میں نظر آ رہا ہے۔ اُسے آپ اپنانا چاہتے ہیں یہ خط اُس کا ثبوت ہے۔'' میں نے خط اپنے پرس سے نکال کر انہیں دیا۔

''آپ مرد ہیں جو چاہے کر سکتے ہیں نادر ہکا بکا مجھے دیکھ رہے تھے۔'' مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ مرد کی زندگی شادی کے بعد بھی وسیع رہتی ہے۔ اس کی زندگی میں عورتیں اور بھی آ سکتی ہیں لیکن ایک عورت اپنے شوہر بچے اور گھر کی ہو جاتی ہے۔ عورت کی زندگی تھال میں پڑی دال ہے اور مرد کی زندگی پورا تھال ہے۔ میں اس معصوم بچے کے سہارے ہی زندگی گزار لوں گی۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

نادر بہت پشیمان تھے۔ انہوں نے وہ خط پھاڑ دیا۔ وہ دل سے اپنی حرکت پر نادم تھے۔ انہوں نے معافی مانگی۔

''نازیہ مہربانی کرو مجھے معاف کر دو تم اور یہ بچہ میری زندگی ہو مجھے تنہا مت چھوڑو۔'' ہم گھر پہنچے میں حیران رہ گئی۔ گھر رنگ برنگی جھنڈیوں، غباروں اور کھلونوں سے سجا تھا۔ ہماری خواب گاہ میں پھول ہی پھول چاروں طرف تھے۔ تازہ اور سرخ گلاب کی مہک نادر کی محبت کی مہک کے ساتھ میرے من میں اترتی چلی گئی۔ اور میں پھر سے جی اٹھی۔

''شبو میرا بچہ بہت خوبصورت ہے۔ میری ساکت و جامد اور ازدواجی زندگی میں اس ننھے نے حرکت پیدا کر دی ہے۔ ماں بننے کے بعد میری طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ اب میں امورِ خانہ داری میں بھی دلچسپی لیتی ہوں اور نادر بھی میرے ساتھ سختی نہیں کرتے۔ اور نہ تنقید کرتے ہیں ہم ایک دوسرے کے لیے دلوں میں بالکل نیا احساس پاتے ہیں۔ وقت سے پہلے جس ہم آہنگی کو ہم لانا چاہتے تھے۔ وہ زندگی میں خود بخود آ رہی ہے۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔ اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ کراچی آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔ وہ فرصت کے دن بہت یاد آتے ہیں جب ہم ساتھ پڑھا کرتے تھے اور خواب دیکھا کرتے تھے۔

تمہاری سہیلی

نازیہ

☆☆......☆☆

یہ جو محبت ہے...

جانے وہ کس قسم کا کاروبار تھا جو اتنی تیزی سے ترقی کر گیا۔ اُس نے اپنے کلاس کی ایک لڑکی مونا سے شادی کر لی اور جب بدرالدین کی شادی کے تین سال بعد خدا نے فائزہ کے آنے کی نوید دی اور فائزہ پیدا ہوئی تو فائزہ کے پیدائش کے مہینے بعد مونا......

دوشیزہ کی لکھاری شمیم فضل خالق کے قلم سے دل کے تاروں کو جھنجھناتی تحریر

توبہ...... توبہ...... چائے کی کیتلی سے چائے بغیر گنڈوں کے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ یہ پیالیاں لائے ہیں ابو...... بندہ اِن کو کیسے پکڑے اور اِن سے چائے پیئے...... ہاتھ اور منہ دونوں جل جاتے ہیں۔ کیا خاک مزہ آتا ہے بندے کو چائے پینے کا۔

''اب ابو کیا کرتے...... یہی پیالیاں سامنے نظر آئی ہوں گی۔ اتوار بازار میں......'' فائزہ نے پیالی اُٹھا کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''لو اور سنو......'' شہزادی کو اُس کی بات سے غصہ آیا تو تنک کر بولی۔

''سارے بازار میں ابو کو یہی پیالیاں نظر آئی تھیں۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ یہ پیالیاں سارے بازار میں سستی ہوں گی۔ تمہیں تو پتا ہے ابو چن چن کر سستی چیزیں لاتے ہیں چاہیے وہ سبزیاں ہوں...... یا کوئی اور چیز......''

''ہاں!'' فائزہ ہنس کر بولی۔ غالباً ابو کی نظر میں ستا روئے بار بار...... مہنگا روئے ایک بار والا مقولہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ ورنہ وہ ایسی غلطی نہ کرتے۔

اب چائے لاکھ اچھی بنی ہو لیکن ایسی پیالیوں میں پینے کا کیا مزہ آتا ہے۔ شہزادی بڑی احتیاط سے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ تھامتے ہوئے بولی۔

''اچھا چھوڑو......'' فائزہ نے بات ختم کرتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

''یہ بتاؤ...... نورین شادی کے بعد کالج آئی تھی؟''

''ہاں...... کل آئی تھی...... گوٹے کا سرخ سُوٹ پہن کر...... فل میک اپ کے ساتھ۔''

''کیا...... سچ...... کالج میں اور گوٹے کا سوٹ اور فل میک اپ فائزہ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر بولی۔

''ہاں...... ہم سب دوستوں نے زور دیا تھا کہ وہ باقاعدہ دُلہن بن کر آئے...... سیدھی سادی...... پہلی والی نورین نہ آئے...... کہ پتہ تو

چلے کہ زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے۔
"اچھی لگ رہی ہو گی نا...... نین نقش تو اُس کے بڑے پیارے تھے۔ فائزہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔
"ارے ایسی ویسی...... اپسرا لگ رہی تھی...... پارلر سے میک اپ کرا کر آئی تھی۔"
"ہوں...... فائزہ چائے کی چسکی لے کر بولی۔
"اچھا چھوڑو...... تمہیں ایک بات بتانی تھی۔"
"کیا......؟" اس نے بھنویں اُٹھا کر فائزہ کی طرف دیکھا۔
"کبیر آیا ہے......" وہ اُس کی طرف جھک کر رازداری سے بولی۔
"تو پھر......" وہ بے حس سے بولی جیسے اُس کے آنے جانے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔
"کچھ نہیں...... بس اماں کو شدت سے اُس کا انتظار ہے۔ ہر وقت ابو سے یہی باتیں کرتی ہے۔"
اماں کو بھی اُس کے بھائی بھابی نے پوچھا۔ جو کبیر آئے گا پوچھنے وہ تلخی سے بولی تو فائزہ فوراً کہنے لگی۔
"اب یہ تو مت کہو...... کبیر جب بھی باہر سے آتا ہے۔ اماں سے ملنے ضرور آتا ہے۔" وہ اور زیادہ تلخی سے کہنے لگی۔
"کبھی اپنے ماں باپ سے بھی پوچھا کرے نا...... کہ وہ غریب پھوپو کے خیر خبر کیوں نہیں لیتے...... اکلوتا بیٹا ہے اِتنا تو پوچھ سکتا ہے اپنے والدین سے۔"
"خیر چھوڑو...... مجھے تو اُس کا آنا بڑا اچھا لگتا ہے۔ کتنے مہنگے مہنگے تحفے لاتا ہے ہمارے لیے......" فائزہ کی بات پر شہزادی نے منہ بنالیا اور بات بدل کر بولی۔
"اماں ابو کو چائے دے دو......" اپنی یہ لن ترانیاں چھوڑ دو۔"
"لو...... چھوڑ دیں...... پکڑاؤ مجھے کپ......"
فائزہ بڑی صلح جو لڑکی تھی۔ مجال ہے جو کبھی لڑائی جھگڑا کیا ہو۔
"کیسے پکڑاؤں...... کہاں سے پکڑاؤں، ٹرے میں رکھ کر لے جاؤ، مجھے اپنے ہاتھ جلانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" شہزادی منہ بنا کر بولی تو فائزہ نے مگ ٹرے میں رکھے اور باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔
فائزہ اور شہزادی بدرالدین اور مہرالنساء کی بیٹیاں تھیں۔ فائزہ شہزادی سے چار سال بڑی تھی لیکن دونوں میں چھوٹائی بڑائی کا کوئی تصور نہ تھا...... بچپن میں مہرالنساء شہزادی کو کہتی کہ وہ فائزہ کو آپا کہہ کر بلایا کرے۔ لیکن شہزادی شروع سے منہ پھٹ اور اپنی من مانی کرنے والی تھی۔ اور کچھ وہ فائزہ کی ہم عمر لگتی تھی۔
فائزہ کا جسم کمزور اور قد بوٹا سا تھا، جبکہ شہزادی کا قد نکلتا ہوا جسم فربہ اور نقوش موٹے موٹے سے تھے۔ سو وہ کبھی ماں کی بات نہ مانتی۔ اُسے فائزہ کو آپا یا باجی کہنا بہت فنی لگتا۔
وہ دھڑلے سے اُسے فائزہ کہتی تھی ویسے بھی فائزہ بڑی دبو سی بچی تھی جبکہ شہزادی بڑی بولڈ بلکہ ایک حد تک جھگڑالو اور منہ پر ہر بات کہنے والی تھی۔
بدرالدین کی دال دلیے کی ایک چھوٹی سی دکان بڑے بازار کے ایک کونے میں تھی۔ جہاں گاہک بھی نہ ہونے کے برابر آتے۔ پھر بھی گزارا چل رہا تھا۔ گھر اپنا تھا جو بدرالدین کو ترکے میں ملا

تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا سو ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ اِس گھر کا اور دکان کا مالک ٹھہرا تھا۔ اولاد میں بھی اُسے خدا نے دو لڑکیوں سے نوازا تھا اور جو سب سے بڑی بات تھی وہ دونوں میاں بیوی کی قناعت پسندی تھی۔ جنہوں نے ہمیشہ رُوکھی سُوکھی بھی صبر شکر کے ساتھ کھائی تھی۔

فائزہ بھی ماں باپ کا پرتو تھی جبکہ شہزادی بالکل الگ طبیعت کی مالک تھی۔ اُسے اپنے رب سے ڈھیروں ڈھیر شکایتیں تھیں سب سے بڑی شکایت اپنے غربت کی تھی بدر الدین نے کم وسائل کے باوجود دونوں بیٹیوں کو پڑھانے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا شہزادی اِسی سال تھرڈ ایئر میں آئی تھی جبکہ فائزہ نے ایم اے کا ایگزام دیا تھا اور نتیجہ کے بعد وہ جاب کا پختہ ارادہ کیے بیٹھی تھی آج کل وہ اپنا فارغ وقت گھر کے کام کاج میں گزار رہی تھی۔ مہرو کے میکے میں اُس کا ایک بھائی تھا جو لاہور میں رہتا تھا۔ کبھی اُس کا بھائی بھی بدر الدین کی طرح غریب ہوا کرتا تھا لیکن پھر اُس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں میں کھیلنے لگا۔

جانے وہ کس قسم کا کاروبار تھا جو اتنی تیزی سے ترقی کر گیا۔ اُس نے اپنے کلاس کی ایک لڑکی مونا سے شادی کر لی اور جب بدر الدین کی شادی کے تین سال بعد خدا نے فائزہ کے آنے کی نوید دی اور فائزہ پیدا ہوئی تو فائزہ کے پیدائش کے مہینے بعد مونا کا بیٹا کبیر بھی اِس دنیا میں آیا...... اس طرح فائزہ اور کبیر ہم عمر تھے۔

آج اتوار تھا شہزادی کی چھٹی تھی چھٹی کے [illegible] دوپہر سے پہلے نہیں اٹھی تھی لیکن آج وہ اماں کی باتوں کی وجہ سے سو نہیں پا رہی تھی۔ اماں ابو سے کہہ رہی تھیں۔

”فائزہ کے ابا...... کبیر آج کل میں ملنے آئے گا نا......“

”پتا نہیں......“ بدر الدین چائے کی چسکی لے کر بے پرواہ انداز میں بولا۔

”آئے گا کیوں نہیں۔“ مہرو خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”میرا چاند کا ٹکڑا ضرور اپنی پھوپو سے ملنے آئے گا۔“

اندر آڑھی ترچھی لیٹی شہزادی کی نیند آنکھوں سے اُڑنچھو ہو گئی تھی وہ جُزبُز ہو کر سوچنے لگی۔

اماں کو اپنی یہ چاند کی ٹکڑی نظر نہیں آ رہی...... اور چاند کے ٹکڑے کا بڑا انتظار ہو رہا ہے۔ اونہہ...... گرہن زدہ چاند...... شہزادی کو اماں کی بھتیجے سے محبت ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔

اُسے ماموں ممانی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ ایک دو بار کے سوا کبھی ماموں کے گھر نہیں گئی تھی۔ اماں جب بھی جاتی تو وہ اپنے باپ کے ساتھ گھر میں رُک جاتی جبکہ فائزہ اماں کے ساتھ چلی جاتی۔ لیکن واپسی پر فائزہ کے پاس ماموں کے گھر کی کوئی اچھی یاد نہ ہوتی شہزادی کے استفسار پر وہ بے زاری سے کہتی۔

میں اور اماں تو سمجھو ہاں اپنی نیندیں پوری کرنے جاتے ہیں۔ نہ ماموں گھر پر ہوتے ہیں نہ ممانی...... ماموں کا تو خیر بڑا کاروبار ہے۔ اُسے وقت دینا اُن کی مجبوری ہے لیکن ممانی کی تو خود ساختہ مصروفیات ہیں۔ کبھی کسی فرینڈ کے گھر چائے پر جا رہی ہیں تو کبھی کھانے پر...... ہم تو سارا دن یا سوتے رہتے ہیں یا نوکروں سے باتیں کرتے ہیں۔

اور جا یا کروا اپنی بے عزتی کروانے...... بڑا

شوق ہے تمہیں اور اماں کو اپنی بے عزتی کروانے کا...... وہاں تم لوگوں کو گھاس نہیں ڈالی جاتی اور تم ہو کہ......"

لیکن جب کبیر گھر پر ہوتا ہے تو واپسی پر فائزہ کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ تب اُس کے پاس بتانے کو بہت مواد ہوتا۔ کبیر ہمیں ہر روز گھمانے پھرانے لے جاتے۔ کبیر خانساماں سے کہہ کر ہمارے لیے نئی نئی ڈشز تیار کراتا، وہ لنچ اور ڈنر ہمارے ساتھ کرتا تھا اور اکثر اماں کو تو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا کرتا۔ وہ ہنس ہنس کر ہمارے پیٹ میں بدل ڈال دیتا دن گزرتے جاتے لیکن فائزہ کا کبیر نامہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ شہزادی کے دل میں ماموں کے گھرانے کی طرف سے جو گرہ پڑی تھی اُس کی زد میں کبیر بھی آیا تھا۔ اُسے کبیر بھی اِن ساری خرابیوں کا مرقع نظر آتا۔ سو وہ فائزہ کو ڈانٹ کر چپ کرادیتی۔

اماں اُسکی تھوڑی ناز برداریاں کرتی ہیں۔ اگر اُس نے تھوڑا بہت بدلہ چکا دیا تو کیا ہو گیا...... اب اور تعریفیں کر کے میرا دماغ مت چاٹو۔

فائزہ چپ ہو جاتی...... دونوں بہنوں کو اچھی طرح یاد تھا جب اماں بہت بیمار پڑی تھیں تو ابو نے ماموں کو فون کر دیا تھا۔

اماں ہر روز ماموں ممانی کا انتظار کرتیں لیکن صبح سے شام ہو جاتی یہ انتظار ہی رہتا۔ کبیر اُن دنوں بھی پڑھائی کے سلسلے میں باہر تھا۔

اماں لوٹ پوٹ کر خود ہی ٹھیک ہو گئیں۔ ماموں نے اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے اماں کے نام ایک منی آرڈر ارسال کیا تھا کہ وہ اِن پیسوں سے اپنا علاج کرائے۔ شہزادی نے بڑا رولا ڈالا کہ یہ منی آرڈر واپس کیا جائے لیکن اماں بھائی کی خفگی کی وجہ سے اِس پر راضی نہ ہوئیں جبکہ شہزادی نے اِس سوگ میں دو دن کھانا نہ کھایا اور اماں سے تو اُس نے پورا ہفتہ بات چیت نہ کی اور تب اماں سے صلح کی جب اماں نے اُسے یقین دہانی کرائی کہ وہ جب ماموں کے گھر جائیں گی تو یہ پیسے واپس کر دیں گی۔

ایسی ہی خودار اور اَنا پسند تھی شہزادی......! ابو کی ایک خوبی (جسے شہزادی خامی سمجھتی تھی) یہ تھی کہ وہ اماں اور اُس کے بھائی کے بیچ کچھ نہیں بولتے تھے۔ جب بھی کبیر آتا...... ابو اُس کے ساتھ بڑی محبت سے ملتے۔ اماں جو بھی اُس کے لیے منگواتی بخوشی بازار سے لا دیتے۔ حالانکہ اُن کے جیب پر خاصا بار پڑتا شہزادی سوچتی کہ ابو کو چاہیے کہ وہ اماں کو منع کر دیا کریں اضافی خرچوں سے بلکہ انہیں وارننگ دیں کہ وہ یہ اللے تللے افورڈ نہیں کر سکتے ان کے بھتیجے کو علم ہونا چاہیے کہ وہ اپنی غریب پھوپو کے گھر آئے ہیں اور ایسا ہی روکھا سُوکھا کھائیں گے جیسا سب گھر والے کھاتے ہیں لیکن یہ سب باتیں وہ دل ہی دل میں سوچتی۔ باپ سے تو دبے الفاظ میں کچھ کہہ بھی دیتی لیکن اماں سے کہنا تو اُن کے غضب کو آواز دینا تھا سو وہ چپ رہ جاتی۔ لیکن جتنی دیر کبیر یہاں رہتا وہ کڑھتی رہتی۔ اور وہ اُن اچھے کھانوں کو بھی انجوائے نہ کر پاتی جنہیں عام دنوں میں کھانا محال تھا۔

صبح کا وقت تھا۔ فائزہ کچن میں مصروف تھی۔ شہزادی کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اماں ابو برآمدے میں بیٹھے چائے اور پاپوں کا ناشتہ کر رہے تھے کہ دروازہ زور سے بج اٹھا۔ شہزادی نے تیار ہوتے ہوتے سوچا۔

رابعہ ہو گی۔ دیر جو ہو گئی ہے مجھے...... رابعہ شہزادی کی دوست تھی وہ دوسری گلی میں رہتی تھی۔

دونوں مل کر کالج جایا کرتیں اور جب بھی شہزادی کو دیر ہو جاتی تو رابعہ خود آ جاتی حالانکہ اُس کا گھر شہزادی کے راستے میں پڑتا تھا۔

ابو دروازہ کھولنے گئے اور واپس آئے تو بجائے رابعہ کے اُن کے ساتھ ہنستا کھلکھلاتا کبیر تھا۔

اماں تو کبیر کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئیں۔ پھوپو بھتیجا گلے ملے تو جدا ہونا یاد نہ رہا۔ اماں تو اُس سے مل مل کر سیر نہیں ہو رہی تھیں۔ بوسے لے لے کر اُس کا منہ لال کر دیا تھا۔ کبیر بھی شاداں و فرحاں پھوپو کی محبتیں سمیٹ رہا تھا۔ شہزادی اندر کمرے سے محبتوں کے اِس مظاہرے کو دیکھ دیکھ کر کُڑھ رہی تھی جبکہ فائزہ کچن سے باہر آ کر کبیر سے سلام دعا کرنے لگی۔ فائزہ سے مل کر اُس نے نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے وہ بلی...... نظر نہیں آ رہی۔''

کمرے میں اکڑی شہزادی کو اُس کی بات پر زور کا غصہ آیا۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ خود ہوگا نابلا...... وہ بے کار میں ایک جگہ سے چیزیں اُٹھا کر دوسری جگہ رکھنے لگی۔ نہ باہر نکلنے کو دل کر رہا تھا نہ اُس سے ملنے کو من کر رہا تھا۔

اس دوران داخلی دروازے کی گھنٹی دوبارہ بڑے زور سے بجی۔ شہزادی منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

یقیناً رابعہ ہوگی۔ وہ کندھے پر بیگ لٹکا کر عجلت میں کمرے سے نکلی اور کبیر کو سرسری سا سلام کر کے تیزی سے گھر سے نکل گئی۔ اماں کو شرمندگی ہوئی کہ اُس نے کبیر کو بالکل اگنور کیا تھا جبکہ کبیر حیرانی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ فائزہ نے ساری سچویشن سمجھ لی تو بولی۔

''وہ...... شہزادی کو کالج سے دیر ہو گئی تھی۔ دروازے پر اُس کی دوست اُسے لینے آئی تھی۔ اِس لیے عجلت میں گئی ہے۔ کبیر کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

اماں اب بھی غصے اور شاک کی کیفیت میں تھی۔ ابو کبیر سے اجازت طلب کر کے دوکان کے لیے نکل گئے۔ کبیر اماں سے کہہ رہا تھا۔

''پھوپو...... مجھے ناشتہ کرنا ہے۔ میں نہا کر فریش ہوتا ہوں پھر آپ کے ہاتھ کے پراٹھے کھاؤں گا لیکن دیکھیے فائزہ سے پراٹھے مت پکوایئے گا۔''

''ارے نہیں بیٹا......'' اماں کی تھوڑی دیر والی کیفیت پل بھر میں دور ہو گئی وہ فائزہ کو ہدایات دینے لگیں۔

''نیا صابن اور ٹوتھ پیسٹ نکال کر غسل خانے میں رکھ دو...... میری الماری سے وہ بڑا والا تولیہ بھی نکال لینا جو میں نے خاص کبیر کے لیے رکھا ہے۔''

خود وہ پاؤں میں چپل اڑس کر تیز تیز کچن کی طرف چل دیں۔

شہزادی کالج سے گھر لوٹی تو گھر میں کھانوں کی خوشبوئیں چکراتی پھر رہی تھیں۔ عام حالات میں اِس طرح کی خوشبوؤں نے کبھی استقبال نہیں کیا تھا۔ اماں اور فائزہ دونوں کچن میں تھیں۔ اماں جب تک کبیر کے لیے خود کھانا تیار نہ کرتی اُن کی تسلی ہی نہ ہو پاتی۔ شہزادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ آج کھانوں کی خوشبوئیں اُسے ذرا بھی نہیں بھا رہی تھیں ورنہ وہ تو کھانے کی بڑی شوقین تھی اور گھر میں جب بھی کوئی اچھی چیز پکتی تو وہ کالج میں خوش ہوتی رہتی کہ آج گھر جا کر اچھا کھانا

کھانے کو ملے گا لیکن آج اُس کے دل کو کچھ نہیں بھا رہا تھا۔

یونیفارم بدل کر اُس نے لون کا سادہ سا سوٹ پہن لیا اور کمرے میں خوامخواہ خود کو مصروف کرلیا۔ آج تو جیسے بھوک ہی مرگئی تھی۔ اِس دوران فائزہ کمرے میں آگئی تو اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ارے...... تم کب آئی ہو...... تمہارے آنے کا پتا ہی نہیں چلا کچن میں آؤ نا...... بڑے مزے کی چیزیں بنی ہیں۔ اماں نے نرگسی کوفتے بنائے ہیں اور میں پلاؤ کو دم دے کر آرہی ہوں۔"

"نہیں فائزہ...... میں بہت تھک گئی ہوں۔ اُس نے اپنے من پسند کھانوں کا سُن کر بھی کوئی جوش وخروش نہیں دکھایا۔ بے دلی سے بولی۔

"میرا کھانا پلیز یہاں لے آؤ۔"

"اچھا......!" فائزہ فوراً مان گئی۔ لیکن پلاؤ دم ہونے میں ٹائم لگے گا۔ چپاتی بنالو کوفتوں کے ساتھ...... میری اچھی بہن...... شہزادی کے کہنے پر فائزہ سراثبات میں ہلاتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔

آج اپنی پسندیدہ ڈش کھاتے ہوئے بھی شہزادی کو مزہ نہیں آرہا تھا۔ آج گھر میں ٹکنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اِس بالشت بھر کے گھر میں وہ کبیر سے کہاں چھپ سکتی تھی۔ جبکہ اُسے دیکھ کر اُس کے دل میں غصے کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑکنے لگتی۔ اِس نے پل بھر میں کہیں جانے کے بارے میں سوچا اور دوسرے لمحے کتابیں اُٹھا کر باہر آگئی۔ اماں بدستور کچن میں تھیں۔

"اماں...... میں رابعہ کے گھر پڑھنے جارہی ہوں۔" وہ کچن کے دروازے میں کھڑی ہوکر اماں سے مخاطب ہوئی اماں نے اُس کی بات سنی اَن سنی کردی۔ اماں کی ناراضگی کی یہی نشانی ہوتی تھی کہ وہ بات کرنا چھوڑ دیتی تھیں۔ شہزادی کو حیرت ہوئی کہ اماں کس بات پر ناراض ہیں جبکہ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ شہزادی کو کوشش کے باوجود اپنی کوئی بات یاد نہ آئی تو وہ حیرت سے بولی۔

"کیا ہوا اماں...... کوئی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے۔"

"تیری غلطیوں کی تو اتنی لمبی فہرست ہے کہ گنوانے بیٹھوں تو صبح سے شام ہوجائے۔" اماں تلخی سے بولی۔

"لیکن تُو اتنی ڈھیٹ ہے کہ اپنی غلطی مانتی کب ہے۔"

"پھر بھی اماں...... پتا تو چلے کہ میں نے کیا کیا ہے۔" وہ عاجز آکر بولی۔

"صبح کیا کیا تھا...... کبیر سے کس طرح ملی تھی تم...... گھر آئے مہمان کی یہ عزت ہے تمہاری نظر میں...... ایک تو وہ اپنی جہازی کوٹھی سے اُٹھ کر ہمارے اِس جھونپڑے میں آتا ہے۔ اور یہاں تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے، اور تم تو کچھ کرتی نہیں ہو اُس کے لیے...... کم سے کم بات تو اچھی طرح کرسکتی ہو۔"

"اوہ......" ساری بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ منہ پھلا کر بولی۔

"اماں...... کالج کو دیر ہورہی تھی۔ رابعہ میرے پیچھے آگئی تھی۔ آپ کو نہیں پتہ...... اُس نے مجھے کتنی سنائی ہیں۔ کالج ساتھ نہ جانے کی دھمکی دی ہے۔ مجھے بہت جلدی تھی۔ ویسے سلام تو میں نے کیا تھا۔"

"بڑا احسان کیا تھا۔" اماں جل کر بولیں۔

''اِس لٹھ مار انداز میں سلام کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ وہ تمہارے سلام کا بھوکا نہیں تھا۔''

''اماں......اماں...... جب آپ کبیر کے گھر جاتی ہیں تو ماموں ممانی آپ کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اپنا وقت تک آپ کو نہیں دیتے۔ آپ نوکروں کے رحم و کرم پر رہتی ہیں۔ کیا آپ نوکروں سے ملنے جاتی ہیں۔ اُس نے اپنے طور پر اماں کو آئینہ دکھایا لیکن وہ اماں ہی کیا جو کوئی بات سمجھ لے۔

''وہ میرا مسئلہ ہے...... تمہارا نہیں۔'' اماں بے رحمی سے بولیں۔

''وہ میرا بھتیجا ہے...... بلکہ بیٹا ہے میرا...... میں اُس پر اپنی اولاد کو بھی وار سکتی ہوں...... یہ سُن لو، آج اچھی طرح۔'' اماں نے دوٹوک بات کی اور شہزادی کے سینے میں جیسے خنجر کی آنی گڑ گئی۔

ان ہی محبت کے مظاہروں سے تو اُن کی جان جاتی تھی۔ اُسے شدید غصہ آتا تھا۔ آخر ماموں ممانی بھی تو انہیں اِس طرح پیار کر سکتے تھے جیسے اماں اپنے بھتیجے سے کرتی تھیں۔ اگر وہ ماموں ممانی کے لیے سوتیلی تھیں تو کبیر کیوں اُن کی ماں کے لیے سگا تھا۔ اُس کا گلہ آنسوؤں کے بوجھ سے بند ہونے لگا تو وہ واپس کمرے میں آ گئی۔ رابعہ کے گھر جانے کو اُس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنے بیڈ پر اوندھی لیٹی وہ اماں کی باتوں پر کڑھ رہی تھی کہ کبیر کے با آواز بلند اسلام علیکم نے اُسے باور کرا دیا کہ وہ گھر آ چکا ہے۔ وہ اماں سے اُسی لاڈ پیار کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''پھوپو بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے...... یہ بتائیں آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے میرے لیے کیا پکایا ہے۔''

''میری جان...... میری چندا...... تمہارے لیے تمہاری پسند کے نرگسی کوفتے اور پلاؤ بنایا ہے۔ یہ محبت سے لبریز آواز اماں کی تھی۔

''لیکن پھوپو...... آپ سے تو میں نے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر نے مجھے گوشت' قیمہ اور چکن...... سب کھانے سے منع کیا ہے۔ دراصل میرا ایورک ایسڈ بہت ہائی تھا...... مجھے صرف سبزیاں کھانے کی اجازت ہے۔

''کچھ نہیں ہوتا میری جان۔'' اماں بولیں۔

''آج تیرا پہلا دن ہے۔ کیا آج ہی تیرے سامنے سبزیوں کا مغلوبہ بنا کر رکھ دیتی۔''

''لیکن پھوپو...... بس ایک بار...... ایک بار آپ کی خاطر یہ سب کھا لوں گا۔ اِس کے بعد نہیں ...... اور ہاں، ایک سبزی روزانہ بنائیں۔ دو یا تین ڈشز کی مجھے عادت نہیں ہے۔ باہر کے ملکوں میں سبزیاں بڑی مہنگی اور نایاب ہیں۔ اور جب خود پکانی پڑ جائے تو بندہ چاہتا ہے کہ ایک ڈش کے بغیر اگر ہاف ڈش بنانی ہوتی تو زیادہ اچھا ہوتا...... وہ اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑا جبکہ اندر لیٹی شہزادی نے تلملا کر سوچا۔

''نخرے دیکھو نواب زادے کے...... یہ بناؤ...... یہ مت بناؤ، اچھی دھونس ہے۔ ایک بار پھر اُسے شدت کا رونا آیا۔ باہر کھانا لگ چکا تھا۔ ابو بھی آ چکے تھے۔ کبیر کو سب کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانے میں مزہ آتا تھا۔ اب بھی جب سب بیٹھ چکے تو اُس نے پوچھا۔

''شہزادی کھانا نہیں کھائے گی کیا؟''

''وہ کھا چکی ہے۔'' اماں کے جواب پر وہ فوراً بولا۔

''ارے...... یہ کیا...... اکیلے اکیلے کھا چکی ہے۔'' اماں تو چپکی ہو رہی جبکہ فائزہ بولی۔

''اُسے شدت کی بھوک لگی تھی۔ کالج میں بھی

کچھ نہیں کھاتی، اس لیے پہلے کھالیا، آج اُس کے سر میں بھی درد تھا۔'' شہزادی اندر بیٹھی جل بھن رہی تھی۔ خود سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں کھاتی، میری مرضی ان تاویلوں اور جوازوں کی کیا ضرورت ہے۔'' اُسے فائزہ پر غصہ آرہا تھا۔

'' میری صفائیاں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی صفائیاں دیا کرو۔ تمہارا اور اماں کا سگا ہے وہ، اب کے بار جاؤ تو خدا کرے ماموں ممانی ڈنڈوں سے تواضع کریں۔ وہ جل کر کباب ہوئی جارہی تھی اور خود سے بول بول کر اپنے اندر کا زہر کم کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

لیکن ایک دن بعد خود ہی اُس کا غصہ کم ہوگیا۔ کچھ اماں کا لحاظ تھا۔ سو وہ سب کے ساتھ باہر آکر بیٹھ جاتی تھی۔ کبیر سے بھی بات چیت ہوجاتی وہ اُس کی پڑھائی کے متعلق پوچھتا۔ وہ مختصراً جواب دے دیتی۔ اماں اِسی پر خوش تھیں کہ وہ کم ازکم کبیر کے ساتھ بیٹھتی تو تھی۔ اُس دن اتوار تھا۔ شہزادی اپنے کمرے سے باہر نکلی تو ناشتہ تیار تھا۔

''آؤ...... شہزادی ناشتہ تیار ہے۔'' فائزہ نے آملیٹ کی پلیٹ دستر خوان پر رکھتے ہوئے کہا۔ کبیر ہنس کر بولا۔

''زہے نصیب...... آج شہزادی ہمارے ساتھ ناشتہ کرے گی۔'' شہزادی سمٹ کر اماں کے پاس بیٹھ گئی۔ فائزہ نے شہزادی کے آگے پراٹھا رکھا اور کپ میں اُس کے لیے چائے ڈالنے لگی۔ کبیر اُس کی یہ خاطر تواضع دیکھ کر رہ نہ سکا اور ہنس کر بولا۔

''واہ فائزہ...... تم نے تو شہزادی کو سچ مچ کسی سلطنت کی شہزادی بنا رکھا ہے۔ اتنی کیئر کرتی ہو اِس کی۔''

''ہاں نا......'' فائزہ مگن انداز میں بولی۔

''میں اِس سے محبت جو بہت کرتی ہوں۔''

''یہ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جیسے تم کرتی ہو۔'' کبیر نے پوچھا تو فائزہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... یہ مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتی...... بلکہ سرے سے محبت نہیں کرتی۔''

اماں ابو کے ساتھ ساتھ شہزادی نے بھی چونک کر فائزہ کی طرف دیکھا۔ اماں تو ہنس پڑیں جبکہ ابو محبت سے دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ارے میاں...... کیوں میری بیٹیوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کررہے ہو۔ میری دو بیٹیاں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی ہیں۔''

کبیر ہنس پڑا۔ فائزہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ گرم گرم پراٹھا پکا کر لانا تھا لیکن شہزادی نہ تو ہنسی نہ مسکرائی وہ سوچنے لگی کہ فائزہ نے ایسا کیوں کہا ہے؟ شاید مذاق میں کہا ہو شاید نہیں بلکہ یقیناً مذاق میں کہا ہوگا۔ شہزادی نے اپنے دل کو بہلایا۔ اور اطمینان سے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔ اِس دوران سبزی والے کی صدائیں سنائی دیں۔

''ارے......'' اماں بولیں۔

''کبیر کے لیے سبزی بنانی ہے دوپہر میں۔'' اماں کبیر سے پوچھنے لگیں۔

''کیا پسند ہے بیٹا سبزی میں......؟'' کبیر نے کان لگا کر سنا۔ سبزی والا اب اُن کے دروازے کے بالکل پاس آگیا تھا اور پوری طاقت سے آوازیں لگا رہا تھا۔

''کریلے 50 روپے کلو، بھنڈی 20 روپے

کلو......"

"پھوپو...... بھنڈی لے لیں...... اچھی سبزی ہے۔" وہ جلدی سے بولا مجھے پسند بھی ہے۔

شہزادی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ معلوم نہیں اُسے سچ مچ بھنڈی پسند تھی یا پھر سستی ہونے کی بنا پر اُس نے بھنڈی کا انتخاب کیا تھا۔

شہزادی کو پہلی بار لگا کہ وہ اُس کے ماں باپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یا پھر شہزادی کو ایسا لگا تھا۔ اماں سبزی کی ٹوکری اُٹھا کر سبزی والے سے سبزی لینے چل دی۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ کبھی ابو کو مخاطب کرتا کبھی فائزہ کو اور کبھی شہزادی کو۔

اگلے دن وہ کالج سے گھر لوٹی تو راحیل کی ماں بہنیں آئی تھیں۔ شہزادی کو لگا جیسے اُس کے حلق میں تلخی بھر گئی ہو۔ بادل نخواستہ انہیں سلام کیا اور بغیر رُکے سیدھی کمرے میں گھس گئی۔ دل ہی دل میں وہ بری طرح تلملا رہی تھی۔

"یا اللہ...... ان لوگوں جیسا ثابت قدم نہیں دیکھا آج تک۔" شہزادی نے سوچا۔ ہر بار انہیں انکار کیا جاتا ہے اور چند دن بعد یہ پھر حاضر ہو جاتے ہیں۔ کیا مصیبت ہے۔ اُس کا دل اپنا ماتھا پیٹنے کو چاہا۔ وہ لوگ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے۔

اِس دوران شہزادی کمرے میں بند رہی۔ اِس وقت کبیر باہر سے آیا تو سیدھا اماں کے پاس برآمدے میں آ گیا۔

"پھوپو...... یہ خواتین کون تھیں۔ جو ابھی یہاں سے نکل کر گئی ہیں۔" اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"پڑوس کی ہیں۔ شہزادی کا رشتہ مانگنے آئی ہیں۔"

"شہزادی کا رشتہ......؟" اُس کی انتہائی حیرت بھری آواز شہزادی کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہاں...... مہینے میں دو بار باقاعدگی سے آتی ہیں منت سماجت کرتی ہیں۔ سو بار انکار کر چکے ہیں لیکن وہی ڈھاک کے تین پات پھر آ جاتی ہیں مطالبہ لے کر۔" اماں کا لہجہ بے زاری لیے ہوئے تھا۔

"کیوں...... کیا رشتہ آپ کی پسند کا نہیں ہے؟" کبیر نے اپنی معلومات بڑھائیں۔

"پسند کی بات نہیں ہے...... اچھا لڑکا ہے...... اکلوتا ہے...... اپنا گھر ہے...... تین بہنیں ہیں، خود لڑکے کی چھوٹی سی دکان ہے جوتوں کی تیرے پھوپا کے دوکان کے قریب ہی اُس کی دکان ہے۔ تیرے پھوپا کہتے ہیں سارے بازار میں راحیل کی شرافت اور اخلاق کی دھوم ہے۔ دس جماعتیں پڑھا ہوا ہے۔" کبیر کو جیسے صدمے سے کچھ ہونے لگا وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔

"دکاندار...... 10 جماعتیں پڑھا ہوا۔" اُس نے جیسے خود سے دہرایا۔

"تو اور کیا......" اماں بولیں۔

"ہم جیسوں کے لیے ہمارے جیسے رشتے ہی آئیں گے نا بیٹا...... اب دکاندار کے گھر کوئی سیٹھ تو رشتہ لے کر نہیں آئے گا۔"

"لیکن پھوپو......" وہ جلدی سے احتجاجاً بولا۔

"شہزادی ایم اے کر رہی ہے۔ اور پھر شہزادی تو سچ مچ کی شہزادی ہے۔ آپ خود بتائیں۔ کیا وہ کسی دکاندار کے ساتھ ساری زندگی گزار سکتی ہے جو تعلیم میں بھی اُس کا ہم پلہ نہ ہو۔" اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

یہ سب باتیں رہنے دو...... ہمارے جیسے گھرانوں میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں سنی دیکھی جاتیں۔ بس ہمارے لیے اعتراض والی بات یہ ہے کہ ہم بڑی سے پہلے چھوٹی کو نہیں بیاہ سکتے جبکہ انہیں شہزادی میں دلچسپی ہے کیوں...... شہزادی میں کیوں؟ جانے کیوں وہ بات کو بڑھاوا دے رہا تھا۔

لڑکے نے کہیں شہزادی کو دیکھا ہے سو وہ بہنوں کے پیچھے پڑا ہے کہ وہ شادی کرے گا تو شہزادی سے کرے گا۔ اپنے محلے کا لڑکا ہے۔ کہیں کالج آتے جاتے شہزادی پر نظر پڑی ہوگی۔ اماں بے پروائی سے بولیں جبکہ شہزادی نے سنا کبیر اماں سے کہہ رہا تھا۔

''اچھی دھونس ہے۔ شہزادی کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے کیا......''

''پھوپو آپ دوٹوک جواب دے دیں۔ آپ کی نرمی دیکھ کر ہی وہ ہر دوسرے دن آجاتے ہیں۔ آپ سختی کریں یا مجھے چھوڑ دیں کہ میں اُن سے دو دو ہاتھ کرلوں۔''

وہ انتہائی غصے میں لگ رہا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ شہزادی کو اُس کے غصے پر غصہ آجاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شہزادی کے اندر میٹھی میٹھی سی ٹھنڈک اتر گئی۔ جانے کیوں اُسے کبیر کا اِس استحقاق سے بات کرنا اچھا لگا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا جب اُس کے دل نے کبیر کے لیے مثبت انداز میں سوچا تھا۔ کوئی تو ہے جو ہمارے لیے بات کرسکتا ہے۔ ہمارے لیے سوچ سکتا ہے۔ شہزادی کی آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہوگئیں۔

اُس دن بارش برس رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے بارش کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اچانک آسمان بادلوں سے بھر گیا اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ ابو ابھی دوکان سے نہیں لوٹے تھے۔ اماں آج پڑوس میں کسی شادی پر گئی تھیں۔ شہزادی نے برستی بارش کو تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں تو نبیلہ کے گھر جا کر پھنس گئی ہے۔''

''واہ...... کیسے پھنس سکتی ہے میری پھوپو، میں ابھی جا کر لے آتا ہوں۔''

جانے کبیر کہاں سے نمودار ہوا تھا کہ اُس نے شہزادی کی خود کلامی سن لی تھی۔ کبیر شہزادی سے کہنے لگا۔

''شہزادی...... مجھے چھتر دے دو...... میں پھوپو کو لے آتا ہوں چھوڑیں بھیگ جائیں گے آپ، زور کی بارش ہے۔''

لیکن کبیر نے اُس کی بات سنی ان سنی کی اور کونے میں ٹنگی ہوئی چھتری اُٹھا کر چلتا بنا۔ جاتے جاتے فائزہ سے کہنے لگا۔

''فائزہ...... چائے کے ساتھ پکوڑے بنالینا۔ میں بس ابھی گیا اور ابھی آیا۔''

اُس کے جانے کے بعد چارپائی پر رکھا اُس کا موبائل بجنے لگا۔ کچھ دیر تو شہزادی نے نظرانداز کیا لیکن جب مسلسل بجنے لگا تو بادل نخواستہ شہزادی نے موبائل کان سے لگالیا۔ ابھی اُس نے ہیلو نہیں کہا تھا کہ دوسری طرف سے ممانی کی آواز سنائی دی۔

''کبیر کیا بات ہے کیا ہوا تمہیں...... موبائل کیوں اٹینڈ نہیں کر رہے تھے؟ یہ بتاؤ کب آؤ گے تم کتنے دن ہوگئے ہیں تمہیں گئے ہوئے اب بھی پھوپو کی محبتوں سے تمہارا دل نہیں بھرا یہ بھی نہیں سوچتے کہ تمہارے ماں باپ کو بھی تمہاری یاد آتی ہوگی اُن کا بھی تم پر کوئی حق ہے۔

اِس دوران کبیر بھیگتا بھاگتا کمرے میں آیا تو شہزادی نے اُسے موبائل تھما دیا۔ وہ سوالیہ انداز

میں شہزادی کو دیکھتے ہوئے ماں کی باتیں سننے لگا۔

شہزادی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فائزہ نے اندر آ کر کبیر سے اماں کے بارے میں پوچھا۔

"وہ اہل خانہ اماں کو بغیر کھانا کھائے آنے نہیں دے رہے تھے۔" کبیر موبائل کا بٹن آف کر کے کہنے لگا۔ فائزہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میں پکوڑے بناتی ہوں۔"

"شہزادی...... بھئی آ جاؤ، بارش چائے اور پکوڑے بہت مزہ کریں گے۔"

شہزادی آ کر بیٹھ گئی تو کبیر اُس سے کہنے لگا۔

"شہزادی! بڑے دنوں سے تم سے ایک بات کرنی تھی۔" شہزادی نے حیرت سے اُسے دیکھا لیکن اُس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

"شہزادی...... شاید یہ بات میں تمہیں آج بھی نہ بتاتا اگر اس کی ضرورت نہ محسوس کرتا۔" وہ سانس لینے کے لیے رُکا، اُس کے حیرت بھرے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"یہ آج کی رُوداد نہیں ہے میں جب پہلی بار پھوپو سے ملنے آیا تھا تو تمہیں دیکھنے کے بعد دل نے تمہیں اپنا مان لیا تھا۔ لیکن تمہیں کچھ کہنے کی ہمت کبھی نہیں کر سکا اس لیے کہ میں نے تمہارے رویے سے محسوس کیا تھا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتی۔"

اس انکشاف سے جہاں شہزادی کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے تھے دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا وہاں اُسے اِس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اُسے کبیر کی بات پر غصہ نہیں آیا۔ اُسے برا نہیں لگا بلکہ اُسے اچھا لگ رہا تھا۔ سکون آور لہریں اُس کے اندر دوڑ رہی تھیں تو کیا وہ بھی اس جذبے کی اسیر بن گئی تھی جس کا قیدی کبیر تھا۔

اُسے اپنے آپ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ شرمانے والی ہستی نہیں تھی۔ بڑی بولڈ تھی وہ اور مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادی تھی۔ لیکن اس وقت کبیر کی طرف دیکھنا بھی اُسے محال لگ رہا تھا۔ کبیر نے اپنی بات کو بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔

میں جب پاکستان سے واپس جاتا تو تمہاری یادیں میرے ہمراہ ہوتیں میں جب دوبارہ پاکستان آتا تو اِس امید پر آتا کہ شاید تمہاری نظر میں میری اہمیت بڑھ چکی ہوگی لیکن...... ہر بار مجھے مایوسی ہوتی تمہاری نفرت جوں کی توں ہوتی اور میں اظہار کی ہمت اپنے اندر نہ پاتا اور خاموشی سے لوٹ جاتا لیکن اب میں مزید خاموش نہیں رہ سکتا تھا کہ اگلی بار میری تعلیم کمپلیٹ ہو رہی ہے میں مستقبل آ جاؤں گا تو ممی میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر رہیں گی۔ اور تمہاری رضا مندی کے بغیر میں ممی کو تمہارا نام نہیں بتا سکتا۔

سو آج اپنے دل کی حالت تمہیں بتانا ناگزیر تھا اور اب مجھے تمہارا جواب لینا ہے۔ اور ہاں یہ بھی بتاؤ کہ آخر تمہارے مجھ سے اِس رویے کا مطلب کیا ہے؟"

شہزادی جو دھک دھک کرتا دل لیے خاموش بیٹھی تھی۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ کبیر سینے پر ہاتھ باندھے بڑی گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا آج اُس کے دیکھنے کا انداز ہی کچھ اور تھا اُس کی بھوری آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اٹھا کر اپنے دل میں چھپا لے۔ آج اُس کے سارے چھپے جذبے عیاں ہونے جا رہے تھے۔

شہزادی...... پلیز...... ابھی فائزہ کچن سے آ جائے گی۔ پھوپو آ جائیں گی مجھے اپنی باتوں کا جواب چاہیے۔ پلیز شہزادی اُس کی آواز میں منت تھی۔

''کبیر......'' وہ بڑی دیر بعد بولی۔

''جس راہ پر ہم ابھی چلے نہیں ہیں اُسے چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ ممانی ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گی۔''

''شہزادی......'' کبیر احتجاج کے انداز میں بولا۔

''میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں پوچھی تمہارے دل کی بات پوچھی ہے۔ تمہارے رویے کے بارے میں پوچھا ہے۔ مجھے اُس کا جواب دو۔''

''کبیر...... تم اچھے انسان ہو تمہارا ساتھ کسی بھی لڑکی کے لیے خوش نصیبی کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن...... تم سے میرے غلط رویے کا مطلب یہ ہے کہ ماموں ممانی نے کبھی ہمیں انسان بھی نہیں سمجھا۔ ہمیں زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے ہی سمجھا ہے۔ تم سے گریز کا مطلب یہ تھا کہ تم چونکہ اُن کی اولاد ہو اس لیے تم بھی ایسے ہی ہو گے۔

لیکن شہزادی...... ہر انسان اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہوتا ہے کیا تم نے کبھی اور کسی موقعے پر یہ محسوس کیا ہے کہ میں غلط ہوں۔ وہ سوالیہ انداز سے ڈائریکٹ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہاں......'' شہزادی بغیر جھجکے بولی۔

''کیا تم اپنے ماں باپ سے پھوپو کی حمایت میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیا تم انہیں سمجھا نہیں سکتے تھے کہ تمہاری پھوپو کا یہی ایک سگا رشتہ ہے جس پر وہ جان دیتی ہیں۔ تو انہیں بھی اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔ کبیر...... خیال رکھنے سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ ہماری مالی مدد کریں لیکن...... وہ ہم سے محبت تو کر سکتے ہیں وہ خوشی غمی کے موقعے پر ہماری خیر خبر تو لے سکتے ہیں۔ جب اماں اُن کے گھر جائیں تو وہ اُن کو محبت اور اہمیت تو دے سکتے ہیں۔ اُس کا لہجہ بات کرتے کرتے بھرا گیا۔ وہ رُندھے لہجے میں بولی۔

جب اماں بیمار پڑی تھیں تو انہیں بھائی بھابی کا کتنا انتظار تھا۔ تم وہ درد محسوس نہیں کر سکتے کبیر...... جو میں نے محسوس کیا ہے۔ اُن کے نہ آنے پر اماں کی مایوسی کو میں نے محسوس کیا ہے تو پھر بتاؤ...... تم سے کیسے میرا رویہ ٹھیک رہ سکتا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شہزادی، کبیر حد درجہ اُداسی سے بولا۔

''لیکن تمہارا تجزیہ غلط ہے میں نے ممی اور پاپا کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے منت سماجت سے...... لڑائی جھگڑا کر کے...... لیکن...... بڑوں سے زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اِس سلسلے میں خود کو مجبور ہی سمجھا۔

''اس لیے تو کہہ رہی ہوں کبیر......'' شہزادی سنجیدگی سے بولی۔

''کہ اپنے بڑھتے پیر پیچھے ہٹا لو...... ماموں اور ممانی دونوں اِس رشتے کے لیے کبھی نہیں مانیں گے۔ اور میری اَنا کبھی یہ گوارا نہیں کرے گی کہ میں ناپسندیدہ بہو بن کر اُس گھر میں جاؤں۔''

کبیر دھیمی آواز میں جذبوں سے بھرپور آواز میں بولا۔

''تم یہ سب میرے لیے رہنے دو...... تم بس اپنے دل کی بات بتا دو۔ وہ بڑی محبت سے تمہیں اپنی بہو بنا کر لے جائیں گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ

ہے شہزادی کا رنگ مارے حیا کے سرخ پڑ گیا۔ اُس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔

اُس کے چہرے پر قوس وقزح کے سارے رنگ بکھر گئے۔ اُس کے انکار میں بھی اقرار تھا اُس کی ناں میں بھی ہاں تھی۔ مارے خوشی کے کبیر پاگل ہونے لگا۔ اُس نے جذبوں سے لبریز آواز میں کہا۔

''شہزادی...... تمہارا شکریہ...... تم نے میرے جذبوں کی مان رکھ لی۔'' اس دوران فائزہ ٹرے میں بھاپ اڑاتی چائے اور گرما گرم پکوڑے لے کر آ گئی۔ شیٹ بچھا کر وہ کبیر سے کہنے لگی۔

''میں جانتی تھی کبیر...... کہ شہزادی تمہیں کمپنی نہیں دے سکے گی اس لیے تو تم دونوں خاموش بیٹھے ہو......'' کبیر بڑے ترنگ سے بولا۔

''بڑے مزے کی بارش ہو رہی ہے فائزہ...... بلکہ آج کی یہ خوبصورت بارش تو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔'' وہ میٹھی میٹھی نظروں سے شہزادی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ شہزادی نے نظریں چرائیں اور آگے بڑھ کر چائے بنانے لگ گئی۔

رابعہ کو ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ شہزادی کو کالج اکیلا جانا پڑ رہا تھا۔ کالج زیادہ دور تو نہیں تھا پھر بھی شادی کو اکیلے جاتے ہوئے بوریت ہوتی تھی۔ کالج تک کا راستہ وہ اور رابعہ باتوں میں گزار لیتیں راستہ کٹنے کا علم ہی نہ ہو پاتا اور کالج کا گیٹ آ جاتا۔ لیکن جب سے وہ اکیلی کالج جا رہی تھی تو راستہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہو جاتا، آج بھی اپنے پاؤں گھسیٹے وہ سوچ رہی تھی کہ جانے کب رابعہ ٹھیک ہو گی اور اُس کی بوریت کا خاتمہ ہو گا کہ کسی کے قدموں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا اُس نے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کبیر تیز تیز قدم اٹھاتے اُس تک پہنچ گیا تھا۔

''تم......؟'' اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں...... کوئی اعتراض ہے کیا میرے آنے پر؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''بالکل اعتراض ہے۔'' وہ کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بولی۔

''لیکن میں تمہارے اعتراض کو خاطر میں نہیں لانے والا......'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آرام سے بولا۔

''کیوں بھلا؟'' وہ بھنویں اُچکا کر اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اس لیے کہ گھر میں تو تم سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔'' کبیر منہ بنا کر بولا تو وہ حیرت سے کہنے لگی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم...... ابھی صبح ہی تو اکٹھے ناشتہ کیا تھا میں اِس کو ملنا نہیں سمجھتا......'' وہ بولا۔

''10 لوگوں کی موجودگی میں بندہ کیا کہہ سکتا ہے۔ کیسے اپنے دل کی بات کر سکتا ہے۔ اور پھر دسترخوان پر...... جہاں صرف کھانوں کی باتیں ہوتی ہیں۔'' اُسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اب مجھے تم سے کوئی دو اور دو چار قسم کی فارمولا باتیں نہیں کرنی یا بزنس کے داؤ پیچ کے متعلق، یا سیاست پر کوئی بات نہیں کرنی، شہزادی تم سمجھتی کیوں نہیں۔'' وہ عاجز آ کر بولا تو شہزادی کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب سا تبسم پھیل گیا۔

''پھر...... تمہیں کون سی باتیں کرنی ہیں۔'' وہ شرارت سے بولی تو وہ برجستہ بولا۔

''محبت کی باتیں...... پیار کی باتیں...... زندگی کو ایک ساتھ گزارنے کے منصوبے......

مستقبل کی باتیں...... تم کیا جانو تمہارے ساتھ کرنے کے لیے میرے پاس کتنی باتیں ہیں۔ وہ جذبوں سے لبریز آواز میں بولا تو شہزادی باوجود بولڈ ہونے کے بری طرح شرما گئی۔ لیکن یہ خوش کن کیفیت بس چند لمحے کے لیے تھی۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کبیر...... میں نے پہلے بھی تمہیں وارن کیا تھا کہ وقت پر اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لو...... اب پھر کہہ رہی ہوں تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے والدین ایسا کبھی نہیں چاہیں گے۔ سو اچھا ہے کہ اُس راستے پر چلا ہی نہ جائے جس کی منزل کھوٹی ہو۔'' کبیر تیز نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہماری محبت کو منزل نہیں ملے گی میں نے محبت کی ہے تو اِسے منزل پر پہنچا کر دم لوں گا۔ تم یہ ساری فکریں میرے لیے رہنے دو۔'' موبائل کی تیز گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔ کبیر نے موبائل نکال کر کانوں سے لگایا۔

''جی ممی...... کیسی ہیں آپ؟ وہ سلام کرنے کے بعد بولا پھر کچھ دیر دوسری طرف کی باتیں سنتا رہا۔ پھر بولا۔

''بس دو دن بعد آجاؤں گا ممی...... ابھی تو بہت ساری چھٹیاں رہتی ہیں۔''

کچھ دیر دوسری طرف کی باتیں سننے کے بعد اُس نے فون بند کر لیا شہزادی کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

''یار...... یہ والدین کو اولاد اتنی یاد کیوں آتی ہے۔ کیا ہم کو بھی اپنے بچے اس طرح یاد آیا کریں گے۔''

وہ اُس کی طرف جھک کر شرارت سے بولا تو شہزادی سرخ پڑ گئی۔ سامنے کالج کا گیٹ نظر آرہا تھا وہ تقریباً بھاگ کر کالج کے گیٹ میں گھس گئی۔

کبیر کافی دیر کالج کے گیٹ پر نظریں جمائے وہیں کھڑا رہا جبکہ اُس دن شہزادی کبیر کی باتیں یاد کر کر کے ایک انجانی سی خوشی محسوس کرتی رہی اگرچہ اس خوشی میں ماموں اور ممانی کی طرف سے جو دھڑکا لگا تھا وہ ہنوز برقرار رہا۔ کبیر کی یقین دہانی بھی اُسے ختم کرنے میں ناکام رہی تھی۔

شہزادی کو اب معلوم ہو گیا تھا کہ نفرت اور محبت کے بیچ بہت تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے تبھی تو کبیر سے اُس کی محبت کا یہ عالم ہو گیا کہ دن رات وہ اُسی کو سوچتی رہتی۔ کبیر کا اپنے گھر جانے کو من نہیں کر رہا تھا وہ آج کل پر اپنے والدین کو ٹالے جا رہا تھا۔ اُس دن وہ گھر میں گھسا تو اندر سے آتی آوازوں نے اُسے ٹھٹک کر رُکنے پر مجبور کیا شہزادی احتجاج کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''اماں...... آپ کو ایک رنڈوا مرد 4 بچوں کا باپ...... کیا اِس قابل نظر آتا ہے کہ اُس کا رشتہ فائزہ کے لیے قبول کیا جائے۔'' اماں کی تھکی تھکی آواز کبیر کے کانوں سے ٹکرائی۔

''جب ڈھنگ کا کوئی رشتہ نہیں آئے گا تو مجبوراً ایسا رشتہ قبول کرنا پڑے گا۔''

''ایسی کیا مجبوری ہے۔'' شہزادی تیز آواز میں بولی۔

''کیا آپ اُس کے کھانے پینے سے تنگ ہیں۔ اُس کا کپڑا لتا آپ پر بوجھ ہے۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے جو آپ اُسے اپنے ہاتھوں کھائی میں دھکیل رہی ہیں۔''

''عمر نکلی جا رہی ہے اُس کی...... تمہیں بھی بیاہنا ہے میں اور تمہارے ابو سدا زندہ نہیں رہیں گے۔ ہمارے بعد کیا کرو گی تم دونوں...... ایک بھائی ہی ہوتا تم لوگوں کا...... تو میں بے فکر ہو کر

مر جاتی۔'' اماں کی آواز میں دنیا بھر کی یاسیت سما گئی تھی۔

''رہنے دیں......'' شہزادی ہٹ دھرمی سے بولی۔

''ہم دونوں پڑھی لکھی ہیں۔ جاب کر کے اچھی طرح گزارا کر سکتے ہیں۔ ایسے رشتوں سے تو ہم بغیر شادی کے اچھے ہیں۔''

''شہزادی...... میرے راستے میں مت آؤ...... اچھا بھلا رشتہ ہے اپنے محلے کا ہے۔ اِسے بیاہ دوں تو تمہارے لیے بھی سوچوں۔ تم کونسی چھوٹی ہو۔'' اماں کی آواز دکھ کے بوجھ سے بوجھل ہو رہی تھی۔ کبیر اندر داخل ہوا تو خاموشی چھا گئی۔ باآواز بلند سلام کر کے وہ بولا۔

''کیا میرے آنے سے قبل کوئی بحث چل رہی تھی یہاں؟''

''ہاں بیٹا......'' اماں پژمردہ لہجے میں بولیں۔

''تم سے تو اِس گھر کی کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ گوناگوں مسائل درپیش ہیں۔ کچھ تو اپنی ہی اولاد نے مجھے زچ کر رکھا ہے۔

''کیوں پھوپو...... کیا ہوا ہے؟'' ایک نظر خاموش بیٹھی شہزادی پر ڈالتے ہوئے وہ بولا۔

''فائزہ کے لیے رشتہ آیا ہے۔ چند ایک خامیوں کے علاوہ کوئی بڑی خامی نہیں ہے اُس میں...... لیکن اب اِسے دیکھو، مان ہی نہیں رہی ہے۔'' اماں نے شہزادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شہزادی کو چھوڑیں، فائزہ کیا کہتی ہے؟'' کبیر سنجیدگی سے بولا۔

''اُس مسکین نے کیا کہنا ہے۔'' اماں بولیں۔

''جو ہم کہیں گے وہ مان لے گی۔ اُس کی عادت تو تم جانتے ہو......''

''وہ مانے یا نہ مانے' لیکن میں نہیں مانوں گی۔'' شہزادی تاؤ میں آ کر کھڑی ہو کر بولی۔

''اُس کے حق کے لیے میں لڑوں گی، اپنی عمر سے دوگنے مرد کے ساتھ جس کے چار بچے ہیں، کے ساتھ کبھی بھی میں فائزہ کی شادی نہیں ہونے دوں گی، مرتے دم تک نہیں۔'' وہ تن فن کرتی کمرے سے نکل گئی۔ کبیر حیرت سے اُسے دیکھتا رہ گیا جبکہ اماں بے بس سی بیٹھی رہیں۔

وہ تیز تیز قدموں سے کالج جا رہی تھی آج اُسے دیر بھی بہت ہو گئی تھی۔ رات کو فائزہ کے مسئلے نے اُسے سونے نہیں دیا تھا۔ صبح فجر کے بعد اُس کی آنکھ لگ گئی تھی اس لیے آنکھ دیر سے کھلی جانے کب کبیر اُس کے قریب آ گیا۔ اُس نے ایک نظر کبیر کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

''ڈسٹرب ہو؟'' کبیر اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''ہاں......'' اُس نے اعتراف کیا۔

''شہزادی...... پھوپو کو اپنا کام کرنے دو نا، وہ تجربہ کار ہیں، تم سے زیادہ سمجھتی ہیں زمانے کو۔''

''نہیں کبیر۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

''میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔ فائزہ میری بہت نیک اور اچھی بہن ہے۔ میں اُس کے لیے لڑوں گی۔ مروں گی۔ لیکن اُس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔''

''تم فائزہ کو خود فیصلہ کرنے دو نا۔ یہ اُس کی زندگی کا معاملہ ہے فیصلے کا اختیار اُس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔'' وہ رسان سے اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''فائزہ کو......'' وہ زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

''وہ قربان ہونا جانتی ہے کبیر...... قربانیاں دینے میں اُس نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ اپنی اِس چھوٹی سی زندگی میں اُس نے صرف قربانیاں دی ہیں۔ اپنی خواہشات کی، اپنے جذبات کی، اپنے احساسات کی، اِس بار خود کو قربان کر دے گی، فنش لیکن اس بار اُس کی زندگی کا فیصلہ میں کروں گی۔'' کبیر نے حیرت سے اُس کا یہ روپ دیکھا۔

''کیسا انوکھا روپ تھا، محبت کا انوکھا انداز، دل ہی دل میں کبیر نے اُس کو سراہا، پھر بات بدل کر بولا۔

''سوچ رہا ہوں شہزادی...... کہ اب چلا ہی جاؤں ممی اور پاپا کا روزانہ فون آتا ہے۔ اگر اب بھی نہ گیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں کسی دن وہ خود آ کر کان سے پکڑ کر نہ لے جائیں مجھے۔'' شہزادی کا دل جیسے کسی نے چٹکی میں مسل دیا ہو۔ جانے کیوں اُسے لگا کہ اگر کبیر چلا گیا تو ستاروں میں روشنی نہیں رہے گی۔ وقت ٹھہر جائے گا۔ زندگی مشکل ترین ہو جائے گی.. اُس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھتے ہوئے کبیر نے سرگوشی کی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ بولی۔

''جانا تو تم کو ہے ہی۔''

''ہاں۔'' وہ مسکرایا۔

''اور دوبارہ بھی آنا ہے۔ لیکن ایک نئے روپ میں...... ایک نئی حیثیت سے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا تو وہ سرخ پڑ گئی۔

''یہ بتاؤ...... میرا انتظار کرو گی۔'' اُس کی آنکھوں میں جذبے لو دے رہے تھے۔ شہزادی نے ایک نظر اُسے دیکھا اور بولی۔

''ہاں......''

''کب تک؟'' وہ اُس کے کان کے پاس منہ لا کر گنگنایا۔

''ساری زندگی!'' وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''گڈ......'' وہ بشاشت سے بولا۔

''ہو سکتا ہے مجھے راستے ہموار کرنے میں تھوڑی دیر ہو جائے لیکن یہ یاد رکھو...... لوٹ کر مجھے تمہارے پاس ہی آنا ہے۔''

کالج کا گیٹ آ گیا تھا وہ گیٹ میں گھس گئی تو کبیر بڑی دیر تک کھڑا اُس کے نقشِ پا دیکھتا رہا۔ یہ اُجلی اُجلی ریشمی سی لڑکی کب اُس کی زندگی میں آئے گی واپسی پر وہ خدا سے اُس کے حصول کی دعائیں ہی مانگتا رہا۔

آج شہزادی کو نیند نہیں آ رہی تھی ایک تو اماں سے اُس کا زبردست قسم کا جھگڑا ہوا تھا اماں نے کہہ دیا تھا کہ وہ یہ رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیں گی۔ اور اگر اُسے اعتراض ہے تو وہ اِس سے بہتر رشتہ لے آئے۔ دوسرے کبیر کا جانا تھا۔ کبیر صرف کل کا دن رُک گیا تھا۔ پرسوں اُس نے چلے جانا تھا۔ شہزادی کے دل کو کبیر سے جدائی بالکل بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ دونوں دُکھ مل کر اُسے پاگل بنا رہے تھے۔ آج اُس نے سارا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ فائزہ کئی بار اُس کے لیے کھانا کمرے میں لے آئی تھی۔

کھانے کے لیے اُس نے اُس کی منت سماجت کی تھی۔ لیکن اُس نے ایک نوالہ تک نہیں چکھا تھا۔ سرِ شام سے وہ اندھیرا کیے کمرے میں لیٹی تھی۔ آج کبیر کسی دوست سے ملنے گیا تھا ورنہ اُسے کچھ انہونی کا احساس ضرور ہوتا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ جب شہزادی کا دماغ سوچ سوچ کر شل ہونے لگا تھا تو اچانک دماغ میں کلک سا ہوا۔ ایک عجیب و غریب سوچ نے اُس کے سارے وجود کو اپنے احاطے میں لے لیا۔ دل نے پُرزور مخالفت کی۔

''نہیں نہیں، یہ غلط ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ ٹھیک کرنے کے لیے سب کچھ داؤ پر نہیں لگایا جاسکتا۔ دل بری طرح دہائی دینے لگا۔ اپنی نوخیر محبت کو اس طرح قربان مت کرو شہزادی کا دل اِس سوچ کے ساتھ ہی بند ہونے لگا تھا لیکن وہ دل کی باتیں نظرانداز کر کے دماغ کی سن رہی تھی۔

''کیسی نیند...... کہاں کی نیند ساری رات کروٹیں بدلتے اور سوچتے گزری۔

صبح کا ناشتہ سب مل کر کرتے تھے۔ کمرے میں بچھے قالین پر آج بھی فائزہ نے شیٹ بچھا کر ناشتے کے لوازمات رکھے۔ سب کے ساتھ شہزادی بھی آ کر بیٹھ گئی۔ کبیر نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

اُس کے چہرے پر زردیاں گھنڈی تھیں اور آنکھیں رت جگے کی داستان سنا رہی تھیں۔ ساری رات اُس نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ کبیر کو اُس کے اور اماں کے معرکے کا علم نہ تھا۔ ابو بھی دوکان میں تھے سو اِس جھگڑے سے لاعلم تھے۔ اماں لاتعلقی سے بیٹھی تھیں جبکہ کبیر تشویش سے اُسے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ نظریں چرا رہی تھی۔ فائزہ کمرے میں آئی تو اتنے افراد کے ہوتے ہوئے بھی اُسے سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اِس سناٹے کو توڑنے کی خاطر اُس نے شہزادی سے پوچھا۔

''شہزادی...... رابعہ کا بخار اترا یا نہیں...... تمہارے ساتھ وہ کالج جاتی ہے۔ شہزادی نے کپ ساسر میں رکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، وہ اب بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم اکیلی جاتی ہو۔'' فائزہ نے اپنی بات کو بڑھاوا دیا۔ شہزادی نے اثبات میں سر ہلایا لیکن کچھ نہ بولی۔

''اماں لاتعلق سی بیٹھی رہیں ابو ناشتہ عجلت میں کر کے دکان جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کبیر اور شہزادی نے ناشتہ ختم کیا تو دونوں ایک ساتھ اُٹھ گئے اور اسی دوران شہزادی کو موقع ملا تو وہ دھیمی آواز میں کبیر سے کہنے لگی۔

''تم سے ضروری بات کرنی ہے کبیر، میں کالج کے لیے نکلوں تو تم بھی پیچھے آ جانا۔''

ایسا مطالبہ یا ملنے کی خواہش کا اظہار شہزادی نے کبھی نہیں کیا تھا اس لیے کبیر نے حیرت سے اُسے دیکھا لیکن اُس نے نظریں ملائے بغیر وہ اپنے کمرے میں گھس گئی۔ باتھ روم میں گھس کر اور تیار ہوتے سے وہ بار بار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اُس کا سر درد کے مارے پھٹ رہا تھا۔ جسم جیسے سُن سا ہو رہا تھا اُس نے دو پین کلرز کی گولیاں کھالیں۔ وہ اندر ہی اندر اپنے مضبوط ہونے کی دعا مانگ رہی تھی۔ اپنی ثابت قدم رہنے کی دعائیں اُس کے لبوں پر تھیں۔

اپنے پاؤں بمشکل گھسیٹ کر وہ چل رہی تھی۔ آج جیسے جسم میں جان ہی نہ تھی۔ تب ہی وہ اُس کا ہمسفر ہوا۔ بڑا ہشاش بشاش خوشبوؤں میں نہایا ہوا۔ نوک پلک سے آراستہ، آج اُس نے خود کو دل سے تیار کیا ہوا تھا۔

''ہاں......اب بولو......خادم کے لیے کیا حکم ہے۔'' اُس کی آواز کی نغمگی عروج پر تھی۔ شہزادی نے ایک اُداس سی نظر اُس پر ڈالی لیکن اُس نے اُس کی نظروں کی اُداسی محسوس ہی نہیں کی وہ اپنے دھن میں بولا۔

'' ایک عرض کرنی تھی شہزادی صاحبہ!''
شہزادی نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ بولا۔
'' یوں سڑک پر کیا باتیں ہوسکیں گی۔ یہ کیا پاسیبل نہیں ہوگا کہ ہم اس سامنے والے پارک میں بیٹھ کر باتیں کریں۔''
'' تم میرے لیے اپنے ایک دو پریڈ کی قربانی تو دے سکتی ہونا۔''
وہ بڑی آس سے اُسے دیکھنے لگا تو اُس نے ایک لفظ نہیں کہا بس پارک جانے والے روڈ پر اپنے قدم بڑھا لیے۔ کبیر کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پارک کے کونے والے بینچ پر بیٹھ گئے صبح کا ٹائم تھا اس لیے پارک میں رش نہیں تھا س۔ اِکا دُکا لوگ تھے کوئی بچوں کے ساتھ آئے تھے۔ کچھ لوگ جاگنگ کررہے تھے۔ ہوا پھولوں کی خوشبو سمیٹ کر خوشبودار ہو رہی تھی۔ کبیر کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شہزادی کے ساتھ وہ پہلی بار اس طرح باہر آیا تھا اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت ٹھہر جائے۔ تھم جائے، اُس کی محبت اُس کے ساتھ تھی اُس کی نظر میں اِس وقت سے اچھا وقت کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا جبکہ شہزادی کی نظر میں اِس وقت سے برا بلکہ بدترین وقت کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ کچھ بولنے کے کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ بولنے کی کوشش کرتی تو الفاظ حلق میں چبھنے لگتے۔ کافی دیر دونوں کے بیچ خاموشی طاری رہی۔ کبیر اِس خاموشی کو بھی انجوائے کررہا تھا آخر کار بڑی دیر بعد وہ تھوک نگل کر اٹک اٹک کر بولی۔
'' کبیر...... مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔''
'' ضرور کہو شہزادی......'' کبیر محبت سے بولا۔
'' یوں سمجھو کہ تم سچ مچ کی شہزادی ہو اور میں تمہارا خادم، بس خادم کو حکم دو۔'' اُس کے لفظ لفظ سے محبت ٹپک رہی تھی۔ اُس کا پور پور محبت میں بھیگنے لگا تھا۔ شہزادی نے ایک دُکھ بھری نظر اُس کے جوش وخروش پر ڈالی اور خلاء میں دیکھتے ہوئے بولی۔
'' کبیر...... تمہیں مجھ سے محبت کا دعویٰ ہے نا......''
'' دعویٰ......'' وہ حیرت سے بولا۔
'' کوئی ایسا ویسا دعویٰ، ارے پاگل تمہاری محبت تو میرے رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ تم تو میرے شہ رگ سے بھی زیادہ میرے قریب ہو۔ تم کس قسم کی یقین دہانی چاہتی ہو...... بولو...... بتاؤ۔''
'' اگر میں تم سے کچھ مانگوں تو تم دو گے ناں......'' وہ اُس کی لن ترانیاں نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ تو وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔
'' آف کورس...... تمہارے لیے جان بھی حاضر ہے۔ جانِ من...... تم مانگ کر تو دیکھو......''
وہ بڑے پیار سے اُس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھ رہا تھا جبکہ وہ نظریں چرا رہی تھی۔ پہلی بار کبیر نے اُس کی رنجیدگی اُس کی اداسی اُس کے چہرے کا پھیکا پن محسوس کیا۔ اُس کے دل نے ایک بیٹ مس کی، شوخی سنجیدگی میں بدل گئی۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان بولتا سناٹا طاری رہا۔ شہزادی دل ہی دل میں الفاظ ترتیب دے رہی تھی اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا مدعا کن الفاظ میں بیان کرے جبکہ کبیر خاموشی سے اُس کے بولنے کا انتظار کررہا تھا اُس کا دل کسی انہونی کی طرف اشارہ کررہا تھا۔

"تم...... تم مجھ سے پرامس کرو کبیر...... کہ تم میری بات ضرور مانو گے ورنہ...... دوسری صورت میں تم مجھے بھی کھو دو گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو شہزادی!" یک بیک کبیر زیادہ پریشان نظر آنے لگا شاید بات اُس کے توقع سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ بہر حال شادی کے لیے وہ آگ کا دریا بھی پار کرسکتا تھا۔ اُسے ہر حال میں اِس آزمائش پر پورا اترنا تھا۔ شہزادی کو الفاظ چننے میں بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جبکہ کبیر بڑی بے تابی سے اُس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"بولو شہزادی...... فار گاڈ سیک...... مزید میرا صبر نہ آزماؤ۔"

"آخر پتا تو چلے کہ بات کیا ہے؟" وہ پریشانی کی انتہا پر تھا۔ شہزادی نے ایک دکھ بھری نظر اُس پر ڈالی اور جیسے ضبط کی تمام حدیں ختم ہوگئیں وہ ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کبیر کی پریشانی کی حد نہ رہی۔ وہ بری طرح گھبرا گیا۔ شہزادی کے آنسو اُس کے دل پر گرنے لگے تھے۔

"شہزادی...... پلیز...... اس طرح رو رو کر میرے ضبط کو نہ آزماؤ۔ تمہیں میری قسم! جو تمہارے دل میں ہے وہ سب مجھے کہہ دو۔ اپنا دل ہلکا کرلو، تم نہیں جانتی کہ تمہیں اس طرح روتے دیکھ کر میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ میں تمہارا رونا تمہارے آنسو بالکل بھی برداشت نہیں کرسکتا شہزادی! فار گاڈ سیک۔"

آخر میں اُس کا لہجہ ملتجی ہو گیا وہ دکھی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا جبکہ شہزادی نے مشکل سے خود کو قابو میں کرتے ہوئے اپنے بہتے آنسو پونچھے اور دھیمی آواز میں بولی۔

"کبیر...... اماں ہر حال میں فائزہ کی شادی اُس چار بچوں کے باپ اور اُس سے عمر میں کافی بڑے آدمی کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔"

گویا بات فائزہ کی تھی جس نے شہزادی کو اتنا ڈسٹرب کر رکھا تھا کبیر نے اندر ہی اندر اطمینان کی سانس لی۔

"تمہارا مطلب ہے میں پھوپو کو سمجھا بجھا کر اِس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کروں؟"

"نہیں...... شہزادی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اماں سمجھانے بجھانے کی حد سے آگے نکل چکی ہیں۔ جب وہ کسی بات کی ٹھان لیتی ہیں تو ابو بھی مزاحمت کی ہمت نہیں رکھتے۔

"اچھا......" کبیر اپنا سر کھجاتے ہوئے سوچ بھرے انداز میں بولا تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟

اماں نے شرط رکھی ہے کہ اگر فائزہ کے لیے اس رشتے سے بہتر رشتہ آئے گا تو وہ اِس رشتے سے انکار کردیں گی۔ ورنہ دوسری صورت میں یہی رشتہ فائزہ کا نصیب بنے گا۔

شہزادی کی بات پر کبیر پُرسوچ انداز میں بولا۔

"اگر پھوپو کو بہت سارے رشتوں میں یہی مناسب رشتہ لگا ہے تو پھر یکدم سے ایسا مناسب رشتہ کیسے ملے گا جو اِس رشتے سے اچھا ہوگا۔ ہوسکتا ہے مل بھی جائے لیکن اس میں سال دو سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ لگ سکتا ہے جبکہ پھوپو مزید انتظار کے موڈ میں نہیں ہیں۔" شہزادی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... اور اس کے لیے میرے پاس ایک تجویز ہے لیکن اِس کے لیے تمہاری مرضی درکار ہے تمہارا تعاون چاہیے۔"

"کیا؟" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ تو اِن

کاموں میں بالکل کورا تھا۔ اپنی نظریں وہ شہزادی پر گاڑ کر اُسی پر حیرانی سے بولا۔

"لیکن شہزادی...... میں اِس سلسلے میں تمہاری کیا ہیلپ کر سکتا ہوں۔ مجھے تو اِن کاموں کی الف ب بھی نہیں پتا...... میں تو بڑا اناڑی قسم کا بندہ ہوں۔"

"تم کو بس راضی ہونا ہے اور تمہیں کچھ نہیں کرنا۔" شہزادی کی بات پر اُس نے اور زیادہ حیرت سے اُسے دیکھا اور بولا۔

"راضی...... مگر کس بات پر؟" شہزادی نے ایک جلتی نگاہ اُس پر ڈالی اور سر جھکا کر دھیمی اور لرزتی آواز میں بولی۔

"فائزہ سے شادی کرنے کے لیے راضی ہونا...... باقی سب کچھ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

یک بیک کبیر کو ایسا لگا جیسے سمندر کی موجوں نے بپھر کر اُسے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ جیسے زہر میں بجھے ہوئے تیر اُس کے دل میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے زمین اُس کے قدموں سے کھسک رہی ہو۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شہزادی اُس سے ایسی انہونی فرمائش بھی کر سکتی ہے۔ بڑی دیر تک تو وہ کچھ بولنے کے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا۔ بڑی دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا تو وہ تیز نظروں سے اُسے گھورتا ہوا بولا۔

"شہزادی...... تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں کچھ احساس ہے کہ تم نے کتنی بے تکی بات کی ہے اگر تمہیں میری محبت قابل قبول نہیں تھی تو ویسے ہی کہہ دیتیں۔ بیچ میں فائزہ کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

شہزادی سر جھکائے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ سے مسل رہی تھی۔ اُس کا چہرہ اتنا پیلا پڑ گیا تھا جیسے کسی نے اُس کے چہرے پر ہلدی تھوپ دی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی ویرانیاں تھیں۔ کبیر کی بات پر اُس نے نظریں اُٹھا کر کبیر کے غضب ناک چہرے کی طرف دیکھا لیکن اُس کی نظریں اتنی خالی خالی لگ رہی تھیں جیسے وہ کبیر کو پہچانتی تک نہ ہو کبیر کو عجیب سی بے چینی ہوئی۔ اُس نے کبھی بھی شہزادی کو اِس طرح سے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی ایسی حالت تو اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اُس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ شہزادی کا نازک سراپا اپنے وجود میں چھپا لے، اُس کے چہرے کی بشاشت واپس لے آئے۔ لیکن اپنے محسوسات کے برعکس اُس نے چیختی ہوئی تیز آواز میں کہا۔

"شہزادی...... میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

"جواب دو مجھے...... کیا میرے جذبے اتنے بے اثر تھے کہ تم، میرا اور میری محبت کا مذاق اڑانے پر تل گئی ہو۔ کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا، کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ تم ایسا......"

اُس کا انداز ایسا تھا کہ شہزادی کا دل یک بیک چاہنے لگا کہ وہ سب کچھ بھول کر کبیر کی محبت میں اِس طرح گم ہو جائے جس طرح وہ کچھ دنوں کے لیے اُس کی محبت کی رنگوں میں رنگی تھی۔

آہ...... کتنے حسین دن تھے اور کتنی خوبصورت راتیں تھیں۔ یہ وہ دن تھے جب اُسے کبیر کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کبیر کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور کتنا پُر کیف تھا لیکن خوشیوں کی یہ عمر کتنی کم تھی۔ واقعی خواب اور حقیقت میں بہت فرق ہے اور جب بندہ خوابوں سے حقیقت کی دنیا میں آتا ہے تو سارے تصورات بکھر جاتے ہیں۔ حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔ شہزادی نے سوچ رکھا تھا کہ وہ کبیر کی خفگی، اُس کے انکار، کو سختی سے رد

کر کے صرف اپنی بات پر زور دے گی کہ اِس سلسلے میں نرم پڑنا اُس کے منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کرنے دے گا۔ اُسے اپنے دل کی باتوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکنے ہوں گے۔ سو اُس نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔

''کبیر...... سوال میں نے کیا ہے۔ جواب تمہیں دینا ہوگا کبیر اور زیادہ بھڑک اٹھا۔ غصے سے بولا۔

''یہ سوال ہے...... اگر تم زندگی مانگتی تو میں انکار نہیں کرتا اتنا ہی سچا تھا میں اپنے جذبوں میں، لیکن شہزادی تم تو اتنی ظالم ہو کہ تم نے تو زندگی سے بھی زیادہ مانگ لیا۔'' شہزادی سنجیدگی سے بولی۔

''یہ زندگی سے زیادہ نہیں ہے فائزہ ایک بے مثال لڑکی ہے میں نے صرف اُس کا نہیں سوچا۔ تمہارا بھی سوچا ہے کبیر...... تم اُس کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔''

کبیر بے چین ہو کر اپنا ماتھا انگلیوں سے مسلنے لگا۔

''میں جانتا ہوں آپی تو کہ فائزہ واقعی بے مثال لڑکی ہے لیکن میں اُس سے محبت نہیں کرتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم جانتی ہو میں تم پر، اپنی محبت پر کسی اور کو ترجیح نہیں دے سکتا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا مضبوط لہجے میں بولا۔

''کبیر...... میرے لیے اپنی محبت کے لیے تم میری بات مان لو محبت کی لاج رکھ لو کبیر، اور اچھی طرح سن لو کہ اگر فائزہ کی شادی اُس بچوں کے باپ سے ہوئی تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ بالکل بھی زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کبیر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ سکتے میں آ گیا۔ شہزادی سچ مچ بہت سیریس تھی۔ اِس کا اندازہ کبیر کو اچھی طرح ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کافی دیر تک

دونوں کے بیچ یہ بحث جاری رہی۔ لیکن نہ تو شہزادی اپنی بات سے پیچھے ہٹ رہی تھی نہ ہی کبیر اُس کی بات مان رہا تھا سو کسی نتیجے کے بغیر بات ختم ہو گئی۔

کبیر جانے پارک سے کہاں چلا گیا جبکہ وہ کالج کے بجائے گھر آ گئی۔ ناکامی کے احساس نے اُسے زندہ درگور کر دیا تھا۔ وہ جیسے اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ گھر آتے ہی اپنے پلنگ پر ڈھے گئی اور کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ شام تک اُسے زبردست قسم کا بخار چڑھا۔ کبیر ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ اماں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور فائزہ اُس سے کھانے کا پوچھنے لگی۔

''نہیں......'' وہ اپنا ماتھا اپنے ہاتھ سے دباتے ہوئے بولا۔

''باہر کھا لیا تھا کچھ...... بھوک نہیں ہے۔'' اماں محبت سے بولیں۔

''باہر کے کھانے کیوں کھاتے ہو۔ نری بیماری ہوتی ہے۔'' پھر وہ فائزہ سے کہنے لگیں۔

''چائے بنا کر لے آؤ بھائی کے لیے...... ساتھ کھانے کو کچھ لے آنا۔'' فائزہ جاتے جاتے بولی۔

''شہزادی نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اُس سے بھی چائے کا پوچھتی ہوں۔''

وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے اُس کی چیخ برآمد ہوئی۔ اماں اور کبیر بوکھلا کر اپنی جگہ سے اٹھے۔ کبیر بھاگتا ہوا اندر کمرے میں گھس گیا۔

''کیا ہوا؟''

''پتا نہیں شہزادی کو کیا ہوا ہے؟'' فائزہ روتے ہوئے بولی۔

کبیر نے دیکھا۔ شہزادی سرخ چہرہ لیے پلنگ پر آڑھی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی سانسیں بے ربط ہو رہی تھیں۔ فائزہ روتے ہوئے اُسے ہلا جلا رہی

تھی۔ اُس کے گال تھپ تھپا رہی تھی۔ اماں بھی اندر کمرے میں آ گئی تھیں اور گھبرا کر اُسے بے در پے آوازیں دے رہی تھیں۔ لیکن شہزادی بالکل بے سدھ پڑی تھی۔ کسی پکار کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ اُس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ کبیر کی ہمت جواب دے گئی۔ اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ وہ چلا کر فائزہ سے کہنے لگا۔

''پڑوس والوں سے کہہ کر ٹیکسی منگوالو...... اسے اسپتال لے جانا ہے۔'' فائزہ اور کبیر اُسے ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ اِس دوران اُسے ایک لمحے کے لیے بھی ہوش نہیں آیا۔ جب اُسے اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی میں لے جایا جا رہا تھا تو کبیر کی بے تابی دیدنی تھی۔ وہ اُس کے گال تھپتھپا کر رُندھی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''شہزادی ہوش میں آجاؤ پلیز، میں تمہاری بات مان لوں گا۔ آئی پرامس یو۔''

فائزہ خود بھی شہزادی کی حالت دیکھ کر مسلسل رو رہی تھی لیکن اُسے کبیر کی حالت دیکھ کر اور اُس کی باتیں سن کر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ آخر ایسا کیا تھا اِن دونوں کے بیچ...... وہ سوچ میں پڑ گئی تھی لیکن اس وقت سب سے اہم شہزادی کا ہوش میں آنا تھا اور شکر ہے یہ برا وقت جلد ہی ٹل گیا۔ ایمرجنسی کے باہر وہ دونوں بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فائزہ کا رونا تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی بند نہیں ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اُس کے لیے دعائیں بھی مانگ رہی تھی۔ جبکہ کبیر کی پریشانی دیدنی تھی۔ کبھی وہ ٹہلنے لگتا کبھی بیٹھ جاتا کبھی کھڑا ہو جاتا۔ وہ بار بار ہونٹ کاٹتا۔ اُس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ فائزہ کو لگا جیسے پل بھر میں وہ دھڑام سے نیچے گر جائے گا۔ اسی دوران ایمرجنسی سے ڈاکٹر باہر آیا تو کبیر تیر کی مانند اُس کی طرف بڑھا فائزہ بھی قریب آ گئی۔ ڈاکٹر بولا۔

''اب آپ کی پیشنٹ ہوش میں آ گئی ہے۔ لیکن اُس کا بخار بہت تیز ہے چند گھنٹوں کے لیے اُسے انڈر ابزرویشن رکھنا پڑے گا۔''

کبیر نے اُس کی بات ختم ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور بھاگتا ہوا ایمرجنسی میں گھس گیا۔ شہزادی آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اُس کا رنگ سرسوں کے پھول کی مانند پیلا زرد ہو رہا تھا۔ چہرے سے حد درجہ کمزوری عیاں تھی۔ کبیر بے چینی سے اُس کی طرف بڑھا اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''شہزادی...... تم کیسی ہو...... کیسی ہو تم'' شہزادی نے آنکھیں کھول کر اُس کو دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے کے چہرے سے حزن و ملال ٹپک رہا تھا اور وہ شدتِ کرب سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ فائزہ کبیر کی اس دیوانگی کو حیرت اور شک سے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً دونوں کے بیچ ایسا کچھ تھا جس سے وہ بے خبر تھی۔

''شہزادی آنکھیں کھولو، پلیز آنکھیں بند مت کرو...... میں تمہاری بات مان لوں گا۔ لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو کہ کبھی بھی بیمار نہیں پڑو گی۔''

پٹ سے شہزادی نے آنکھیں کھول دیں کبیر کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اور کانپتے ہونٹوں سے بولی۔

''تم سچ کہہ رہے ہو کبیر......'' پھر اچانک اُس کی نظر فائزہ پر پڑی تو وہ چونک کر بولی۔

''فائزہ...... تم بھی آئی ہو؟'' فائزہ سب کچھ بھلا کر اُس پر جھک گئی۔ محبت سے اُس کے بال اُس کے ماتھے سے ہٹا کر وہ بولی۔

''تم نے تو ہمارا دل ہی نکال دیا تھا۔ اتنی سخت بیمار پڑیں تم، اماں کو بڑی مشکل سے گھر میں چھوڑا

ہے۔ابو تو دکان گئے تھے انہیں تمہاری بیماری کا معلوم بھی نہیں۔" پھر وہ کبیر سے کہنے لگیں۔

"کبیر...... تم گھر چلے جاؤ۔ اماں کا رو رو کر برا حال ہوا ہوگا۔ میں تب تک شہزادی کے پاس ہوں۔" کبیر نے ایک شکایتی نظر شہزادی پر ڈالی۔ وہ حد سے زیادہ مضطرب لگ رہا تھا۔ اُس نے جانے کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں پھر لینے آجاؤں گا۔" وہ یوں لٹا پٹا سا چل دیا جیسے اپنی ساری کشتیاں جلا بیٹھا ہو۔ شہزادی نے تھک کر آنکھیں بند کرلیں۔

شام تک وہ گھر آگئے۔ اماں نے شہزادی کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا وہ مسلسل اُس کے ناز اٹھا رہی تھی۔ کبیر سیدھا کمرے میں چلا گیا تھا۔ ابو دکان سے آگئے تھے اور سارے قصے سے باخبر ہوئے تو شہزادی کے پاس بیٹھے مسلسل اُسے پیار کیے جا رہے تھے ماں باپ کی محبتیں سمیٹتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو رہی تھی لیکن وہ مسلسل اُس بند دروازے کو تک رہی تھی جس میں کبیر اندر گیا تھا۔ اور اُس کا سارا دھیان کبیر کی طرف تھا اور اُس کے دل کو کوئی بے دردی سے جیسے نوچ رہا تھا لیکن اُس نے خود کو مضبوط بنانا تھا۔ اُسے فائزہ سے بہت محبت تھی۔ یہ بات اُسے اپنے عمل سے ثابت کرنی تھی اور اس کا کبھی فائزہ کو علم نہ ہو۔ وہ اتنی ہی رازداری رکھ رہی تھی۔

اماں اُس کے لیے دودھ کا گلاس لے آئی تو اُس نے اماں سے پوچھا۔

"اماں وہ بچوں کا باپ کیا نام ہے اُس کا، ہاں اکرام کیا وہ لوگ پھر آئے ہیں رشتے کے لیے؟"

اماں نے نظریں چرالیں وہ اس وقت اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ شہزادی کی طبیعت اس بحث کو لے کر دوبارہ سے بگڑ سکتی تھی۔ وہ بولیں۔

"اب یہ بات رہنے دو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لو...... یہ دودھ پی لو۔"

"اماں......" اُس نے ماں کے ہاتھوں سے گلاس لے کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ایک بار آپ نے کہا تھا کہ میں اگر اکرام سے اچھا رشتہ لے آئی تو آپ انہیں انکار کردیں گی۔

"اب یہ بحث ختم کرو شہزادی...... تمہیں اب بھی تیز بخار ہے۔ تم یہ دودھ پیو، اور آرام کرو۔" اماں عاجز سی ہو کر بولیں۔

"یہ بحث اب کسی نتیجے کے بغیر ختم نہیں ہوگی اماں۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

"وہ دراصل...... میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ اکرام کے گھر والوں کو انکار کردیں۔ کیونکہ میں بہت اچھا رشتہ فائزہ کے لیے لائی ہوں۔"

"کک...... کیا......؟" اماں بری طرح چونک پڑیں۔ کچن سے کمرے تک آتے آتے فائزہ کمرے کے باہر ہی رک گئی۔ حیرت نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ اماں نے ایک لمحے سوچا۔

"ہوسکتا ہے اُس نے کسی دوست سے بات کرلی ہو اور اُس نے اپنے بھائی بھتیجے یا کسی اور رشتہ دار کا رشتہ بتایا ہو۔ ہاں تو اگر ایسا ہو جائے تو ہرج ہی کیا ہے۔" وہ خود کون سا خوش تھیں ایک بڑی عمر کے مرد سے جو چار بچوں کا باپ بھی ہے۔ اپنی پھول سی بے انتہا صابر اور شاکر بیٹی کا رشتہ کرنے سے، لیکن مجبوری تھی۔ کوئی اچھا رشتہ آ بھی نہیں رہا تھا جبکہ فائزہ کے بعد انہیں شہزادی کو بھی بیاہنا تھا۔

شہزادی کے لیے اتنا اچھا رشتہ آ رہا تھا۔ جنید کا...... لیکن وہ فائزہ کی وجہ سے اسے ہاں نہیں کہہ سکتے تھے۔ بدرالدین کے مطابق فائزہ کو احساس کمتری ہوتا اس لیے اُس کی شادی پہلے ہونی چاہیے تھی۔ امید بھری نظریں شہزادی پر گاڑتے

ہوئے وہ بولیں۔

''کون ہے وہ......؟ کب آئیں گے رشتہ لے کر......؟''

''جلدی آئیں گے اماں......'' اُس نے درد کی چبھن بڑی شدت سے محسوس کی۔

''لڑکا کیا کرتا ہے؟ دیکھنے میں کیسا ہے؟'' اماں کی آواز میں ڈھیروں اشتیاق چھپا تھا۔ ایک گہری نظر اماں پر ڈالتے ہوئے وہ بولی۔

''اپنے گھر کا لڑکا ہے!''

''گھر کا لڑکا؟'' اماں نے حیرت سے اُس کی بات دہرائی۔

''ہاں......'' اُس نے اثبات میں گردن ہلائی منہ سے کچھ نہ بولی۔ باہر کھڑی فائزہ کو بھی اُسی حیرت نے گھیرے میں لے لیا جس نے اماں کو جکڑ رکھا تھا اور وہ بڑی حیرت سے شہزادی کو دیکھ رہی تھی۔

''اب بتا بھی دو......'' اماں بولیں۔

''کیوں خون خشک کر رہی ہو اپنے گھر کا کون ہو سکتا ہے۔'' اماں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''نہ میرا کوئی بھانجا، بھتیجا نہ تمہارے ابو کا...... پھر کون؟''

''آپ اپنے بھتیجے کو بھول گئیں۔'' شہزادی کو یہ کہتے ہوئے کتنی تکلیف ہو رہی تھی یہ اُس کا دل ہی جانتا تھا۔ اماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شہزادی کو یوں دیکھنے لگیں جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں جبکہ باہر کھڑی فائزہ اگر لپک کر دیوار کو تھام نہ لیتی تو یقیناً پورے قد سے گر جاتی۔ وہ بڑی مشکل سے کچن تک آ گئی۔ اماں ابھی تک سکتے میں تھیں اِس لیے انہوں نے شہزادی سے کچھ اور نہیں پوچھا تھا۔

اسی دوران اچانک کبیر اندر کمرے میں آیا اور شہزادی کو نظر انداز کر کے اماں سے کہنے لگا۔

''پھوپو...... مجھے صبح سویرے جانا ہے۔ مجھے فجر کے ٹائم تک اٹھا دیں پلیز۔'' اماں تو اب تک اُسی سکتے کی کیفیت میں تھیں اس لیے فوری طور پر کبیر کو کوئی جواب نہ دے سکیں لیکن شہزادی باوجود شدید کمزوری اور بخار کے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور خود سے کبیر کو مخاطب کر کے بولی۔

''تم اِس طرح کیسے جا سکتے ہو کبیر، تمہیں اماں کو یقین دہانی کرانی ہو گی کہ تم فائزہ کے رشتے کے لیے جلد ہی ماموں اور ممانی کو لاؤ گے۔ بولو کبیر...... اماں کو ساری بات بتا دو۔''

کبیر نے بے حد شاکی نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھا لیکن کچھ نہیں بولا لیکن شہزادی اسی طرح کبیر کو جانے نہیں دے سکتی تھی سو اُس نے پھر سے کبیر کو کہا۔

''کبیر...... میں تم سے بات کر رہی ہوں...... تم جواب کیوں نہیں دیتے'' کبیر نے بمشکل اثبات میں سر ہلا کر گویا اُس کی بات کی تائید کی اور تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر برآمدے میں کھڑے ہو کر اُس نے اپنی ٹوٹی بکھرتی حالت کو سنبھالا اور مرے مرے قدموں سے کچن کی طرف پانی لینے چلا گیا۔ جہاں فائزہ ایک شاک کی حالت میں پیڑھی پر بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ کبیر جیسے ہی کچن کے اندر آیا۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر اُس کے قریب آئی اور لفظ چبا چبا کر پوچھنے لگی۔

''کبیر...... میں یہ کیا سن رہی ہوں، جانتے ہو میں تم سے بڑی ہوں اور ویسے بھی ہمارا کوئی جوڑ نہیں۔'' سنجیدگی سے وہ بولا۔

''یہ سب شہزادی سے پوچھو...... مجھ سے کوئی سوال جواب مت کرو۔ میں کوئی جواب نہیں دے سکوں گا وہ اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور

بولی۔

''یہ سب کیا دھرا شہزادی کا ہے اتنا تو میں جان گئی ہوں۔ لیکن تم کیوں اتنے کمزور پڑ گئے ہو کبیر...... میں تو اس بات پر حیران ہوں۔'' وہ پھٹ پڑا۔

''تو کیا کرتا میں، وہ مرنے مارنے کی دھمکی دینے لگی تھی۔ کیا میں اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتا تم اُس کی حالت دیکھ رہی تھی۔ موت کی دہلیز تک تو پہنچ گئی تھی۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ فائزہ کے ہونٹوں پر رینگنے لگی اور تم اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے کبیر...... کیونکہ تم اُس سے محبت کرتے ہو۔''

کبیر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر مردنی چھائی تھی وہ فائزہ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ وہ یہ سب فائزہ کے علم میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ اِس طرح وہ شہزادی سے بے ایمانی کا مرتکب ہو جاتا۔ فائزہ کی باتوں کا اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ فائزہ بڑے رسان سے بولی۔

''کبیر، میں نے تمہیں سچے دل سے بھائی مانا ہے۔ بہن بھائی کی شادی نہیں ہو سکتی۔ ہاں میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہیں تمہاری محبت لوٹا کر رہوں گی۔ شہزادی تمہاری ہے اور تمہاری رہے گی۔''

کبیر نے نظریں اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ اور اچانک ہی اُس کے چہرے پر چھائے خزاں کے رنگ بہاروں کے خوش نما رنگوں میں تبدیل ہو گئے۔ اُس کے چہرے کی مردنی آن واحد میں شادابی میں بدل گئی۔ وہ کھنکھناتے لہجے میں بولا۔

''فائزہ...... سچ کہہ رہی ہو تم...... کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا میں شہزادی کو پا سکتا ہوں۔'' فائزہ ہنس پڑی۔

''بالکل ہو سکتا ہے میرے بھائی...... اپنی بہن پر اعتبار کرو۔''

اس وقت دروازہ زور سے بج اٹھا کبیر مٹھی میٹھی نظروں سے فائزہ کو دیکھتے ہوئے دروازہ کھولنے چل دیا۔ جب اُس نے دروازہ کھولا تو دروازے پر راحیل کی بہنیں کھڑی تھیں۔ کبیر کے منہ کا ذائقہ یک بیک تلخ ہو گیا۔ راحیل کی بہنیں اتنی بار آ چکی تھیں کہ کبیر انہیں اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ اُس کا دل سلام کرنے کو بھی نہ چاہا لیکن اُس نے یہ بداخلاقی مناسب نہ سمجھی اور منہ ہی منہ میں بہ بدا کر سلام کیا۔ وہ تینوں اندر گھس آئیں اور برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئیں۔

اماں جو ابھی تک حیران پریشان بیٹھی تھیں۔ اجنبی آوازیں سُن کر کمرے سے باہر آ گئیں۔ راحیل کی بہنوں کو دیکھ کر اُن یک ماتھے پر بھی بل آ گئے تھے لیکن آداب میزبانی بھی نبھانے تھے سو اُن سے سلام دعا کر کے اُن کے پاس بیٹھ کر حال احوال پوچھنے لگیں۔ راحیل کی بڑی بہن گلا صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''آپا...... ہم روز روز آ کر آپ کو تنگ کرتے ہیں لیکن آج ہم بالکل ایک الگ مقصد کے ساتھ آئے ہیں۔ اماں نے حیرت سے اُسے دیکھا تو انہیں آج راحیل کی تینوں بہنوں کے چہروں پر دبا دبا سا جوش دکھائی دیا۔ اُس کی بڑی بہن کہہ رہی تھی۔

''آپا...... آج ہم شہزادی کے لیے نہیں بلکہ فائزہ کے لیے آپ کے سامنے دامن پھیلانے آئے ہیں۔''

اماں کو اُس کی بات پر جھٹکا سا لگا۔ حیران ہو کر بولیں۔

''فائزہ کے لیے؟''

''ہاں آپا......'' راحیل کی بڑی بہن مسرت

آمیز لہجے میں بولی۔
''ہمیں تو فائزہ شروع دن سے ہی پسند تھی جبکہ راحیل کی خواہش شہزادی کے لیے تھی۔ اِس لیے ہم مجبوراً شہزادی کے لیے دستِ سوال دراز کرنے آجاتے لیکن راحیل کی شہزادی کے لیے صرف پسندیدگی تھی کوئی عشق تو نہیں تھا اُسے شہزادی سے، سو ہماری خواہش کو دیکھ کر وہ خود ہی اپنی خواہش سے دستبردار ہوگیا۔
اور فائزہ کے لیے اپنی رضامندی دے دی۔
آپ دل میں کوئی وہم مت لائیں آپا......'' وہ خوشی اور دل کی مرضی کے ساتھ فائزہ کا رشتہ چاہتا ہے۔ اماں کو جھٹکا سا لگا۔
کبھی تو فائزہ کے لیے ایک بھی ڈھنگ کا رشتہ نہیں آتا تھا اور اب...... یہ دو دو رشتے......
لیکن بہرحال اولیت تو کبیر کے رشتے کی ہی تھی۔
تینوں بہنیں بڑی آس اور امید سے اماں کو دیکھ رہی تھیں۔ اماں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ انہیں انکار کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ لیکن کچھ کہنا تو تھا سو وہ بولیں۔
''لیکن فائزہ تو......'' اچانک ہی فائزہ کے اشارے پر کبیر نے آکر اُن کو کہا۔
''پھوپو...... آپ پلیز ذرا کچن تو آئیں، ضروری بات کرنی ہے۔'' اماں نے حیرت سے کبیر کو دیکھا۔ راحیل کی بہنیں بھی جز بز ہو کر رہ گئیں۔ اماں بات ادھوری چھوڑ کر کچن میں چلی گئیں۔ فائزہ انہیں دیکھ کر اُن کو کچن کے کونے میں لے گئی اور آواز دبا کر بولی۔
''اماں...... کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟''
''یہ...... یہ تو تمہارے رشتے کی بات کرنے آئے ہیں لیکن...... تمہارا رشتہ تو کبیر سے کرنا ہے نا...... شہزادی نے تمہیں بتایا تو ہوگا۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ کبیر...... میرا داماد بھی بن سکتا ہے۔''
''اماں...... اماں...... آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔'' فائزہ کی بات پر اماں نے چونک کر اُلجھی نظروں سے اُسے دیکھا اور بولیں۔
''کیا کہہ رہی ہے تُو...... کبیر نے خود میرے سامنے اِس بات کا اقرار کیا ہے۔
''میری بات سنیے اماں......'' فائزہ انہیں رسان سے دھیمے لہجے میں سمجھانے لگی۔
''اماں...... شہزادی اور کبیر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن جب شہزادی نے دیکھا کہ آپ میری شادی اکرام سے کرنے پر تلی ہیں تو اُس نے اپنی محبت کی قربانی دینے کا فیصلہ کرلیا اور قربانی کا بکرا بنا کبیر...... اماں شہزادی کبیر کے ساتھ جچتی ہے کبیر شہزادہ اور وہ شہزادی......''
اماں منہ کھولے ساری داستان یوں سن رہی تھی جیسی امیر حمزہ کی داستان سُن رہی ہوں۔ اور جب ساری بات اُن کی سمجھ میں آئی تو اُن کے چہرے پر بڑا ہی خوبصورت تبسم بکھر گیا۔ وہ کچھ دیر فائزہ کو دیکھتی رہی پھر بوکھلا کر بولی۔
''ارے...... میں مہمانوں کو چھوڑ کر یہاں بیٹھ گئی ہوں میری بھی مت ماری گئی ہے۔''
وہ برآمدے میں آئی تو راحیل کی بہنیں کچھ خاموش سی بیٹھی تھیں وہ جیسے ہی آئیں راحیل کی بڑی بہن بے چینی سے بولی۔
''آپا...... کیا ہوا...... آپ نے ہمیں کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔ شہزادی کے لیے تو آپ کے پاس جواز موجود تھا لیکن فائزہ کے لیے آپ کے پاس کیا کیا جواز ہے۔ بولیں۔''
''کوئی جواز نہیں۔'' اماں بڑے نرم لہجے میں بولیں۔ لیکن رشتہ کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ کچھ

سوچ و بچار کوئی مشورہ تو کرنا پڑتا ہے نا...... فائزہ کے ابو دکان میں ہیں گھر آئیں گے تو میں اُن سے بات کر کے آپ کو جواب دے دوں گی دوسری بہن منہ بنا کر افسردہ لہجے میں بولی۔

لیکن ہم تو آج ہی خوشی کی خبر جا کر بھائی کو سنانا چاہتے تھے۔ ابھی اماں جواب نہیں دے پائی تھیں کہ کبیر ایک ڈبہ ہاتھ میں لیے اندر آیا ور برآمدے میں آ کر بولا۔

''میں پھوپا جان کو لے آیا ہوں پھوپو...... انہیں ساری بات بتا دی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سو بیکری سے گلاب جامن بھی لے آیا کہ آپ اِن لوگوں کا منہ میٹھا کر لیں اماں ہونق سی کبیر اور بدرالدین کو دیکھ رہی تھیں۔ راحیل کی تینوں بہنوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بدرالدین اماں کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

راحیل کو داماد بنانا اور وہ فائزہ کے حوالے سے تو تمہاری دیرینہ خواہش تھی۔ اب کیوں چہرے پر ہوائیاں اڑی ہیں۔

اماں راحیل کی بہنوں کے سامنے قدرے شرمندہ ہوتی ہوئی بولیں اور کیا آپ کی ایسی خواہش نہیں تھی؟''

''کیوں نہیں تھی اس لیے تو کسی صلاح مشورے کے بغیر گلاب جامن سمیت آ گیا ہوں۔''

بدرالدین نے ڈبے سے ایک گلاب جامن اُٹھا کر منہ میں ڈالا اور راحیل کی بہنوں سے کہنے لگا۔

''کھاؤ بیٹیوں...... اپنے بھائی کی بات پکی ہونے کی خوشی میں منہ میٹھا کر لو۔'' کبیر ہنس کر فائزہ کو آواز دے کر بولا۔

''فائزہ...... چائے بنا کر لے آؤ۔ اسٹرانگ سی اور کچن میں جو کچھ بھی ہو ساتھ لے آؤ۔ ارے اپنی سسرالیوں کی کچھ خاطر تواضع تو کرو نا۔''

اچانک ہی خوشی جیسے اُن کے چھوٹے سے آنگن میں سمٹ آئی تھی۔ اماں اور ابو بے وجہ مسکرائے جا رہے تھے۔ راحیل کی بہنیں ایک دوسرے کے منہ میں گلاب جامن ٹھونس کر خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔ اِس دوران کبیر پلیٹ میں چند گلاب جامن ڈال کر چپکے سے شہزادی کے کمرے میں گھس گیا۔ شہزادی اس سارے ہنگامے سے بے خبر گہری نیند سو رہی تھی۔ شاید اُس کا بخار اتر گیا تھا تبھی وہ سو رہی تھی۔

''شہزادی...... شہزادی......'' کبیر اُس کی چارپائی کے پاس کھڑا اُسے مسلسل آوازیں دینے لگا۔ شہزادی نے اپنی آنکھیں کھول لیں۔ کچھ دیر تو خالی الذہن لیٹی رہی۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کبیر نے گلاب جامن کی پلیٹ اُس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''لو...... منہ میٹھا کر لو۔''

''منہ میٹھا......'' وہ حیرت سے بولی۔

''مگر کس خوشی میں......؟''

''باہر راحیل کے گھر والے آئے ہیں بات پکی ہو گئی ہے۔''

''کس کی بات پکی ہو گئی۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''بھئی...... جس کے لیے یہ لوگ آئے تھے اُسی سے بات پکی ہونی تھی نا۔'' کبیر کو اُسے چھیڑنے میں لطف آ رہا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' شہزادی کو جیسے جھٹکا سا لگا۔

''میرے ساتھ اماں ابا یہ سب کیسے کر سکتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں جا کر۔'' وہ چارپائی سے نیچے اترنے لگی تو کبیر جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔

''کیا غضب کر رہی ہو۔ باہر راحیل کی بہنیں

آئی بیٹھی ہیں۔ مہمان ہیں بے چاریاں، کچھ تو خیال کرو۔"

"تمہیں مہمانوں کا بڑا خیال آرہا ہے آج؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"ہمیشہ تو تمہیں غصہ آتا تھا اُن کے آنے پر اور ہر بار میں تمہیں روک دیتی ورنہ تم تو اُن کی بے عزتی کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔"

"ہاں...... تو وہ تب کی بات تھی نا۔" کبیر خود کو لاپرواظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"اب تو حالات یکسر بدل گئے ہیں۔"

"کیا ہوا حالات کو؟" شہزادی کو اُس کی باتوں نے جھلسا کر رکھ دیا۔

"میرا اپنا خیال ہے کہ لڑکیوں کو جلدی اپنے گھر کا ہونا چاہیے۔ دیکھو نا...... اب راحیل کی بہنیں روز روز آجاتی تھیں۔ اچھا تو نہیں لگتا تھا نا......بس میں نے پھوپو کو کہہ دیا کہ آج انہیں ہرگز مایوس نہ لوٹائیں۔" اُس کی آنکھوں میں شرارت لیکن آواز میں سنجیدگی تھی۔

"تم ہوتے کون ہو، میری زندگی کا فیصلہ کرنے والے۔" وہ بھڑک کر بولی تو کبیر آہستہ سے بولا۔

"تم نے میری زندگی کا فیصلہ کرلیا......تو مجھے بھی تمہاری زندگی کا فیصلہ کرنا تھا نا......" شہزادی کا سارا جوش وخروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ گویا کبیر نے اُس سے بدلہ لیا تھا۔ اُس نے ایک اچٹتی ہوئی شاکی نظر اُس پر ڈالی اور دوسری طرف منہ کر کے بولی۔

"میں ابھی اماں ابو سے پوچھتی ہوں کہ انہوں نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں اور مٹھائی تک بات پہنچا دی جبکہ مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔" وہ پاؤں میں چپل ڈالنے لگی اور باہر جانے لگی تو کبیر جلدی سے اُس کے سامنے آکر بولا۔

"ارے...... ارے...... کیا غضب کر رہی ہو۔ باہر وہ بیٹھے ہیں۔ مطلب مہمان بیٹھے ہیں۔" ایک تیز نظر شہزادی اُس پر ڈالتے ہوئے دانت کچکچا کر بولی۔

"محترم مہمان ہوں گے وہ تمہارے لیے، میں اُن ہی سے بات کرنے جارہی ہوں تاکہ اُن کا مٹھاس بھرا منہ کڑواہٹ سے بھر جائے۔ بڑے آئے مٹھائی کھانے والے۔"

"لو......تم بھی کھاؤ شہزادی۔" وہ معصومیت سے پلیٹ اُس کے سامنے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کھانے کی چیز پر غصہ نہیں اتارتے۔ اور پھر اچھی بیکری کی مٹھائی ہے۔ بڑی ٹیسٹی ہے۔ تم کھا کر تو دیکھو۔

مٹھائی کھانی تمہیں مبارک ہو۔ اس نے جھٹکے سے مٹھائی کی پلیٹ اپنے آگے سے ہٹائی۔ اسی دوران اماں اندر آئیں۔ اُن کے چہرے پر خوشی کے چراغ جل رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح پژمردہ اور مایوس چہرہ نہیں تھا اُن کا۔ وہ بڑی مگن، خوش اور شاداب لگ رہی تھیں۔ شہزادی نے بڑے غصے سے انہیں دیکھا اور بولی۔

"اماں...... آپ نے اور ابو نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ اور انہیں ہاں کہہ دی۔ اُس کی آواز بات کرتے ہوئے بھرا گئی اماں نے حیرت سے اُسے دیکھا اور گڑبڑا کر بولیں۔

"ارے......تو کیا تُو ایسا نہیں چاہتی تھی۔ کئی بار تو میں نے خود تجھے یہ کہتے سنا ہے کہ......راحیل کی بہنیں فائزہ کے لیے کیوں نہیں آتیں۔ اب جب آگئی ہیں تو تُو پھر بیچ میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ آخر تیرا مسئلہ کیا ہے؟"

اماں کی آواز میں غصہ در آیا۔ شہزادی کی بولتی

بند ہوگئی وہ وہ کبھی اماں کو تو کبھی کبیر کو دیکھ رہی تھی۔ اس دوران فائزہ کمرے میں آ گئی اور ڈبے سے گلاب جامن اٹھا کر شہزادی کے منہ میں ڈھونستے ہوئے بولی۔

''تو میری نہیں اپنی بات پکی ہونے کی خوشی میں منہ میٹھا کرلے۔''

''مم...... میری...... میری بات...... کس سے؟'' وہ بمشکل بول پائی۔

''شہزادہ جو مل گیا ہے میری شہزادی کو......''

فائزہ نے سینے پہ ہاتھ باندھے اپنی مسکراہٹ کو بمشکل روکے کبیر کو دیکھا جس کے چہرے پر قوس وقزح کے ساتوں رنگ بکھرے تھے اور وہ دنیا مافیہا سے بے خبر شہزادی کو اپنی نظروں کے حصار میں جکڑے کھڑا تھا جبکہ شہزادی بالکل اُس کی طرف متوجہ نہ تھی وہ ہنوز حیرت میں تھی۔ اماں کو یہ الٹ پھیر کی باتیں پسند نہ آئیں تو وہ شہزادی کو خود سے لپٹا کر محبت سے بولی۔

''فائزہ کی بات راحیل سے پکی ہوگئی ہے اور تیری بات اگرچہ کبیر سے ابھی پکی نہیں ہوئی لیکن جلد ہی ہوجائے گی۔''

''کک...... کیا؟'' وہ ہکا بکا کبھی اماں کو اور کبھی کبیر کو دیکھ رہی تھی جو چہرے پر بڑی دلنشین مسکراہٹ سجائے اُس سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ وہ بری طرح شرما گئی۔

''یہ سب کیسے ہوا، کیونکر ہوا...... اُسے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن دل تھا کہ دھڑک دھڑک کر بے حال ہو رہا تھا۔ آنکھیں تھیں کہ حیا کے بوجھ سے اُٹھ نہیں پا رہی تھیں۔ کیا واقعی یہ سب حقیقت تھا یا یہ سب ایک خوبصورت خواب تھا...... اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

کچن میں اماں چائے کے گھونٹ کے ساتھ گلاب جامن کھاتے ہوئے ابا سے کہہ رہی تھی۔

بھائی بھابی کبیر کی بات رد نہیں کریں گے۔ اکلوتا بیٹا ہے اُن کا، دیکھ لینا، جلد ہی مٹھائی کے ٹوکروں کے ساتھ آئیں گے۔

پورے کا پورا گلاب جامن منہ میں ٹھونستے ہوئے بدرالدین ہنس کر بولے۔

''ہاں تو شہزادی میں کمی کیا ہے؟ پورے ورلڈ میں انہیں ایسی بہو نہیں ملے گی۔'' اور اندر کبیر شہزادی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔

''میری محبت کی شدت کا یقین آ گیا تمہیں...... کیسے حالات صحیح کر دیے۔ خدا کو بھی میری حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ اور دیکھ لو، فائزہ کے لیے راحیل کا رشتہ آ گیا۔''

شہزادی کے چہرے پر بڑا پیارا تبسم پھیل گیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''نہیں...... خدا نے میری محبت کی لاج رکھ لی۔''

''اوہ......'' وہ خوشی اور حیرت سے چلا کر بولا۔

''اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟''

''خدا نے میری فائزہ سے محبت کی لاج رکھ لی، فائزہ کو یقین تھا کہ میں اُس سے محبت نہیں کرتی۔ جبکہ میں اُس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ میں اُس محبت کی بات کررہی ہوں۔'' وہ شرارت سے مسکرا کر کبیر کو دیکھنے لگی تو کبیر ہنس کر بولا۔

''ہٹ تیری کی...... اقرار کیا بھی تو کس کی محبت کا...... دونوں کا مشترکہ قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔ مایوسی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ فضاؤں میں محبتوں کی گنگناہٹیں جاری تھیں۔ لگتا تھا ہر طرف خوشیاں رقص کررہی ہیں کبیر نے ایک آسودہ سانس لے کر دل ہی دل میں خدا کا ڈھیروں شکر ادا کیا۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

اُمِ مریم

''یہ تو فاول ہے نا پاپا! یہ گفٹ آپ نے صرف اتباع کو دیا۔ حالانکہ شادی تو میری بھی ہوئی ہے۔ بلکہ اگر سچ پوچھیں تو میری وجہ سے ہی ان کی بھی ہوئی ہے۔'' وہ کھلکھلایا تھا۔ اس کی ہنسی بہت ہی بے ساختہ تھی۔ بریرہ کے ساتھ ہارون بھی اس کی چالاکی پر مسکرانے پر مجبور ہوئے تھے۔ اتباع کی گلابی رنگت......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا چوبیسواں حصہ

'محبت تو آسان ہے یار! بہت ہی آسان...... یہ کرنا نہیں پڑتی۔ ہاں ہو جائے تو پھر نبھانا پڑتی ہے۔ اور اصل مشکل نبھانا ہی ہے۔ بہت مشکل...... اس کے تقاضے بہت کٹھن ہیں۔ محبت میں پہلی شرط ہی خود کو مارنا ہے۔ اور یہی بہت مشکل ہے۔''

''کیا سوچنے لگے آپ......!'' اتباع نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے استفسار کیا۔ تب وہ چونکا تھا۔ اور اسے تکتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر سینے پر ہاتھ رکھ کر سر تسلیم خم کر دیا۔

''جو حکم مادام! جا رہا ہوں۔'' اتباع ایکدم کھل اٹھی۔ عبداللہ کے جانے کے بعد اس نے بہت دل سے تیاری کی تھی۔ ٹی پنک بہت خوبصورت اسٹائلش لباس پہنا اور ہلکا پھلکا میک اپ بھی کر لیا۔ دوپٹہ سلیقے سے اوڑھ کر وہ نیچے جانے کو کمرے سے نکل کر زینے کی جانب آئی تھی جب اس کا سامنا عبداللہ سے ہوا۔ جو زینے کے اختتام پر تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''میں سارے کام نپٹا کر آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

''میں بس آ رہی تھی۔'' اتباع نے جوابی مسکراہٹ سے نواز کر پہلے ہی زینے پر تھم کر کامدار دوپٹہ سنبھالا۔ عبداللہ جو اسی کی جانب متوجہ تھا۔ اسے اس کی ہر جنبش اک مخمور کر دینے والی ادا سے تعبیر ہوتی تھی۔

اتباع نے اس مدح سرائی پر پہلے چونک کر پھر جھینپ کر شرمیلی مسکان کے ساتھ اک نظر عبداللہ کو دیکھا۔

اتباع کے قدم صحیح معنوں میں اکھڑنے لگے۔ اتنا ہی اعتماد عبداللہ نے زائل کر دیا تھا اس کا۔ اسی اعتماد کو بحال کرنے کی غرض سے اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے اس نے دانستہ اسے پکار لیا۔

''عبداللہ! سنیے نا پلیز!'' وہ سیڑھیاں اتر آئی

تھی۔ عبداللہ نے بازو بڑھا کر اسے اپنے حصار میں لیا اور مسکراہٹ دباتے فدا ہوتی نظروں سے اس کی سنے بغیر اسی کے انداز میں کہتے ہوئے کہہ گیا تھا۔

ترنم عرض مکرر سنایئے ارشاد
کسی نے سنیئے کہا بزم جھوم جھوم گئی

اتباع کچھ اور خفیف ہوئی کچھ اور حجاب سے گلابی ہوئی اور اب کی بار اسے منع کرنے کو باقاعدہ ہاتھ اُٹھا کر اس کے ہونٹوں پر رکھا تھا۔ جسے عبداللہ نے اسی رومینٹک موڈ میں تھام کر بہت عقیدت بھرے انداز میں چوما۔

اس نے اتباع پر جھک کر اس کا گال شرارت بھرے انداز میں ہونٹوں سے چھوا تھا۔ پھر اسی شریر انداز میں کھلکھلایا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تم کبھی میری اتنی فرمانبردار ہو جاؤ گی۔ اور میں کبھی اتنا خوش بخت ہو سکتا ہوں۔'' اتباع شرم سے دوہری ہو گئی تھی گویا۔ اس کی گرفت میں کسمسائی۔

''پلیز عبداللہ! کوئی دیکھ لے گا۔'' اس کی حیا سے بوجھل احتجاجی آواز پر عبداللہ بھی جیسے سنبھل کر سیدھا ہوتا سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کھنکارا اِدھر اُدھر دیکھا اور اُسے دیکھ کر آسودگی طمانیت سے مسکرایا تھا۔

''تھینک گاڈ! کوئی نہیں ہے یہاں۔'' اتباع نے حجاب آمیز انداز میں نچلا ہونٹ دانتوں تلے دابا۔ پھر اسے اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کرتی ہال کی جانب آ گئی۔ جہاں ہارون اسرار سمیت سبھی موجود تھے۔ عبداللہ کے ہمراہ اتباع کو دیکھ کر تینوں ہی خوشگواریت کے احساس میں گھرے اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

''ارے بیٹے...... آپ یہاں کیوں آ گئیں۔'' بریرہ تیزی سے اس کی جانب آئیں۔ بہت والہانہ انداز میں بڑھ کر اس کی صبیح اُجلی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔ اپنے ساتھ لگا کر پیار سے اپنائیت سے گویا ہوئی تھیں۔

''السلام علیکم بوجان ماموں جان!'' اتباع شرمیلی مسکان جھکی نظروں سمیت باری باری دونوں کے آگے جھکی تھی۔ ہارون اسرار جو نثار ہوتی نظروں سے بھانجی کو دیکھ رہے تھے مزید کھل اٹھے۔

''وعلیکم السلام بیٹے! جیتی رہو۔ خوش آباد رہو۔'' انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کے اپنے والٹ سے کئی بڑے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''معذرت بیٹے! عبداللہ نے اتنی افراتفری مچائی کہ آپ کے لیے کچھ ڈھنگ کا تحفہ نہیں لے سکا۔'' اتباع خفیف سی ہو گئی۔ بریرہ نے تھام کر اسے صوفے پر اپنے مقابل بٹھا لیا تھا۔ عبداللہ ہارون کے ساتھ نشست سنبھالتا ہوا شگفتہ انداز میں پھر بول پڑا۔

''یہ تو فاؤل ہے نا پاپا! یہ گفٹ آپ نے صرف اتباع کو دیا۔ حالانکہ شادی تو میری بھی ہوئی ہے۔ بلکہ اگر سچ پوچھیں تو میری وجہ سے ہی ان کی بھی ہوئی ہے۔'' وہ کھلکھلایا تھا۔ اس کی ہنسی بہت بے ساختہ تھی۔ بریرہ کے ساتھ ہارون بھی اس کی چالاکی پر مسکرانے پر مجبور ہوئے تھے۔ اتباع کی گلابی رنگت سرخی مائل ہونے لگی۔

''آپ کو گفٹ مل تو گیا...... اتباع سے بڑھ کے بھی اچھا گفٹ ہو سکتا ہے کوئی آپ کے لیے میری جان!'' ہارون کے جواب نے اسے واقعی لاجواب کر دیا تھا۔ صرف لاجواب نہیں وہ سرشار بھی ہوا تھا۔ ہنسنے بھی لگا تھا۔

"اس میں تو خیر کوئی شک نہیں۔ لیکن اس طرح تو پھر اتباع کو بھی گفٹ میری صورت مل چکا تھا۔ کیوں اتباع! اب تم کہو...... تمہیں کیسا لگا ہے یہ تحفہ......؟"

اسے تو جیسے بہانہ چاہیے تھا اتباع کو براہِ راست مخاطب کرنے کا۔ جانتا تھا جتنا وہ ستاتی ہے سب کے درمیان تو خاص کر نہ اسے دیکھے گی نہ مخاطب کرے گی۔ اب بھی وہ گڑبڑائی تھی، ٹپٹائی کر رہ گئی۔ خفت حجاب بوکھلاہٹ کتنے رنگ تھے جو اسے مزید حسین بنانے کو کافی تھے اور عبداللہ کو اس میں محو کرتے میں۔

"اتباع کے لیے بہت زبردست سرپرائز ہے میری جانب سے۔ خوش ہو جائے گی میری بیٹی!" بریرہ نے اتباع کی کیفیت کو محسوس کرتے اسے ساتھ لگا کر محبت سے بھرے انداز میں کہا تو اتباع کے ساتھ عبداللہ بھی چونک گیا تھا۔

"کیسا سرپرائز ماما!"

"یہ رہا سرپرائز! کہو کیسا ہے۔" عبداللہ کے سوال کا جواب بریرہ سے بھی پہلے قدر نے چہکتے ہوئے دیا تھا۔ جو ایک دم سے اندر آ کر کھلکھلائی تھی۔ اور اپنی بھاری کامدار سلور فراک کو دونوں سائیڈوں سے چٹکیوں میں اٹھائے بھاگتی ہوئی آ کر اتباع سے چمٹ گئی۔ جو واقعی حیرت بھری خوشی کے احساس سمیت بے ساختہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔

"اُف...... بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اگر خالہ جانی ہمیں ناشتے کی دعوت نہ بھی دیتیں ناں تو میں نے بنا بلائے آ جانا تھا۔ تمہارا یہ حسین ترین سندر روپ دیکھنے کو۔" اسے اپنے بازوؤں میں کس کر بھینچتے ہوئے وہ شوخ کھنکتی آواز میں بولتی گئی۔ اتباع نے مسکرا کر اس کا دلبر سا دلنشین سا یہ روپ دیکھا تھا۔ ماتھے پر لٹکا...... کانوں میں بالے گلے میں نازک سا نیکلس کلائی میں ایسا ہی مہین سا بے حد خوبصورت سلور بریسلیٹ...... اتنا لائٹ میک اپ نیچرل سا لگ دیتا ہوا...... وہ صحیح معنوں میں پرستان کی پری لگ رہی تھی۔

"تم بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔ سلور فیری......" اتباع نے بہت محبت سے اس کی پیشانی چومی تھی۔ قدر ناز سے تفاخر سے زور سے ہنس پڑی۔

"میں نے بدلا چکانے کو تو نہیں کہا تھا۔"

"میں نے بدلا چکایا بھی نہیں ہے۔ سچ کہا ہے۔" اتباع نے جواباً اسے گھورا۔ اور اس کے بازوؤں میں کسمسائی۔

"چھوڑو بھئی...... باقی سب سے تو ملنے دو۔" اس نے جیسے ڈانٹا تھا۔ قدر نے مسکراہٹ دبالی۔ اور ترچھی نظروں سے عبدالعلی کو دیکھا۔ جو سفید پینٹ کوٹ میں آج اپنی ٹھٹھکا دینے والی وجاہتوں کے ہمراہ صحیح معنوں میں کسی ریاست کا شہزادہ لگ رہا تھا۔

"یہ لباس انہیں میں نے ضد کر کے پہنوایا ہے۔ لگ رہا ہے ناں ہمارا کپل پرفیکٹ......؟" وہ اتباع کے کان میں گھس کے بولی تھی۔ اتباع ہولے سے ہنس دی۔

"کیا شک میرے بھائی جان کی ٹور ہی الگ ہے۔" اتباع نے پوری آمادگی سے تائید کی تھی۔ پھر تیزی سے آگے بڑھ کے عبیر سے گلے ملنے لگی جو اس کی جانب ہی سیدھی آئی تھیں۔ لاریب عبدالغنی اور عبدالعلی کے علاوہ عبدالاحد بھی باری باری ہارون بریرہ اور امن سے مل رہے تھے۔ ساتھ عبداللہ اور اتباع سے بھی...... گھر میں اک خوشگوار سا شور ہنگامہ ہو گیا تھا۔ علیزے اور

عبدالہادی بھی تھے ساتھ۔ سب کی توجہ کا مرکز ظاہری بات ہے نئے شادی شدہ جوڑے تھے۔

''اسامہ بھائی اور سارے لوگ پتا نہیں ابھی تک کیوں نہیں آئے ہیں ہارون! ذرا فون کر کے پتا تو کریں۔ ناشتے کو خاصی تاخیر ہو رہی ہے۔'' بریرہ اب متحرک تھیں۔ اک انوکھا جوش و خروش اور خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ بہن بھائی ان کی اولادوں کو اپنے ہاں اک ساتھ دیکھ کر۔ امن کا دل اسامہ اور سارا کا نام سُن کر بہت بے ہنگم انداز میں دھڑکا۔ پتا نہیں وہ ستم گر ساتھ ہوگا کہ نہیں۔

''تھوڑا انتظار کرلیں بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے وہ لوگ راستے میں ہوں گے۔'' ہارون جو عبدالغنی اور عبدالہادی کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ جواب دینے کی فرصت نکالی۔

''افوہ...... آپ اک کال کرلیں کوئی حرج ہے؟'' بریرہ جھنجلا گئی تھیں۔ ہارون نے انہیں مسکراہٹ دبا کر دیکھا اور کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالنے لگے۔

''جو حکم سرکار! ابھی کر لیتے ہیں۔ گورنمنٹ سے کون ٹکر لے۔''

ان کی شرارت پر بریرہ بری طرح سے جھینپی تھیں۔ جبکہ عبدالہادی مسکرانے لگے تھے۔

''بالکل جناب! گورنمنٹ کی پاور کے آگے کسی کی کیا چلتی ہے۔'' انہوں نے بھی گویا علیزے کو ہی سنایا تھا۔ جو عبداللہ سے حال احوال دریافت کر رہی تھیں۔ ایک نظر انہیں دیکھ کر گہرا سانس بھر کر رہ گئیں۔

''آپ بتائیں نا عبدالغنی...... آپ کی طرف تو حکومتیں بھی دو دو ہیں۔ آپ کا کیا حال ہوتا ہوگا۔'' ہارون اسامہ کو کال کر چکے تھے۔ گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے ہمیشہ کی طرح سنجیدہ باوقار معتبر اور شاندار نظر آتے عبدالغنی کو زبردستی شامل کرلیا۔ عبدالغنی جھینپ کر نرمی سے مسکرا دیے تھے۔

''اللہ پاک کا شکر ہے، دونوں خواتین بہت نیک شریف اور سلجھی ہوئی صابر ہیں۔ مسئلہ نہیں ہوتا۔'' عبدالغنی کی بجائے لاریب نے بہت بردباری سے جواب دیا تھا۔ عبدالغنی نے جواباً انہیں بہت تائیدی اور متبسم نظروں سے دیکھا تھا۔ اسامہ اور سارا کے ساتھ ان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ امن جو اس دوران لمحہ لمحہ خود کو پگھلتا محسوس کرتی رہی تھی۔ آس و نراش کے درمیان معلق تھی۔ اس کی نظروں، امید کو بریرہ نے عبدالعلی نے بھی مرتے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں اترتی دھند کو محسوس کیا تھا۔

''ارسل کیوں نہیں آیا ساتھ......؟'' ہارون سوال کر رہے تھے۔ سارا اسی قدر تھکنے لگی تھیں۔

''آپ جانتے ہیں بھائی جان! وہ کہاں کسی کی سنتا ہے۔ سارا منتیں کر کر کے ہار گئی۔'' اسامہ بھی دل گرفتہ تھے۔

''میں لے کر آتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں آتا۔'' ہارون اسی وقت اٹھے تھے جب امن نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''رہنے دیں پاپا! وہ خود کو اس ماحول میں مس فٹ محسوس کرتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہارون نے ٹھٹک کر بیٹی کی صورت دیکھی۔ اور ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''آپ ناشتہ لگاؤ بیٹے اپنی ماما کے ساتھ...... میں آتا ہوں کچھ دیر میں۔'' کسی کی مزید سنے بغیر وہ کمرے سے نکل گئے تھے۔ عبدالغنی بھی اُٹھ کر پیچھے لپکے۔

''بہت پریشان کیا ہوا ہے اس لڑکے

نے......" سارا کے انداز میں دل گرفتگی تھی۔ بریرہ نے اپنائیت آمیز انداز میں ان کا ہاتھ سہلایا۔

"اللہ بہتر کرے گا سارا! پریشان نہ ہوں۔ دعا کیا کریں۔" سارا نے محض سر ہلایا۔ وہ پلکیں جھپکتی آنسوؤں کو اندر اُتار رہی تھیں۔ ماحول میں ایک دم گھمبیرتا اور افسردگی اترتی جا رہی تھی۔

اس نے ڈائری زور سے بند کر دی۔ اسے نہیں خبر ہو سکی تھی۔ اس کی ڈائری میں یہ نظم امن کب لکھ کے گئی تھی۔ وہ اس کی ہینڈ رائٹنگ نہ پہچانتا ہوتا تو کبھی جان بھی نہیں سکتا تھا۔ دراز کھول کر سگریٹ کا پیکٹ نکالتے اس کے ہاتھوں میں لرزش اور آنکھوں میں دھند اترنے لگی۔ وہ اس لڑکی کو سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ جسے وہ ہر لمحہ سوچ رہا تھا۔ وہ جو دروازے کی چوکھٹ سے کاندھا ٹکائے کتنی معصوم اور آس مندانہ نظروں سے اسے اکثر تکا کرتی تھی۔ اس کے متوجہ ہونے پر...... چونکتے یا پھر تنبیہی و تادیبی نظروں سے دیکھنے پر کیسے گڑبڑاتی تھی۔ یا پھر سرے سے معصوم بن کر نہایت کوئی بے تکی بھونڈی وضاحت پیش کرتی ہوئی وہ لڑکی اسے کبھی غصہ کیوں نہ دلا سکی۔ وہ شروع میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ اس کی آمد کو زیادہ دن بیتے تو وہ بے چین کیوں ہونے لگتا تھا۔ وہ جو اپنی اس معذوری کمزوری خامی کی بدولت بہت بے بس بہت مجبور تو ہو ہی چکا تھا۔ بہت چڑچڑا مستقل طور پر بداخلاق بھی ہو چکا تھا۔ اس کی آمد پر کیونکر گلاب بن کر کھلنے لگا تھا۔ جیسے جیسے اس پر انکشاف ہوا بجائے خوش ہونے کے وہ اندر سے ٹوٹنے بکھرنے کے مرحلے سے گزرنے لگا۔

اس نے جانا وہ ہرگز بھی اتنا سنگدل خودغرض اور بے حس نہیں ہو سکتا کہ ایک جیتی جاگتی صحت مند توانا زندگی کے احساس سے مہکتی خوبصورت لڑکی کو اپنی ذات تک محدود کر لے۔ اس کا سارا شاداب روپ نچوڑ دے۔ نہیں، اسے ایسا حق حاصل نہیں تھا۔ وہ ہرگز اسے ڈیزرو نہیں کرتا تھا۔ اس جیسا نوجوان...... جس کے لیے خود سے بغیر سہارے کے وہیل چیئر پر منتقل ہونا بھی آسان امر نہیں تھا۔ اور وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ تو پاگل تھی۔ بے وقوف تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں بے وقوف ہی تو ہوتی ہیں۔

انہیں کہاں اچھائی برائی کی تمیز ہوتی ہے۔ محبت جذباتیت کی نذر ہو پھر اس کے بعد اکتاہٹ و بےزاری کا باعث بنے۔ یہ زیادہ تکلیف دہ نہیں تھا؟ بہت زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ ہر بات کو ہر اینگل سے سوچنے کا عادی تھا۔ اس کی خامی نے اسے صرف حساس نہیں بنایا تھا۔ اسے بہت زیرک بھی کر دیا تھا۔ حالات کی ساری تلخی اندر اُتار کر امید کی ساری روشنی اس سے چھین لی تھی۔ جبھی تو اندھیروں میں بھٹک رہا تھا وہ، اور انہی اندھیروں کا مسافر رہنا چاہتا تھا ہمیشہ۔ اسی لیے اس نے ایسی روشنی کا راستہ بھی خود بند کر دیا تھا۔ جو اس کی اندھیری مایوس تنہا ذات میں اجالے کی خواہش مند تھی۔ پتا نہیں کتنا اچھا کیا تھا اس نے اور کتنا غلط۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ اپنی ذات سے کسی پر خوشیوں کے کھلے والے دروازوں کو بند کرنے کا ہرگز قائل نہیں تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک اسے خیالات کی عمیق کھائی سے کھینچ نکالنے کا باعث بنی تھی۔

"آ جاؤ......" سگریٹ سلگ سلگ کر ختم ہو رہا تھا۔ اس نے آخری کش لینے کے ارادے سے ہونٹوں میں رکھنے سے قبل دستک کے جواب میں ستی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ارادہ کسی ملازم کا تھا۔

جو کھانے یا چائے کا پوچھنے آسکتا تھا۔

"السلام علیکم! ارسل بابا کیسے ہیں......؟"

ارسل احمد نے چونک کر بلکہ ٹھٹکتے ہوئے گردن موڑی۔ اور اپنے روبرو عبدالغنی کے ہمراہ ہارون اسرار کو پا کر گنگ ہونے لگا تھا۔ حیرت کی زیادتی نے قوتِ گویائی بھی سلب کر ڈالی تھی۔ وہ گم صم سا انہیں دیکھتا رہ گیا۔

"کل فون پر آپ نے وعدہ کر لیا کہ آئیں گے...... مگر......"

"سوری بابا جی!" وہ محض یہی کہہ سکا۔ ہارون نرمی سے مسکرائے اور اس کے قریب آ کر اس کا سر سہلایا تھا۔

"تشریف رکھیے انکل! بہت عزت افزائی کی آپ نے۔" اب وہ عبدالغنی سے مخاطب تھا۔ جن کی مسکان میں عاجزی وانکساری اور محبت کا رنگ چھلکتا تھا۔ اس سے مصافحہ کرتے وہ اس کے روبرو آن بیٹھے۔

"چائے منگوالوں یا کافی......؟" انٹر کام کا ریسور اٹھاتے ارسل نے جواب طلب نگاہوں سے باری باری دونوں اشخاص کو دیکھا۔ عبدالغنی نے منع کیا تھا جبکہ ہارون اسرار مسکرائے تھے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹے! ہم لینے آئے ہیں آپ کو، ناشتا سب اکٹھے کریں گے۔" عبدالغنی کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ ارسل تمام تر اختلاف اور بے زاری کے باوجود انہیں انکار نہیں کر سکا۔ یہ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ پھر انہوں نے جیسے اس کی رائے کو بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ گاڑی ہارون ڈرائیو کر رہے تھے۔ عبدالغنی پچھلی سیٹ پر ارسل کے ساتھ بیٹھ گئے۔

"بہادر لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ خاص کر ایسے بہادر لوگ جو اللہ کے ہر کام میں مصلحت اور بہتری پر یقین رکھتے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں ہمارا بیٹا ارسل احمد اتنا ہی بہادر ہے۔"

اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اپنائیت آمیز انداز میں سہلاتے انہوں نے بہت خوبصورت پیرائے میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ ارسل کے وجیہہ چہرے کی رنگت متغیر ہوئی اور آنکھوں میں خفیف سی دھند لہرانے لگی۔ کچھ کہے بغیر اس نے آہستہ سے سر کو محض جنبش دے کر گویا ان کی تائید کر دی تھی۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہونٹ کچلنے لگا۔

"بیٹے مایوسی گناہ ہے کسی بھی صورت...... حالات کیسے بھی ہوں اللہ پر امید قائم رکھنی چاہیے۔ یہ بھی کبھی فراموش کرنے والی بات نہیں کہ اللہ کی کوئی بھی تخلیق بے کار نہیں ہے۔ پھر ہم تو مسلمان ہیں الحمدللہ! ہمیں یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ ہماری تخلیق کا اصل مقصد کیا ہے۔ اور جب انسان یہ جان لیتا ہے تو پھر وہ اللہ کے امر سے کائنات کی ہر چیز پر حق اور اختیار حاصل کر کے بھی عملاً لاتعلق اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ اگر چاہتے تو عرب کے سارے پہاڑ اور صحرا کے سب ذرے سونے میں تبدیل کر دیے جاتے۔ مگر سرکارِ مدینہ ﷺ نے ایسا ہرگز نہیں چاہا۔ کائنات کے وارث ہوتے ہوئے بھی قناعت صبر اور شکر پسند فرمایا۔ ادنی سے ادنی کام بھی اپنے دستِ مبارک سے انجام دیتے۔ لباس قیام طعام میں میانہ روی اور عام لوگوں کا سا انداز پسند فرمایا۔ رعونت تکبر اور شاہانہ رسم و رواج سے ہمیشہ لاتعلقی برتی۔ تو بیٹے اس معاملے میں ہمارے ذمے تسلیم ہے تحقیق نہیں۔ تسلیم اللہ کی اور تحقیق دنیا کی کرنی ہے۔ خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تسلیم دنیا کو کریں اور تحقیق اللہ کی شروع کر دیں۔

ارسل احمد نے کھڑکی کی جانب سے رُخ پھیر کر

عبدالغنی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کا واضح تاثر تھا۔

"میں ہرگز نہیں سمجھا انکل! آپ یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں مجھ سے؟"

"اس لیے کہ میں کچھ اچھی باتیں اپنے پیارے سے بیٹے سے شیئر کرنے کا خواہش مند تھا۔" انہوں نے سبھاؤ سے مسکرا کر کہا ارسل احمد نے کھینچ تان کر جبری مسکان ہونٹوں پر مروتاً سجائی تھی اور پھر سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

"میں جانتا ہوں۔ دکھ کہنے کی عادت اچھی نہیں ہے۔ دکھوں کی تشہیر بھی ہرگز مناسب نہیں۔ جبھی میں نے خود کو الگ کرلیا ہے۔ پتا نہیں مجھے پھر بھی کیوں الگ نہیں رہنے دیا جارہا۔ میں اس ماحول میں ان لوگوں میں مس فٹ ہوں۔ میری ازیت دوچند ہوجاتی ہے ان سے مل کے...... مگر کسی کو احساس نہیں ہے۔ اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں یہ میرے ساتھ اچھا کررہے ہیں۔ ان کی یہ ہمدردی...... یہ ذرا سی توجہ مجھے ہرگز بھی خیرات یا بھیک سے بڑھ کر نہیں لگتی۔ اور بھیک یا خیرات کوئی بھی غیرت مند انا پرست انسان لینا نہیں چاہتا ہے۔ یہ اس کی توہین ہی نہیں اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوتی ہے۔ مگر کوئی سمجھے بھی تو......"

اس کا لہجہ پست آواز بوجھل اور غم کے شدید غم کے باعث گھٹی ہوئی تھی۔ عبدالغنی اپنی جگہ سے ہل کررہ گئے۔ چند ثانیوں کو وہ اتنے بے بس ہوئے تھے۔ اتنے ہرٹ کہ جیسے تسلی و دلاسے کا وضاحت کا ہر لفظ اپنی حیثیت اپنا اثر کھو گیا تھا۔

"ایسا شدت پسندانہ انداز فکر نہیں اپناتے بیٹے! یہ مایوسی کے سوا کچھ نہیں ہے محبتوں اور ترس وہمدردی میں بہت واضح امتیاز ہوا کرتا ہے۔ اور یہ امتیاز لہجے سے خود اپنی نظروں سے گواہی دیتا ہے۔ آپ خود کو اس مایوسی کی کیفیت سے نکالو۔ یہ اللہ کو ناراض اور دشمن کو خوش کرنے والی چیز ہے۔ اس کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ یہ نصیب میں موجود خوشیوں کو بھی اپنے مخصوص پنجوں میں جکڑ کر ان کے احساس کو ختم کر ڈالتی ہے۔ مایوسی میں مبتلا انسان کا خوشی، خود اعتباری اور توکل کے لیے دامن تنگ پڑجاتا ہے۔ یہ مایوسی کا احساس انسان کو یا تو ریت کی طرح ڈھا دیتا ہے۔ یا کھردری دیوار کی مانند سخت بنا دیتا ہے۔ اور یہ دونوں احساس ہی نقصان کے باعث ہیں۔"

سفر تمام ہوا تھا، گاڑی کھلے گیٹ سے سرخ بجری کی شفاف ڈرائیو وے پر پھسلتی پورٹیکو میں آن رکی۔ عبدالغنی نے اس کا کاندھا تھپک کر گویا ہمت کا سرا ہاتھ میں تھمایا تھا۔ ارسل محض ان کا دل رکھنے کو مسکرایا۔ جس پل عبدالغنی اور ہارون کا سہارا پاکر وہ گاڑی سے چیئر پر منتقل ہورہا تھا۔ گلاس وال سے دو سنہری آنکھوں میں اترتی روشنیوں والی اک لڑکی نے اسے کتنی محبت سے دیکھا تھا۔ جسے نہ دیکھنے کے باوجود ارسل نے محسوس کیا ہی۔ جانا اور سمجھا تھا مانا جاتا تو یہ بھی امید تھی۔ زندگی کی نوید تھی۔ خوشی کی، مگر پتا نہیں وہ اس بات پر کس حد تک یقین رکھتا تھا۔

☆......☆......☆

ولیمہ کی تقریب بھی بہت خوشگوار باوقار انداز میں اختتام پذیر ہوئی تھی۔ رسم کے مطابق ابتاج کو ساتھ جانا تھا اپنی فیملی کے جبکہ عبداللہ اس پر راضی نہیں تھا۔ یہ اسی کا اصرار تھا کہ اس نے باقی سب کو بھی یہاں ہی روک لیا تھا۔ بزرگ سارے کمرے میں تھے۔ جبکہ نوجوان پارٹی نے ٹی وی لاؤنج میں محفل جمائی تھی۔ ایسے میں عبدالاحد نے ٹی وی آن کیا تھا سنگر کی آواز ایک دم سے کمرے

میں گونج اٹھی۔ فطری طور پر سب متوجہ ہوئے تھے۔ عبدالاحد نے گھبرا کر چینل بدلنا چاہا کہ عبداللہ نے اُسے ٹوک دیا تھا۔

"نہیں یار رہنے دو...... بہت زبردست سانگ ہے یہ، انجوائے کرتے ہیں۔" عبدالاحد نے مسکراتے ہوئے کاندھے اچکا دیے تو عبداللہ نے ترچھی نظروں سے اتباع کو دیکھتے دانستہ آواز کا والیوم بڑھایا۔ جو اس کی بجائے امن اور قدر کے ساتھ محوِ گفتگو تھی۔

ان کی معصومیت پر نہ جانا
ان کے دھوکے میں ہرگز نہ آنا
لوٹ لیتے ہیں یہ مسکرا کر
ان کی چالوں سے اللہ بچائے

سبھی ہنس، مسکرا رہے تھے۔ ارسل بالکل خاموش تھا۔ خاموش گم صم ویران...... اگر کسی نے اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کی تو اس نے خود لفٹ نہیں کرائی تھی۔ وہ سارا کو جتلا دینا چاہتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ زبردستی ہوگی کسی بھی معاملے میں تو بھگتے گی وہ۔ یہ سب اپنی جگہ پر تھا۔ مگر دل بھی کسی چیز کا نام ہے۔ جسم کا ایک ایسا چھوٹا سا حصہ جو بڑے تھسے سے بڑے دھڑلے سے پورے وجود پر حکمرانی کرتا ہے۔ مجال ہے اس پر کسی کو فوقیت ہو۔ مجال ہے اس کے آگے کسی کی چلے۔ اسی دل نے نگاہ پر قابو نہیں رہنے دیا تھا۔ اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی گاہے بگاہے امن کو دیکھنے لگتا تھا۔ جو اس کی طرح ہی سب کے ساتھ موجود ہو کر بھی جیسے کہیں نہیں تھی۔ جہاں بھی تھی مگر اس کی جانب بھی متوجہ نہیں تھی۔ درد ارسل احمد کے دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ وہ سچ اور جھوٹ فریب اور حقیقت کے سرابوں میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

"اسے بند کرو پلیز!" عبدالاحد رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔

"دو آوازیں دنیا آخرت میں لعنت کی گئی ہیں۔ خوشی کے وقت گانا اور موسیقی، اور مصیبت کے وقت رونا اور چلانا۔" عبدالعلی نے اندر آ کر سب سے پہلے ٹی وی آف کیا تھا۔ عبداللہ خفیف سا ہو گیا۔

"سوری مجھے اس حدیث کا معلوم نہیں تھا۔" عبداللہ کے کہنے پر عبدالعلی نے محض سر ہلایا۔

"اٹس او کے بی کیئر فل نیکسٹ ٹائم۔"

ماحول بدل گیا تھا عبدالعلی کی آمد کے ساتھ گانا ختم ہو گیا تھا مگر ارسل کی کیفیت نہیں بدلی۔ وہ حواسوں سے باہر امن کو اس اضطرابی کیفیت کے زیر اثر دیکھ رہا تھا اور کسی نے اس کا دیکھنا محسوس کیا یا نہیں امن البتہ ضرور آگاہ ہو گئی تھی۔ پہلے حیرانی پھر غیر یقینی اس سے اگلا تاثر اضطراب کا تھا۔ اور بہت گہرا تھا۔ ارسل کو احساس ہوا تھا جبھی اس نے نگاہ کا زاویہ موڑتے ہونٹ سختی سے بھینچ ڈالے تھے۔

وہ سب کسی بات پر بہت زور سے ہنسے تھے۔ ارسل احمد کی آنکھوں کی جلن بڑھنے لگی۔

"بتاؤ عبدالاحد تم نے کبھی کسی سے محبت کی......؟ جھوٹ نہیں بولنا۔" قدر عبدالاحد کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ دانت نکالنے لگا۔

ہم محبت میں زبردستی کے ہرگز قائل نہیں
جس نے کرنی ہے کرے نہیں کرنی تو پراں مرے

"تو بھاوج بیگم ہم محبت میں کچھ اس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ کجا کسی کے پیچھے پڑ جائیں۔" اس بات پر ایک بار پھر قہقہہ پڑا تھا۔

"بہت خوب عبدالاحد! ہم جیسے محبت میں توحید کے قائل لوگ تو کسی کھاتے میں نہیں رہے۔" عبداللہ نے منہ بسور لیا تھا۔ قدر زور سے

ہنسنے لگی۔

"دل پر نہ لیں بھائی صاحب! ابھی بچہ ہے۔ ان باتوں کو کہاں سمجھتا ہے۔"

"یہ بچہ آپ سے کچھ سال بڑا ہی ہے۔ آپ شادی کر کے پتا نہیں کیوں خود کو عالم فاضل سمجھنے لگیں۔" عبدالاحد نے بھی اچھا خاصا برا منالیا تھا۔ قدرے خفگی کرنے لگی۔

"چلو غم نہ کرو۔ تمہاری بھی شادی کرا دیتے ہیں تاکہ عالم فاضل بن سکو۔" اس نے گویا عبدالاحد کو پچکارا تھا۔

"چھوڑو بھئی یہ بحث! کوئی کچھ اچھا سا سنا ہی دے۔ یار تم ہی کچھ اس بہانے بول پڑو۔" عبداللہ نے ارسل پر گرفت کی تھی۔ وہ چونکا ضرور البتہ مزید کوئی رسپانس نہیں دیا۔ عبداللہ کے اشارے پر وہ بھی جیسے اس کے پیچھے پڑے تھے مگر وہ آمادہ تھا نہ تیار......

"امن تم ہی کہہ کے دیکھ لو یار! یہ ارسل بھائی تو ہمیں لفٹ کرانے کو بھی تیار نہیں ہیں۔" عبدالاحد نے جلدی ہی ہار تسلیم کر لی تھی۔ منہ بھی لٹکا لیا تھا۔ امن کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے بے اختیار بہت لاشعوری انداز میں ارسل احمد کو دیکھا تھا۔ اب یہ محض اتفاق تھا یا کچھ اور کہ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ امن دھک سے رہ گئی۔ اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں نگاہ کا زاویہ بدلا تھا۔ منہ میں جیسے کونین گھل گئی۔

"میں کبھی کسی کو فورس نہیں کیا کرتی۔ ویسے بھی ہر انسان اپنی مرضی کا مالک ہوا کرتا ہے۔" اس کا لہجہ روکھا بھی تھا اور سرد بھی۔ اب کے چہرے کا رنگ ارسل احمد کا پھیکا پڑا تھا۔ ہونٹ بھینچے وہ خاموش کا خاموش رہ گیا۔

"اُفوہ بھئی کہنے میں حرج بھی کیا ہے۔"

عبداللہ کو امن کا انداز ناگوار خاطر ہوا تھا۔ جبھی ٹوکنا ضروری سمجھا۔ وہ دانستہ خاموش رہی۔

"اچھا چلو یہ ہی بتا دو کہ تم چاہتی ہو ارسل بھائی کچھ سنائیں......؟" عبدالاحد کا انداز ہلکا پھلکا تھا اب کے، امن نے محض کاندھے اچکا دیے۔

"مجھے بھلا اعتراض کیوں ہوگا۔"

"اعتراض نہیں ہوگا تو اچھا بھی نہیں لگے گا؟" عبدالاحد اس کی جان کو آیا۔ امن کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"اچھا لگے گا۔ کیوں برا لگے گا بھلا؟" وہ تڑخی تھی۔ عبدالاحد دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

"چلیں ارسل بھائی شروع کر دیں۔ یہاں سب منتظر ہیں۔ سن لیا ناں آپ نے۔" وہ مسکرا کر گویا تھا۔ اور امن کو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔ وہ کسی کا دل رکھنے کی خاطر ہی کچھ کہے گا۔ مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب ارسل گلا کھنکارتا ہوا بہت بھاری اور متوازن آواز میں گویا ہوا تھا۔

ہنستے بستے ماحول پر تکلیف دہ سناٹا پھیل گیا۔ اس کے لہجے کا کرب آنکھوں کا درد جیسے پوری فضا پر پھیل گیا تھا۔ امن سکتہ زدہ بیٹھی تھی۔ ارسل کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کسی میں بھی جرأت گفتار نہ رہی، حوصلہ نہ رہا۔ وہ الفاظ ہی گم تھے جو یہاں اثر پذیر ہوتے۔ درد تھا بے انتہا درد، معاً امن آنکھوں میں آنسو لیے اٹھی تھی اور تیز قدموں سے کمرے سے چلی گئی۔ اس جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہی سناٹا ماحول پر مسلط رہا ہو کتا رہا تھا۔

کچھ درد جہاں کچھ فکر جہاں
کچھ شرم خطا کچھ خوف ترا

اک بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں
اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

☆......☆......☆

عبدالعلی نے تلاوت مکمل کی اور کلام پاک کو جزدان میں رکھ دیا۔ عبدالہادی جذب کی کیفیت میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی آواز کا سوز تاثیر اور محبت دل کو جکڑتی دل پر اثر انداز ہوتی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا انہیں بہت شوق سے سنا کرتا تھا۔

عبدالعلی نے اُٹھ کر بہت مودب انداز میں کلام پاک کو الماری میں اوپری خانے میں رکھا تھا۔ اور پلٹ کر عبدالہادی کی جانب آنے لگا۔ وہ اپنے مخصوص حلیے میں تھے۔ سفید عبا یا خط ہوئی داڑھی سرخ وسفید رنگت قابل رشک صحت...... وہ آج بھی اتنے ہی باوقار خوبصورت اور شاندار نظر آتے تھے۔ جتنے وہ اپنے بچپن میں سے انہیں دیکھتا آیا تھا۔ عبدالغنی کے بعد اسے عبدالہادی سے انوکھی سی انسیت ہمیشہ محسوس ہوئی تھی۔

''جو لوگ اللہ کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ وہ انسانوں تک ہی پہنچتے ہیں۔ اللہ والے انسان ہی تو ہوتے ہیں۔ انسانوں کا دل دکھا کر اللہ کی تلاش ممکن نہیں۔'' عبدالغنی کسی سے محوِ کلام تھے فون پر' عبدالعلی نے تائیدی انداز میں سر کو اثبات میں جنبش دی تھی اور عبدالہادی کے عین سامنے آن بیٹھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ اور منہ میں کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری۔

''ہاں بالکل بیٹے! اہل دل کو علم اور عقل خود بخود نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ ان پر اللہ کا خاص کرم اور عنایت ہوتی ہے۔''

عبدالغنی کی بھاری آواز یہاں بھی اس کی سماعتوں میں اتر رہی تھی۔ عبدالغنی کے لیے یہ کال بغداد میں مقیم ہو جانے والے ان کے کسی شاگرد کی تھی۔ جو ان سے اکثر روحانی موضوعات پر معلومات لیا کرتا تھا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے مصنف تھا اور کسی کے بقول عبدالغنی سے بات کر کے اس کی بات سن کر اس کی تحریر میں نکھار آتا تھا۔

''اللہ کا فضل جہالت میں ہوتا تو ابوجہل راہِ حق پر گامزن ہو جاتا۔ راہ حق کا تعلق علم اور جہالت سے نہیں، بلکہ خالص محبت الٰہی سے ہے۔ حضرتِ بلال حبشیؓ کی اذان کا واقعہ سن رکھا ہے نا آپ نے۔'' حالانکہ وہ واقعی لفظ کی ادائیگی میں فرق کرتے تھے۔ مگر محبتِ الٰہی کا محبتِ رسول ﷺ کا عالم یہ تھا کہ جب اذان پر پابندی لگائی گئی۔ اللہ کو یہ امر گوارا نہ ہوا۔ جبھی کائنات کے نظام کو روک دیا۔ وہاں بھی محبت جیتی تھی۔ عشق سرخروئی کے مرتبے پر فائز ہوا تھا۔ اور عقل والے منہ تکتے رہ گئے تھے۔ اللہ کے نزدیک جذبہ اور احساس اہم ہے۔ نہ کہ علم کا خزانہ اور عبادات کی طویل فہرست ...... اگر محبت کا ایک سجدہ بھی ہے تو ہزاروں سالوں کی بنا محبت کے کی گئی عبادات بے کار چلی جاتی ہے۔ حدیث ہے ناں...... عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ اور نیت کو اللہ بہتر پہچاننے والا ہے۔ اور یہ بھی کہ سر جھکانے سے نماز نہیں ہوتی دل جھکانا پڑتے ہیں۔'' عبدالہادی بے ساختہ سر دھننے لگے۔ عبدالعلی مسکرایا۔

''اس میں کیا شک ...... عبادتیں اور ان کا تقدس ان کی اہمیت اپنی جگہ لیکن کسی انسان کا دل راضی کرنا سب اہمیتوں سے زیادہ اہم ہے۔'' عبدالعلی نے تائیداً کہا تھا۔ عبدالہادی کی دلفریب مسکان گہری ہوتی چلی گئی۔

''بیشک بیٹے! اپنی زندگی میں ہم جتنے دل راضی کریں گے۔ ہماری قبر میں اتنے ہی چراغ

جلیں گے۔ ہماری نیکیاں ہمارے مزار روشن کرتی ہیں۔ سخی کی سخاوت اس کی قبر کا دیا ہے۔ ہماری اپنی صفات ہی ہمارے بعد کام آنے والے چراغ ہیں۔ جنہیں زندگی میں ہی جلانا پڑتا ہے۔ انسان کا دل توڑنے والا شخص اللہ کو تلاش نہیں کرسکتا۔ دیکھا جائے تو محبت اور اخلاص یہاں بھی جیت گیا۔ بقول شاعر......

عبادت زاہدوں کی رہ گئی اپنا سامنہ لے کر
محبت جب جبیں لائی جنوں کعبہ اٹھا لایا

عبدالہادی مسکرا رہے تھے۔ عبدالعلی کے چہرے پران کے لیے محبت کا احترام کا اور عقیدت کا احساس مزید گہرا ہوا۔ عبدالہادی اسی جذب اور وجہ کی کیفیت میں کہہ رہے تھے۔

عبدالعلی کو عبدالہادی پر انسان کے بجائے فرشتے کا گمان ہونے لگا۔ ہر گزرتا دن گویا انہیں دنیا سے بے نیاز اور رب سے قریب کررہا تھا جیسے انہیں دیکھتے اسے کبھی کا پڑھا شعر یاد آنے لگا۔

مانا کہ میری شہ رگ کے قریب ہے تُو
مگر میں یہ فاصلہ بھی کہاں چاہتا ہوں

عبدالعلی اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسے لگا اب اگر وہ انہیں ڈسٹرب کرے گا تو شاید گناہگار ہوجائے اس کے اٹھتے قدموں سے فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ اور عبدالہادی کی پُرسوز آواز ہر لمحہ مدھم ہوتی جارہی تھی۔

باج حضوری نہیں منظوری توڑے پڑھن صلا تاں ہو
روزے نفل نمازاں گزارن جاگن ساریاں راتاں ہو
باجھوں قلب حضور نہ ہووے کڈھن سئی ذکا تاں ہو
باج فنا رب حاصل ہووے نا تا شیر جما تاں

ہو

واقعی اگر آپ کا تعلق اللہ سے ہے تو پھر محفل ہو یا تنہائی دونوں ٹھیک ہیں۔ اور اگر آپ کا تعلق اللہ سے نہیں ہے۔ تو تنہائی بھی عذاب ہے اور محفل بھی عذاب ہے۔ مگر اس اہم بات کو ہر کوئی سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ہر کوئی عبدالہادی اور عبدالغنی جیسا خوش بخت بھی تو نہیں ہوتا۔

اتباع بے ساختہ گھبرا کر رہ گئی۔ عبداللہ کا انداز ہی ایسا شکوہ کناں تھا۔ اس نے فون ایک کان سے ہٹا کر دوسرے سے لگایا۔ اور دانستہ کھنکاری۔

''اس کا کیا مطلب ہے عبداللہ!'' وہ خائف بھی تھی محتاط بھی، اس کی ہر دم پوری کوشش ہوتی نازک مزاج برہم نہ ہو۔ مگر شاید پھر بھی کوئی کوتاہی ہوگئی تھی۔

''اب یہ بھی میں بتاؤں؟'' عبداللہ کی ناراضگی کا گراف بڑھا۔ اس نے بے اختیار ہونٹوں کو باہم بھینچا۔

''آپ خفا ہیں؟'' اتباع کا مدھم لہجہ اس کے گریز کا غماز تھا۔

''یہ بھی میں بتاؤں؟'' عبداللہ کا انداز ہنوز تھا۔ وہ روہانسی ہونے لگی۔

''اچھا بتائیں کیوں خفا ہیں؟''

''زوجہ تم وہاں جاکے بیٹھ گئی ہو۔ مجھے یکسر فراموش کیے، کوئی تک ہے بھلا؟ ہے کوئی بات کرنے کی؟'' بالآخر غصہ کی وجہ سامنے آ گئی۔

اتباع نے گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

ایسے میں اگر میں کہتا ہوں کہ......
یہ ظلم نہیں تو پھر کیا ہے
تمہارے ہوتے ہوئے میری بانہوں میں تکیے......

اب کے اس کا انداز شریر ہوا تھا۔ اتباع کھسیا سی گئی۔ شرم اتنی آ رہی تھی کہ کچھ کہنا محال ہوا۔

"یہ سچ ہے میری جان! محبت میں وصال کا خمار جب دل کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے تو زندگی ایکدم سے رقص کرتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ انسان اپنے بازوؤں میں خوشبوؤں کو اوڑھ لیتا ہے۔ اسے ہواؤں کی سرگوشیاں چٹکتی ہوئی کلیوں کی صدا اور درختوں کی شاخوں پر کونپلوں کی شرارت تک سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ آخر تمہارے احساسات کیوں نہیں بدلے۔ وہ بھی مجھ جیسے بندے کی رومینٹک قربت کے باوجود......"

وہ شاکی ہوا جا رہا تھا۔ اتباع جو اس کے لہجے میں موجود بہتے پانیوں کی سی روانی میں کھوئی تھی چونک سی گئی، بلکہ بلش کر گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ آ جائیں۔ میں چلوں گی آپ کے ساتھ، اک بات بھی کرنی ہے آپ سے۔" وہ مسکراہٹ ضبط کرتی کہہ رہی تھی۔ جبکہ عبداللہ کو شرارت سوجھ گئی۔

"کہیں تم مجھے اپنی پریگنینسی کی خبر تو نہیں سنانے لگی ہو...... مجھے بڑا شوق ہے اتباع کہ تم جلدی سے میرے بچے کی ماں بن جاؤ۔ دراصل میرا دل کرتا ہے ہمارے بہت سارے بچے ہوں۔ اتنے کہ تمہارے پاس میرے لیے بھی ٹائم نہ بچے۔ پھر میں تمہارے ساتھ جھگڑا کروں اور...... تم سن رہی ہو؟" وہ اس کی خاموشی پر ٹھٹھکتا پکار گیا تھا۔ جبکہ اتباع جو اس کی بے سروپا بات پر دہک سی گئی تھی۔ اتنی شرمندہ تھی کہ بول بھی نہیں سکی۔ جبھی کچھ کہے بغیر رابطہ کاٹ دیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب نک سک سے تیار وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا تو اتباع کے چہرے پر ہنوز شرمیلا تاثر پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ نظریں چرا رہی تھی۔

عبداللہ اس کی کیفیت سمجھ کر ہی بے تحاشا ہنسے جا رہا تھا۔ اس کی نظر کے گہرے زاویوں اور اس کی شرارت کے احساس سے اتباع کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی پلکیں لرزنے لگیں اور چہرہ کچھ اور بھی تمتما اٹھا۔

"تم بہت خوبصورت ہو اتباع! مجھے ہر گزرتے دن کے ساتھ تم سے عشق ہوتا جا رہا ہے۔" عبداللہ اس کی قربت کے خمار میں مبتلا بہکنے لگا۔ ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے چھوا تھا۔ اتباع سنبھل کر فاصلے پر ہوئی۔

"اچھا میری بات تو سن لیں۔ جو اتنی اہم ہے کہ آپ کو وہاں سے بلوایا۔"

"اوہو......" عبداللہ نے منہ لٹکایا۔ چہرے پر بے چارگی کا تاثر سجاتے ہوئے بولا تھا۔

"اور میں سمجھا تم بھی میری طرح میرے لیے بے قرار ہوئی جا رہی ہو۔" اتباع کے چہرے پر شرمیلی روشن مسکان بکھرنے لگی۔

"اک بات کہوں عبداللہ! اظہار ہمیشہ مرد کے منہ سے ہی جچتا ہے۔ عورت شرماتی ہے اور اپنے جذبے اپنے اندر رکھتی ہے۔ مگر اپنے عمل اپنی وفا اپنے ایثار سے اس محبت کا اظہار پیش کرتی ہے۔"

اس کا انداز ناصحانہ تھا۔ کجا وہ کچھ اور سمجھ بیٹھے اس خاموشی سے...... عبداللہ تو جیسے نہال ہونے لگا تھا۔

"میں جانتا ہوں جان! مذاق کر رہا تھا۔ اب تم وہ بات تو بتاؤ۔ کیا واقعی مجھے بابا بننے کی خوشخبری سنانے والی ہو۔" اسے خود سے قریب کرتا وہ بوجھل سرگوشی میں بول پڑا تھا۔ اتباع کی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔

"اللہ نے چاہا جب تو یہ بھی سن لیں گے۔ فی

الحال تو اور بات ہے۔" وہ اس کے بازو سے سر لگا کر مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔ عبداللہ نے چہرا اس کے سر پر لگایا اور ہونٹ مہکتے بالوں پر رکھ دیے۔

"تم کہو نا میری جان! ہر خواہش سر آنکھوں پر ہے۔" اتباع ممنونیت تشکر اور آسودگی کے احساس سے لبریز ہونے لگی۔

"میں چاہتی تھی عبداللہ! جب میرا نکاح ہو تو میرا شوہر حق مہر میں قرآن کریم کی کوئی سورۃ حفظ کرے۔ مگر تب نکاح اتنی اچانک اور افراتفری میں ہوا کہ میں یہ خواہش چاہنے کے باوجود ظاہر نہیں کرسکی۔ لیکن اب میں چاہ رہی ہوں...... ہم عمرہ کے لیے جائیں۔ اس کے بعد ہی ہم اپنی زندگی کا آغاز کریں۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ سر اٹھا کر عبداللہ کو آس مندانہ نظروں سے تکنے لگی۔ وہ مسکرایا تھا جھک کر اس کا صبیح چہرہ چوم لیا۔

"میری جان! یہ ایسی خواہش تو نہیں کہ جسے پورا کرنا ناممکن ہو۔ میں پاپا سے بات کرتا ہوں۔ ممکن ہے وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" وہ جتنی محبت جتنے رسان سے کہہ رہا تھا۔ اتباع اس قدر خوشی و سرشاری کے احساس سے معمور ہوگئی تھی۔

"رئیلی...... عبداللہ! ایسا ممکن ہے ناں؟" وفورِ شوق سے کہتے اس نے عبداللہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ عبداللہ کھل کر اور آسودگی سے مسکرایا تھا۔

"شیور میری جان! وائے ناٹ، انشاء اللہ!" وہ اس کا سر تھپک رہا تھا۔ اتباع نم آنکھوں سے اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اسے انتظار کا اشارہ کرتی اس وقت سجدۂ شکر بجا لانے کے ارادے سے وضو کرنے چلی گئی۔

☆......☆......☆

"اتنی دیر لگادی آپ نے؟ کہاں رہ گئے تھے عبدالعلی! کب سے انتظار کر رہی تھی۔" وہ گھر پہنچا تو قدرا سے لان میں ہی اپنے انتظار میں ٹہلتی ہوئی مل گئی تھی۔ گلابی رنگ خوب گھیر دار فراک جو اس کے پیروں تک آتا تھا۔ ساتھ بڑا سا دوپٹہ وہ اچھے خاصی وقت میں مبتلا لگی اسے۔

"قدر کیسے کپڑے پہننے شروع کردیے ہیں تم نے......؟ مجھے تو ہر وقت ڈر لگتا رہتا ہے کہیں تم اپنے ہی لباس میں اُلجھ کر نہ گر پڑو۔" وہ اس کے سراپے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ قدر کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"میں ابھی بدل دیتی ہوں۔ دراصل شادی پر دونوں اطراف کے ایسے ہی لباس بنے ہیں۔" وہ بجھے ہوئے انداز میں گویا تھی۔ عبدالعلی کچھ کہے بغیر عبیر اور لاریب کے پاس چلا گیا۔ جانتا تھا وہ سب لوگ اِدھر ہی ہوں گے ہال میں۔

"السلام وعلیکم!" اس نے اجتماعی سلام کیا تھا اور عبدالغنی کے ساتھ نشست سنبھال لی۔

"وعلیکم السلام بیٹے! جیتے رہو۔" عبدالہادی اسے روبرو پاکر مسکرانے لگے تھے۔

"ڈیوٹی پر کب تک جا رہے ہیں آپ بیٹے!" ان کا سوال عبدالعلی کو عبدالہادی کی جانب پوری طرح متوجہ کر گیا تھا۔

"شادی کی وجہ سے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی ملی تھی انکل! اب تو ایک ماہ ہی پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کے بعد پوسٹنگ آپ کو پتا ہے محاذ پر ہوگی میری اب۔" وہ رسان سے گویا تھا۔ عبدالہادی کے ساتھ عبدالغنی نے بھی اسے دعاؤں سے نوازا تھا۔

"یعنی اتنا وقت ہے تم لوگوں کے پاس کہ عمرہ کے لیے جاسکو۔" عبدالہادی کی بات پر عبدالعلی

بے ساختہ چونک کر انہیں تکنے لگا۔ علیزے کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔

''بیٹے! یہ عبدالہادی صاحب کا آپ دونوں کو شادی کا تحفہ ہے، عمرے کے ٹکٹس......''
علیزے کی وضاحت پر عبدالعلی کا چہرہ ایک دم سے تمتمانے لگا تھا۔

''ماشاءاللہ!'' عبدالغنی بے ساختہ سیدھے ہو بیٹھے۔ ان کا سرخ و سفید چہرہ یکدم جگمگانے لگا تھا۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے عبدالعلی کو گلے لگا کر مبارک باد دی تھی۔

''بہت خوش بخت ہو بیٹے! اللہ نے اس سعادت کا مرتبہ بخشا ہے۔''

''بھائی جان آپ اور دونوں بھابیاں بھی چل رہی ہیں۔ بلکہ ہم بھی چل رہے ہیں سب اکٹھے۔'' عبدالعلی عبدالہادی سے گلے مل رہا تھا۔ جب علیزے کے انکشاف پر خوشی کی یہ لہر فرط مسرت وانبساط کے ہمراہ ہر چہرے پر پھیل گئی۔ گویا وہاں کا سماں وہاں ہر کسی کے جذبات ہی انوکھے ہوگئے تھے۔ نم آنکھیں دل خوشی سے معمور تھے۔ عبیر جلدی سے مٹھائی فریج سے نکال کر سب کے منہ میٹھے کرانے لگیں۔

''تم نے بتایا ہی نہیں کسی کو علیزے......! بلکہ اگر کہیں کہ ہوا بھی نہیں لگنے دی تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' لاریب مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں تھیں۔ علیزے دھیرے سے ہنس دیں۔

''ارادہ تو تھا، بس عبدالہادی قدر کی شادی کرنا چاہتے تھے پہلے۔ الحمدللہ یہ کام بھی رب نے کردیا۔''

''ادھر اتباع اور عبداللہ بھی خواہش مند ہیں۔ سنا ہے بھائی جان انتظام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھیں کب تک ہو پاتا ہے۔'' عبیر کی اطلاع پر لاریب اور عبدالغنی کے ساتھ علیزے کی بھی خوشی دوچند ہوگئی تھی۔

''ارے انہیں اس خوشخبری کا تو بتائیں۔''

''میں کرتی ہوں کال بجو کو۔'' علیزے نے اسی وقت نمبر ڈائل کرنا شروع کردیے۔ ہر کوئی مگن تھا۔ عبدالعلی آہستگی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اوپر آیا تو قدر لباس تبدیل کیے بیڈ کے کنارے ٹکی گم صم نظر آئی۔

''قدر......!'' وہ پکارا تو قدر نے چونکتے ہوئے پلٹنے سے قبل ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ ڈالی تھیں۔ پھر اس کی جانب مڑی۔ عبدالعلی سے اس کی یہ حرکت مخفی نہیں رہ سکی۔ اس کے مقابل بیٹھا ہوا وہ بغور اس کی متورم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے انگشت شہادت سے نم پلکوں کو چھو کر استفہامی انداز میں اسے تکنے لگا۔

''تم رو رہی تھیں...... بٹ وائے......؟'' اگر وہ سوال کرتا تو وہ مکر بھی جاتی۔ وہ یقین کرلینے کے بعد وجہ دریافت کررہا تھا۔

''کچھ نہیں، ایسے ہی، آیئے نیچے چلتے ہیں۔'' وہ کترا کر اٹھی۔ عبدالعلی نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

''میری کوئی بات بری لگی تمہیں......؟ قدر پلیز ٹیل می!'' قدر اس کی لاعلمی یا پھر بے نیازی کے مظاہرے پر دکھ سے شک ہوکر رہ گئی۔

''ہماری اور اتباع کی اکٹھی شادی ہوئی۔ عبداللہ بھائی کو دیکھا...... کتنی محبت کرتے ہیں اتباع سے، انہیں آج کل اتباع کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ کچھ نہیں سوجھتا، اک آپ ہیں...... اچھے کپڑوں میں تعریف تو کیا کریں گے اُلٹا ڈانٹ کے وہ بھی بدلوادیے۔'' وضاحت پیش ہوگئی تھی۔ وجہ کھل گئی تھی۔ جو اتنی بچکانہ تھی اس کے

نزدیک کہ وہ محض ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔

"قدر......! میں نے ڈانٹا نہیں ہے تمہیں، محض سمجھایا تھا۔ پھر بھی اگر تم ہرٹ ہوئیں تو آئی ایم سوری......" قدر نے ایکدم سے گھبرا کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا کہہ کر مجھے گناہ گار نہ کریں عبدالعلی!" وہ خائف سی بولی۔ عبدالعلی مسکرادیا تھا بالآخر۔

"یار جس کی غلطی ہو اسے معافی مانگنی چاہیے۔ گناہ کی کیا بات...... اچھا چھوڑو میں تمہیں بتانے آیا تھا ایک بہت پیاری خبر......"

"مجھے پتا ہے...... ہم عمرہ کے لیے جارہے ہیں ناں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر چہکی۔ عبدالعلی اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تم خوش ہو......؟"

"بہت...... بہت زیادہ۔ اللہ نے آپ کا ساتھ دیا مجھے۔ آپ کی محبت دی۔ اور اب یہ سعادت بھی۔" اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ عبدالعلی نے جھک کر اس کی پیشانی پر لب رکھ دیے۔

"اُس اللہ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔ وہ وہاں جاکے مانگ لینا۔" اس کا انداز سرگوشیانہ تھا۔

"اور کیا مانگوں گی۔ سب کچھ تو مل گیا عبدالعلی!" وہ مخمور تھی معمور تھی۔ آسودہ تھی، مکمل تھی۔

"یار بچے...... یعنی ہماری محبت کی نشانیاں...... جو ہمارے گھر کی رونق بڑھائیں گے...... یہ بھی نہیں چاہیے۔" وہ شریر ہوا تھا۔ قدر بری طرح سے جھینپ گئی۔

"کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ آجائیں میں کچن میں ممانی جان کی مدد کو جارہی ہوں۔"

"اوکے...... ویسے سنو...... تم اس سادگی میں زیادہ پیاری لگ رہی ہو۔ بالکل عبدالعلی کے دل کی ملکہ......" وہ مسکرایا اور قدر بلش کرگئی تھی۔ لانبی پلکیں لرز کر جھکیں۔ عبدالعلی نے مخمور سا سانس بھرا اور فوراً ہی اُٹھ کر اس کے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

امن کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اتنے دنوں بعد وہ آج آئی تھی۔ اور وہ دائم منحوس جیسے اسی کے انتظار میں تھا۔ اُس کے قدم اس کی غلیظ نظروں کی آلودگی کے باعث ہی لڑکھڑانے لگے تھے۔

وہ آج جرأت کا عظیم مظاہرہ کرتا اس کے ہمقدم ہوگیا تھا۔ ایسے کہ بس کاندھے سے کاندھا ٹکرانے کی کسر تھی۔ امن روہانسی ہوئی جیسے بدک کر فاصلے پر ہوئی اور وہ جیسے حظ لے کر ہنسا تھا۔

امن سراسیمہ ہوگئی تھی۔ جبھی اندھا دھند بھاگ کھڑی ہوئی۔ کلاس کے دوران بھی اس کا دل ٹھکانے پر نہیں رہا۔ چھٹی کے وقت سے پہلے وہ اس بدمعاش کے سامنے سے بچنے کی غرض سے نکل آئی تھی۔ مگر نہیں جانتی تھی۔ یہ اس کی کتنی بڑی خطا ہے۔ اس وقت کالج کے گیٹ کے باہر تقریباً سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ جتنی بھی محتاط تھی مگر دائیں جانب سے اچانک کہیں سے نکل کر آنے والی گاڑی کو وہ بھی پہلے نہیں دیکھ سکی۔ جو اس کے نزدیک رکی تھی اور پہلے سے کھلے دروازے سے اسے اندر گھسیٹتے ہی دروازہ دھماکے سے بند ہوگیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی...... اتنی مہارت اتنی صفائی سے ہوا تھا جیسے باقاعدہ پلاننگ کے تحت کیا گیا ہو۔

اس کے بکھرے حواس اس وقت مزید مشتعل ہوکر رہ گئے تھے۔ جب ذرا سا سنبھلنے پر اس نے

خود کو سیٹ کی بجائے سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی گود میں خود کو گرے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ تڑپ کر ایسے ہی فاصلے پر ہونا چاہی تھی۔ جیسے کسی غلیظ چیز پر غلطی سے ٹکرا جانے کے بعد گھن کھائے انداز میں انسان فی الفور پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ مگر اس کی اس کوشش کو ناکامی کا شکار بنا دیا گیا تھا۔

''آں...... ہاں...... آرام سے بیٹھی رہو۔ سمجھو عزت و عافیت سے ہو۔'' امن جو کرخت مردانہ بازو کا حصار اپنے گرد کستا محسوس کر کے بسمل کی مانند مچلی تھی۔ اس سرد پھنکارتی آواز پر متوحش سی سر اٹھا کر مخاطب کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اور اگلے لمحے جیسے اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں دائم تھا۔ امن کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں اٹھیں اور پورے وجود میں پھیلتی چلی گئی تھیں۔ پہلے تو حیرانی تھی۔ وحشت تھی۔ اب اسے لگا تھا وہ کسی بھی پل اس صدمے کے باعث جان سے گزر جائے گی۔ کچھ دیر پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ جیسے رہے سہے حواس بھی کھو کر اس پر جھپٹی تھی۔

''خبیث کمینے گھٹیا انسان! کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟'' اس سے قبل کہ اس کا ہاتھ دائم کے چہرے پر پڑتا اسے درمیان سے ہی بے دردی اور سفاکیت سمیت دبوچ لیا گیا تھا۔ اور ایسے جارحانہ انداز میں جھٹکے سے کھا گیا کہ امن کو ایک پل کو ہاتھ کی نازک ہڈیاں چٹختی محسوس ہوئی اور بازو جیسے شانے سے الگ ہوتا ہوا۔ بے اختیار اک کربناک چیخ اس کے حلق سے اُمڈی تھی۔ وہ درد کی شدتوں سمیت ایکدم دوہری ہوتی چلی گئی۔

''اگر تمہاری اکڑ...... تمہاری نظر اندازی تمہیں آج یہ دن دکھلا سکتی ہے تو تمہاری مزید معمولی سی گستاخی تمہیں کیا رنگ دکھائے گی، اندازہ کر لو کنٹرول یور سیف، مس امن! ورنہ میں گاڑی کی اندرونی لائٹیں آن کر دوں گا اور یہاں ہی تمہارے ساتھ اسی ڈرائیور کے سامنے دست درازی شروع کر دوں گا۔ اب خود دیکھ لو تمہیں کیا کرنا چاہیے۔''

اس پر جھک کر وہ آگ برساتے قطعی اور برہم انداز میں جتلا کر بولا تھا۔ اس طرح کہ اس کی گرفت میں مچلتا امن کا بے بس مقید پرندے کی مانند پھڑپھڑاتا وجود جیسے سکتے کی کیفیت میں آ کر پتھرا سا گیا۔ وہ آنکھیں جو نفرت و وحشت سمیٹے تھیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں شفاف پانیوں سے چھلک پڑیں۔ ہر مزاحمت پر جیسے پہرہ لگ گیا تھا۔ اک لفظ زبان سے نکالے بغیر وہ گھٹ گھٹ کر رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکی تھی۔ ایک بے بسی کا احساس تھا۔ اک ذلت و گناہ کا بھی، جو اسے اندر سے بھنبھوڑتا رگ رگ کو کاٹتا ہوا پورے وجود میں حشر بپا کیے ہوئے تھا۔

''مجھے چھوڑ دو، خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں کہیں نہیں بھاگوں گی مگر......'' اس کے سانسوں کی ناگوار تپش ہاتھوں کی مکروہ حدت اور وجود کی اذیت انگیز گرمی مل جل کر امن کو جیسے کسی برزخ میں سلگانے لگی۔ کراہیت کا احساس اتنا گہرا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی اس کی منت پر مجبور ہوئی تھی۔ جنبش نہ کرنے کی وجہ وہ منحوس دھمکی تھی جو ابھی تک اس کے وجود میں نیزے کی انی بن کر پیوست ہوئی تھی۔ اس کا جی متلا رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا۔ خود اس لمحے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لیتی جواباً دائم نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا تھا گویا اس کا مضحکہ اڑایا گیا۔

''پرہیز گار لوگوں کا ایک یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے قسم سے ہم جتنے سکون میں ہیں یہ اسی حد تک

اذیت میں۔'' اس کا انداز اب بھی تمسخرانہ تھا۔ امن نے پھر جنبش کرنی چاہی تھی کہ وہ زور سے کسی درندے کی مانند غرایا اور نہایت بیہودہ انداز میں اس کی چادر کھینچی۔ امن کی روح بھی جیسے کھینچی تھی۔ پورے وجود میں جیسے خوف سنسنی بن کر پھیل گیا۔ دائم کے چہرے کے تاثرات سخت کبیدہ خاطر تھے۔

''مجھے لگتا ہے تمہیں اپنی عزت کی اتنی پرواہ نہیں ہے ڈھونگ ہے یہ پارسائی کا۔'' وہ غرا رہا تھا۔ امن توہین تضحیک کے اس مظاہرے پر سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ نہیں کر سکی۔ اس نے گھومتے سر اور جلتی آنکھوں کے ساتھ اتنی شدت سے گڑگڑا کر رب کو پکارا تھا کہ شاید ہی کبھی زندگی میں اس کے اندر اتنی بے قراری اتنی شدت اتری ہو۔

''نہیں کوئی معبود سوائے تیرے تو پاک ہے۔ بیشک میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔''

''میرے اللہ! میں بڑی گناہ گار، بس ایک التجا ہے اس عفریت سے نجات عطا فرما، مجھ پر رحم فرما۔ جیسے تو نے یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں عافیت و نجات دی۔ مجھے محفوظ فرما۔ جیسے تو نے ابراہیمؑ کو بھڑکتے الاؤ سے نجات و عافت دی۔''

ہر راہ بند تھی۔ وہ ایسی اذیت ایسے کرب کا کبھی شکار نہ ہوئی تھی۔ جس میں اب مبتلا تھی۔ اسے رب یاد آیا تھا۔ وہ رب جسے اس انداز میں اس نے کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ گاڑی جو تب سے بنا رُکے فراٹے بھر رہی تھی۔ یکدم ہچکولہ کھا کے ایسے لڑکھڑائی جیسے کوئی بچہ اپنے کھیل سے اکتا کر نخوت سے کھلونا پٹخ دے۔ امن اس فرعون صفت انسان کی گرفت سے پھسل کر سیٹوں کے درمیان خالی جگہ پر جا کر گری تھی۔ کہاں چوٹ آئی یا باقیوں کا کیا حشر ہوا۔ اسے پرواہ نہیں تھی۔ اسے اتنا سکون ملا تھا جو بیان سے باہر تھا۔ اس کے رحمٰن و رحیم رب نے اس کی التجا کو رد نہیں کیا تھا۔

''خیریت تو ہے ناں استاد...... چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟'' ڈرائیور پختہ عمر کا کرخت انسان تھا۔ یقیناً دائم سے سوال کر رہا تھا۔ جواب میں غلیظ اور واہیات گالیوں کا ایک ریلا دائم کے منہ سے بہہ نکلا تھا۔ امن اگر کچھ دیر قبل اتنی کڑی آزمائش سے نہ گزر چکی ہوتی تو ایسی گندی زبان سن کر لازماً زمین میں گڑھنے کی خواہش کرتی۔ اب تو جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اس کا رواں رواں ایک اذیت سے خلاصی پر شکر گزاری میں مبتلا تھا۔ اور دوسری سے نجات کے لیے عرض گزار ہو چکا تھا۔ معاً وہ ایک بار پھر تڑپ گئی۔

''اٹھو تم...... اوپر آ کے بیٹھو۔'' دائم اس کی پنڈلی پر اپنے وزنی بوٹ کی ٹھوکر مار کر اسے متوجہ کر رہا تھا۔ امن کے اندر اس کا چہرہ نوچنے آنکھیں پھوڑنے کی خواہش بہت شدت سے امڈی۔ جسے وہ بامشکل برداشت کر پائی تھی۔ اور چپ چاپ خود کو سنبھال کر اٹھتی سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔ سکڑی سمٹی وحشت زدہ ہرنی جیسی لڑکی۔

''اگر تمہیں گھر لیٹ جانا ہو تو کسے میسج کیا کرتی ہو...... ؟ ماں کو...... باپ کو؟'' امن ہراساں سی اس کے ہاتھ میں اپنا موبائل فون دیکھتی رہ گئی۔ ہونٹ جیسے سِل گئے تھے۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو میری جان! کچھ وقت میں تمہارے ساتھ گزاروں گا۔ پھر تمہیں واپس چھوڑ آؤں گا۔ یا اگر کہو گی تو شادی بھی کر لوں گا۔'' وہ اس کا گال تھپک کر پھر مکروہ ہنسی ہنسا۔ امن کے چہرے کے تاثرات سخت کبیدہ

خاطر تھے۔ اس نے بپھرے ہوئے انداز میں اس کا ہاتھ فی الفور جھٹک دیا تھا۔ دائم کے چہرے پر قہر اُمڈا تھا۔ جسے دبانے کی اس نے ہرگز کوشش نہیں کی۔

''کیا پوچھا ہے میں نے......؟ بکواس کرو گی یا پھر تمہارے باپ کو یہ بتاؤں کہ میں تمہیں اپنی غرض پوری کرنے کو اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔ ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈ لو۔'' وہ لمحوں میں قہر سے بھرتا حلق کے بل چیخا۔ امن کا رنگ یکا یک بالکل پیلا پڑتا چلا گیا تھا۔

''مما......کو......'' شدتوں سے پھوٹ پھوٹ کر روتی وہ بے بسی لاچاری کی انتہاؤں پر تھی۔ اس نے غیر محسوس انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر خود کو نیچے گرانے کا بھی تہیہ کیا تھا۔ مگر دروازہ لاکڈ تھا۔ اس نے جانا تھا وہ ہر لحاظ سے بے بس تھی۔ دائم نے بہت تیزی سے ایک میسج ٹائپ کیا تھا اور سینڈ کردیا۔ امن خوف سے منجمد ہوتی اسے ڈوبتی نظروں سے دیکھتی رہی۔ کتنے پل بنا آہٹ کے بیتے تھے۔ وہ خالی ذہن خوف سے بھرا دل لیے سکتہ زدہ بیٹھی رہی تھی۔ جبھی گاڑی کے رکنے کی بھی خبر نہیں ہوسکی۔

''چلو اترو آ گئی ہے ہماری منزل۔'' دائم دروازہ کھولے کھڑا اس کا منتظر تھا۔ امن نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا اسے وہ موت کا فرشتہ محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں تلے جبھی اندھیرے چھانے لگے تھے۔ وہ حواس بحال نہیں رکھ سکی۔ دائم اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا اس نوتعمیر شدہ آبادی میں لایا تھا۔ یہ غیر آباد اور سنسان علاقہ تھا۔ نوتعمیر شدہ اپارٹمنٹ اپنے ادھورے خدوخال سمیت بہت عجیب محسوس ہوتے تھے۔ بہت دور جھاگ اڑاتا سمندر بھی پس منظر میں دکھائی دیتا تھا۔ امن کا دل گھمبیر قسم کی وحشت سمیٹنے لگا۔ دائم اسے کسی جانور کی طرح ہی گھسیٹ کر اس پرانے ہٹ میں لے کر آیا تھا۔ جو اس علاقے کی طرح ہی سنسان اور ویران تھا۔

''کیا خدمت کریں تمہاری......؟ آخر کو پہلی بار مہمان بنی ہو میری۔'' اسے قدیم قسم کے کاؤچ پر دھکیل کر وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا خود لائٹس آن کررہا تھا۔ امن کا دل دھڑکنا بھی بھولنے لگا۔ اسے وہ کسی شیطان سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

''مجھے جانے دو۔ اللہ کا واسطہ ہے مجھے واپس جانے دو۔ دیکھو اگر تم مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتے ہو تو میں کرلوں گی۔ میں تمہیں ضمانت کے طور پر اپنی تحریر دے دیتی ہوں کہ......'' اس کی بات مکمل نہیں ہوسکی۔ دائم کا زناٹے دار تھپڑ زور دار آواز کے ساتھ اس کے نرم گداز گال کی کھال ادھیڑ کے رکھ گیا تھا۔ امن یہ جناتی تھپڑ کھا کر کسی طور بھی سنبھلے بغیر تیورا کر نیچے پختہ فرش پر چت جاگری تھی۔ اس کا دماغ کئی لمحے بالکل ماؤف ہوا تھا۔ اور آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ بے بسی کے واضح مظہر آنسو انتہائی لاچاری کے عالم میں پھیل کر دائیں بائیں گرنے لگے۔

''تم خود کو کیا سمجھتی ہو؟ بہت عزت دار......؟ بہت پارسا......؟'' گھٹنے زمین پر ٹیک کر وہ اس پر جھکتے ہوئے پھنکار پھنکار کر سوال کررہا تھا۔ امن اس قدر شاک میں تھی کہ زبان کو حرکت تک نہیں دے سکی۔ یہ کیا تھا یہ کیوں تھا۔ اس نے کبھی بھی اس شخص کو پلٹ کر اس کی بدتمیزی بدکلامی کے جواب میں بھی کوئی سخت جملہ تک نہیں کہا تھا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آسکی۔ اس کے باوجود وہ یوں ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے کیوں پڑا تھا۔ کیوں اس سے اتنی نفرت کرنے لگا تھا۔

''آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ عزت دار

صرف تم نہیں تھیں۔ عزت دار صرف تمہاری ماں ہی نہیں تھی۔ یا صرف تمہارا باپ ہی نہیں تھا۔''

اس نے طیش میں بپھرتے ہوئے اب کی بار اس کی چادر کھینچ لی تھی۔ امن جتنا بھی تڑپی مگر پرواہ کسے تھی۔ اس کے بعد اس کا دوپٹہ اس کے وجود سے الگ ہوا۔ وہ کسی بھوکے گدھ کی مانند اس پر ٹوٹ پڑنے کو تھا۔ جب ایک بار پھر مدِ غیبی کے تحت زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

دائم جتنا بدمزہ ہوا امن کے حلق سے اُمڈتی چیخوں میں اس سے بڑھ کر شدت پیدا ہوئی تھی۔ دائم نے اس کے بالوں کی چوٹی نفرت سے کھینچ کر پھر چھوڑی تھی۔ اور اسے کینہ توز نظروں سے دیکھتا پلٹ کر باہر گیا۔ امن تھر تھر کانپتی اٹھ کر اپنی چادر اُٹھا کر اوڑھ رہی تھی۔ جب وہ عورت دائم کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ امن کی آنکھوں میں خوف اور وحشت کا ڈیرا تھا۔ وہ سکتہ زدہ اپنی جگہ پر کھڑی آنے والی کے چہرے پر اپنے لیے رحم کا کوئی جذبہ ڈھونڈنے کی سعی کرنے لگی۔ اس عورت کا فگر اس عمر میں بھی غضب ڈھاتا تھا۔ وجود جیسے آسمانی بجلی کے کوند کی مانند تھا۔ جو بینائی چھین لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ نیٹ کے سلیولیس بلاؤز اور قابل اعتراض حد تک گہرے گلے کے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اس کی ساڑھی کا قیمتی کپڑا اتنا مہین تھا کہ اس کا وجود پر ہونا نہ ہونا ایک برابر حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ایسے چلتی ہوئی اس کے پاس آئی جیسے پانی پر تیر رہی ہو۔ اس کی نظریں بہت عجیب تھیں۔ گویا وہ ایک لڑکی کو نہیں...... منڈی میں بکنے کو آئی گائے بھینس کو جانچ رہی ہو۔ امن کا دل خوف کی شدتوں سے بند ہونے لگا۔ سانس لینے میں ایسی دشواری محسوس ہوئی گویا فضا سے کسی نے آکسیجن نچوڑ لی ہو۔

''بہت خوب! بہت ہی خوب! ہارون اسرار کی اکلوتی بیٹی کو ایسا ہی حسین اور قاتل ہونا چاہیے تھا۔'' وہ اسے داد سے نواز رہی تھی۔ مگر ایسے کہ جیسے امن کو کند چھری سے ذبح کر رہی ہو۔

''تم کیا چاہتے ہو دائم......!'' وہ ناز سے لہرا کر دائم کی جانب پلٹی۔ جو دانت بھینچے کھڑا تھا۔ ضبط کے کڑے مرحلے طے کرتا ہوا۔

''مام! تم جاؤ یہاں سے...... یا پھر میں تمہارے سامنے ہی اس کے حوالے سے اپنی نفرت اس کے وجود پر ثبت کروں اور اسے......''

''دائم......!'' وہ جتنا جذباتی ہو کر کہہ رہا تھا۔ وہ اسی قدر پُرسکون انداز میں ٹوک گئی۔

''تم اس کے ساتھ ہر سلوک میں آزاد ہو گے۔ مگر نکاح شرط ہے۔ تم نکاح کرو گے پہلے اس کے ساتھ۔''

''واٹ......؟ مام آپ ہوش میں ہیں؟'' وہ حیرت کی زیادتی سے چیخا تھا۔ عورت اسی تحمل سے رسان سے مسکرائی۔

''ایک گھنٹہ صبر کر لو۔ نکاح خواں آتا ہو گا۔ میں نکاح کرانے کے بعد چلی جاؤں گی۔''

''مگر مام......!''

''مائی سن! بحث نہیں، جو میں کر رہی ہوں۔ یہ زیادہ بہتر ہے نکاح کے بغیر خطرہ ہمارے لیے ہو گا نکاح کی صورت میں ہم سیو ہوں گے۔ سمجھے؟ پھر ہارون اسرار کو بھی پتا لگے...... میں اسے ایسی شکست دینا چاہتی ہوں کہ وہ عمر بھر تڑپتا رہے اور نجات حاصل نہ ہو۔'' وہ دونوں گویا امن کے وجود کو یکسر فراموش کیے گفتگو میں شریک تھے۔ جو ہر لمحہ بے جان ہوتی جا رہی تھی۔

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ اپریل میں ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

نبیلہ نازش راؤ

دل جھیل اور خواب

"کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہاں زینو! آج میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے تمہیں بے انتہا چاہا ہے، لیکن میں مکمل طور پر زہریلا ہو چکا ہوں اور ڈسنا میری فطرت بن گئی ہے لیکن میں تم سے انتقام نہیں لے سکتا۔ میں نہیں چاہتا زینو کہ......

اور اب وہ کیسا ٹوٹا پھوٹا پٹیوں میں جکڑا بیہوش پڑا تھا اُس کا سرخ وسفید چہرہ کس قدر زرد ہو رہا تھا۔ وہ ساحر آنکھیں بند تھیں وہ انگارے برساتے ہونٹ ساکت تھے، اس کے تنے ہوئے کرخت چہرے پر عجیب نرماہٹ اُتر آئی تھی۔

وہ زہریلا انسان کس قدر بے ضرر کتنا عجیب لگ رہا تھا، کسی ننھے سے بچے کی مانند وہ جو خود کو شیطان کا دوسرا روپ کہتا ہے۔

ایسا چہرہ تو فرشتوں کا ہوتا ہے اس کا کمزور زرد چہرہ آج بھی دل میں کھبا جا رہا تھا، جب تک وہ آپریشن تھیٹر میں رہا مجھ پر جانکنی کا عالم رہا۔ میری روح پھڑ پھڑاتی رہی۔

"بوا! اُسے کچھ نہیں ہوگا اُس کو زندگی کی طرف لوٹنا ہوگا۔ میری خاطر میرے لیے، جیون بھر وہ نفرتوں کی آگ میں جلتا رہا اور اب جبکہ محبت اس کے در پر سوالی بنی کھڑی ہے تو میں اسے مرنے نہیں دوں گی، اس خدائے ذوالجلال سے اپنی جان کے بدلے اس کی بھیک مانگ لوں گی۔" میں بے ساختہ چیخے جا رہی تھی، بوا حیرت سے میری تڑپ دیکھ رہی تھیں ایک مشفق سی خاتون میری آہ وزاری سے متاثر ہو کے بولیں۔

"مریض سے تمہارا کیا رشتہ ہے بیٹی۔ وہ تمہارا کون ہے؟"

"اس سے میرے دل کا ناتا ہے، روح کا بندھن ہے۔ وہ میرا سب کچھ ہے۔ اس کائنات کا سارا حسن اس کے دم سے ہے۔" وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی رہ گئیں۔ میں اپنے حواسوں میں ہی کب تھی۔ میرے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ میرے پرخچے اُڑ رہے تھے۔ اس کی حالت نازک تھی اور میرا دل، میری روح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔

اس نے کہا تھا۔

"میں بہت ذلیل، بہت گھٹیا شخص ہوں۔ زینو! میری رگوں میں زہر دوڑ رہا ہے۔ یہ زہر جانے کتنوں کو نیلا کر چکا ہے۔ مجھ سے نفرت کرو۔ مجھ پر پتھر برساؤ۔"

"میں تم سے کیسے نفرت کرسکتی ہوں ابوسفیان! میرا دل تو ازل سے تمہارے لیے دھڑک رہا ہے۔ میری تو ہر آتی جاتی سانس تمہارے نام کا وظیفہ کررہی ہے۔ میں تمہاری راہوں میں پھول بکھیرنے کو اس دنیا میں آئی ہوں۔ سفیان! میرے دوست......"

ہمارا سارا بچپن پاشا انکل کے لان میں کھیلتے گزرا۔ جب وہ پندرہ سال کا بچہ تھا۔ کتنی محبت کرتا تھا ہر ایک سے اور اس کا دل کس قدر خوبصورت تھا۔ وہ تو کسی پرندے کو بھی تکلیف میں نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ تو ہاتھ آئی تتلیوں کو چھوڑ دیتا تھا کہ ان کو تکلیف نہ ہو وہ تو کبھی پھول بھی نہ توڑتا کہ شاخ سے جدا ہو کر مرجھا جائیں گے۔

پورے بیس سال بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ ایک یکسر بدلے ہوئے انسان کے روپ میں۔

نفسیاتی مریض کے روپ میں......

میں حیران ہو رہی تھی اس پل پل شعلہ شبنم شخص کو دیکھ کے کبھی اس قدر اپنائیت کبھی مکمل اجنبیت ہیرے سے بھی سخت تو پھولوں سے بھی نازک جذبات واحساسات کا حامل۔

سفیان علی! کل رات ہی سے اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ وہ تیز بخار میں جل رہا تھا اور کس قدر ٹینس تھا وہ اور بے چینی سے سنبل کے تکیے پر سر پٹخ رہا تھا۔

"چائے پیو گے؟" میں نے دریافت کیا تھا۔

"نہیں۔"

"ڈاکٹر کو فون کردوں۔"

"نہیں نہیں پلیز چلی جاؤ یہاں سے۔" وہ بے حد بیزاری سے بولا۔

"میں کیسے جاتی وہ جو اتنی اذیت میں تھا۔ کیا تنہا چھوڑ دیتی اسے؟ وہ جو میری ذات کا بچھڑا ہوا حصہ تھا۔

"مجھے بہت اچھا سر دبانا آتا ہے۔ میں تمہارا سر دباتی ہوں۔ درد یوں چٹکی بجاتے میں غائب ہو جائے گا۔"

"گیٹ آؤٹ فرام ہیر، نہیں چاہیے مجھے تمہاری...... ہمدردیاں، مرنے دو مجھے۔" وہ زور سے چیخا۔

میں جلدی سے کمرے سے نکل آئی کہ یہ اس کا حکم تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میری ذات اس کی اذیت میں اضافے کا باعث ہو، میں کھڑکی میں کھڑی تھی، میری نگاہ گلابوں کے تختے پر تھی اور میں سفیان کے بارے میں ہی سوچے چلی جا رہی تھی۔

"میں جا رہا ہوں۔" اس کی آواز میں طوفانوں کی سی تندی تھی۔

"کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہاں زینو! آج میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے تمہیں بے انتہا چاہا ہے، لیکن میں مکمل طور پر زہریلا ہو چکا ہوں اور ڈسنا میری فطرت بن گئی ہے لیکن میں تم سے انتقام نہیں لے سکتا۔ میں نہیں چاہتا زینو کہ میرے اندر کی آگ تمہیں بھی بھسم کر دے اور لڑکیوں کی بات الگ ہے تم تو میری چاہت ہو۔"

وہ جانے کیسے کیسے اعتراف کر رہا تھا۔ میں خاموش کھڑی سنتی رہی۔ پھر ایک دم سے بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ اس کی لہو لہو آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ اُف یہ زخم زخم نگاہیں میری روح میں ترازو ہو گئیں۔ جی چاہا وہ سلگتا چہرہ اپنے دل میں چھپا لوں۔ عجیب بات ہے مجھے اس سے ذرا نفرت محسوس نہ ہوئی۔ وہ جو اتنی معصوم لڑکیوں کے دل سے کھیل چکا تھا، لیکن وہ تو ذہنی مریض تھا، میرا جی چاہا اپنے آنچل سے ماضی کی ساری گرد صاف کر دوں کہ اس کے دل کا آئینہ جگمگا اٹھے۔

اپنی محویت سے چونک کے میں باہر کی طرف لپکی۔ اس کی طبیعت بے حد خراب تھی اور ذہنی حالت بے حد دگرگوں تھی۔ اوپر سے طوفان آنے کو ہے، وہ کیسے ڈرائیونگ کرے گا ایسی حالت میں۔

لیکن وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میرے دل نے کتنی ہی بیٹس مس کر دیں۔ ساکت ہو گیا کہ میں سمجھی کہ مجھے بھی ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔

اس کی ریڈ گاڑی دور ہوتی چلی گئی۔ ایک نقطہ بن گئی پھر یہ نقطہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا دل گہری تاریکی میں گرتا جا رہا تھا اور روح پر کہر سی چھا رہی تھی۔ فون کی بیل پر میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا اور پھر وہی ہوا جس کا احساس میری چھٹی حس چیخ چیخ کے دلا رہی تھی۔ ہاسپٹل سے فون تھا۔ سفیان علی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے حالت نازک ہے۔"

پاشا انکل تو خود ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ انہیں ایک سہیلی کے ایکسیڈنٹ کا کہہ کے میں بوا کے ساتھ یہاں بھاگی آئی تھی۔ بوا معلومات لینے کے لیے ڈاکٹر کی تلاش میں چلی گئیں اور میں تنہا تھی اپنی وحشتوں کے اظہار میں آزاد۔

اُس کے ساکت جسم میں خفیف سی جنبش ہوئی۔ اس کے پپوٹے ہولے سے لرزے، میں پھر سے جی اٹھی۔ میں نے اُس کا ڈرپ سے آزاد ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بے خودی بولتی چلی گئی۔

"میں تمہیں نفرت کے اس تاریک جنگل میں نہیں بھٹکنے دوں گا۔ میں کروں گی تمہاری راہوں میں اُجالا۔ میں بنوں گی مشعل، تمہاری ذات کے

سب اندھیرے دور کردوں گی۔ میں تمہارا سارا زہر چوس لوں گی۔ ہاں میں یہ تجربہ کر کے رہوں گی خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

سفیان! میں خود کو مٹا ڈالوں گی تمہاری خاطر، آنکھیں کھولو سفیان آنے والا کل بہت روشن ہے، زندگی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ تمہاری منتظر ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اور میری آنکھوں سے چشمے پھوٹ کے اس کے سرد ہاتھ تر کرنے لگے۔

بارشوں میں بھیگنا کسے اچھا نہیں لگتا
مگر اے برسنے کے لیے بے تاب بادل
تم لوٹ جاؤ
کہ میں جانتی ہوں
تم رات کی رات یہاں برسو گے
اور
صبح تمہاری منزل
کوئی اور پیاسی دھرتی ہوگی

تائی اماں اور دادی جان ہمیشہ کی طرح خنسا کے بخیے اُدھیڑنے میں مشغول تھیں۔

''بھلا یہاں کیا کمی تھی اسے بلال ہاتھ باندھے غلام کی طرح ناز برداریاں کرتا۔ دولت، عزت کیا نہ تھا اس کے پاس۔'' تائی اماں کی تلخ آواز میرے کانوں میں سوراخ کرنے لگی۔

''یہ بازاری عورتیں کسی ایک کی ہو کے رہ بھی تو نہیں سکتیں جب تک سو پچاس سے ناز نہ اٹھوالیں۔'' دادی جان نے بھی زہر اُگلا۔

''کمال ہے بچہ بھی اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنا۔'' تائی اماں اپنے اس فیورٹ ٹاپک پر گھنٹوں بول سکتی تھیں۔

''اے بی بی! بچوں کی خاطر جان قربان کرنے والی تو ہم تم جیسی ہوتی ہیں۔ ان ڈال ڈال اُڑنے والی تتلیوں میں ممتا کہاں۔''

''اور وہ بلال میاں بھی بیرون ملک جا چھپے، غضب خدا کا اپنے بچے سنبھالنا مشکل اوپر یہ ایک اور مصیبت۔'' تائی اماں بہت بیزار تھیں۔

''اے لو اس کی بیوفائی کے بعد جگ ہنسائی سے بچنے کو بیچارہ اور کیا کرتا۔ جانے میرا بچہ کس حال ہوگا۔'' دادی کو اپنا بچہ یاد آ گیا، جس حال نے ہمیشہ انہیں سولی پر لٹکائے رکھا تھا۔

''ذلیل گھٹیا، بدکردار، اور اوباش عورت!'' تائی اماں کی آواز میں کس قدر نفرت و حقارت تھی۔

میرے اندر قطرہ قطرہ زہر انجیکٹ ہوتا رہا میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ اور غصے سے کھولتا کمرے سے نکل آیا ان لوگوں کو ماما کو ڈسکس کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں اب ان کی جان بخشی کر بھی دیں۔ کیا خبر ماما کس قدر مجبور ہوں۔ ماما سے ملے بغیر ان کے بارے میں کیسے رائے قائم کر سکتا ہوں، لیکن میں ان سے کیسے مل سکتا ہوں۔ مجھے ان کے گھر کا ایڈریس بھی نہیں معلوم چینل پر شاید مجھے کوئی گھسنے بھی نہ دے۔ ماما کتنی خوبصورت ہیں، بلوری آنکھیں خوبصورت سنہری بال اور چہرہ کسی تازہ گلاب کی طرح گلابی۔

ہونہہ! ان عورتوں کی تو عادت ہی یہ ہوتی ہے غیر موجود لوگوں کے بارے میں فضول باتیں کرنا۔ میں ماما سے ملوں گا جب بھی موقع ملا اور ان سے کہوں گا۔

''ماما پلیز ڈیئر ماما! مجھے اپنے پاس ہی رکھ لیں۔ مجھے بہت برا لگتا ہے جب تائی امان اور دادی جان آپ کے بارے میں بری بری باتیں

کرتی ہیں اور اب جبکہ پاپا بھی یہاں نہیں تو مجھے اس گھر میں رہ کے کیا کرنا ہے۔'' اور ماما بھلا میری بات ٹال سکیں گی۔ وہ تو خود مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں گی۔ پاپا نے روک دیا ہوگا۔ پاپا نے منع کر دیا ہوگا لیکن اب تو میں بڑا ہو چکا ہوں میں خود فیصلہ سناؤں گا۔ اپنے متعلق کہ آپ لوگوں نے بہت عرصے مجھے ماما سے دور رکھ لیا۔ اب میں ماما کے پاس چلا جاؤں گا ہمیشہ کے لیے، ماما مجھے یاد کر کے کتنا روتی ہوں گی۔

اُس روز ہمارے اسکول میں ڈرامہ تھا۔ مجھے مجنوں کا رول ملا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ خوشی کی یہ بات تھی کہ آج کے فنکشن میں مہمانِ خصوصی کے طور پر خنسا آ رہی تھیں میری ماما آج میں انہیں قریب سے دیکھوں گا۔ اُن سے ملوں گا وہ مجھ سے مل کر کتنی خوش ہوں گی۔ کیا خبر وہ مجھے پہچانیں بھی یا نہیں، اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ میں اپنے اسکول کا ہیڈ بوائے ہوں اور سب سے زیادہ ٹرافیاں جیتنے والا یہ بریلیئٹ اسٹوڈنٹ سفیان علی ان کا اپنا بیٹا ان کا صفی ہے تو کتنا فخر ہوگا انہیں۔''

سب سے اگلی رو میں وہ میڈم ظاہرہ کے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھیں۔ گولڈن آئی شیڈ سے سجی ان کی آنکھیں ان کے سنہری بال سمٹ کے جوڑے کی شکل میں ان کے وقار سے اٹھی ہوئی گردن پر سجے تھے، ان کا چہرہ لائٹ میک اپ میں کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ کھلے ہوئے پھول کی مانند وہ کس قدر باوقار، کتنی پیاری لگ رہی تھیں وہ آتے ہی ساری محفل پر چھا گئی تھیں۔ میری تو نگاہ ان کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی، لگتا تھا یہ کوئی خوبصورت خواب ہے، آنکھ جھپکی تو نظارہ بدل جائے گا۔

مجھے فرسٹ پرائز ملا تھا۔ تالیوں کی گونج میں ماما کے ہاتھ سے پرائز وصول کیا۔ ماما مسکرا رہی تھیں فلیش لائٹس کے جھماکے ہو رہے تھے، میرا دل پگھل رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں وہی آٹھ سالہ صفی بن گیا ہوں، رو رو کے ماما سے کہتا ہوا۔

''ماما مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں، میں یہاں نہیں رہوں گا۔'' میں ماما سے لپٹ گیا تھا اور پاپا نے مجھے گھسیٹ کر ان سے جدا کیا تھا۔

وہ اپنی نشست پر بیٹھ گئیں، بچے ان سے آٹو گراف لے رہے تھے، میں لپک کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''آپ کی آٹو گراف بک؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

''میرا نام سفیان علی ہے۔'' مجھے لگا اُن کا مسکراتا چہرہ ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔

''کیا مجھے دیکھ کے اس نام سے آپ کو کچھ بھی یاد نہیں آیا؟''

''کیا مطلب؟''

''ماما مجھے پہچانیں میں سفیان ہوں آپ کا بیٹا......آپ کا صفی ماما پلیز۔''

گئے دنوں کا ایک ایک دکھ میری آنکھوں میں فلم کی طرح چلنے لگا۔

''شٹ اپ اسٹوپڈ! نان سینس' میں تمہیں نہیں جانتی۔ تم کون ہو اور یہ سب کیا خرافات سُنا رہے ہو۔'' وہ دھیمی آواز میں گرجیں ان کی آواز بجلی کی طرح میرے دل پر گری۔

تب میں بہت ناسمجھ، مکروفریب سے ناآشنا تھا یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خنسا نے خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا تھا اور ظاہر ہے کہ اتنے بڑے لڑکے کی ماں ہونے کا اعتراف کرنے سے ان کی ریپوٹیشن خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ ان کی ویلیو

ڈاؤن ہو جاتی۔

افضل میرا بازو تھام کر وہاں سے ہٹا لے گیا۔

''تم نے خنسا کو کیا کہہ دیا۔ بہت غصے میں لگ رہی تھیں۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں میری طبیعت خراب ہو رہی ہے میں گھر جا رہا ہوں۔'' میں نے اسے ٹال دیا۔

''آج میرے بیٹے نے کتنے انعام جیتے ہیں؟'' دادی اماں میری پیشانی چوم کے دریافت کر رہی تھیں۔

''کوئی بھی نہیں، آج میں ہار گیا ہوں دادی اماں! ایسی شکست مجھے زندگی میں کبھی نہیں ہوئی۔'' اور دادی اماں حیرانی سے مجھے تکتی رہ گئیں۔

تائی اماں مرغیوں کی دیکھ بھال میں مشغول تھیں۔

''یہ سرمئی مرغا پتا نہیں اتنا گرا گرا کیوں رہتا ہے سفیان آج اسے ٹیکہ تو لگوا لینا ڈاکٹر سے۔''

''جی بہتر۔''

''تائی اماں آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

''کہو، کیا پوچھنا ہے؟''

''تائی اماں پلیز مجھے خنسا کے بارے میں بتائیں سب کچھ۔'' (چاہتے ہوئے بھی ماما منہ سے نہ نکلا۔

میں ان کے قریب ہی بیٹھ گیا زمین پر۔ اپنے اُجلے کپڑوں کی پروا کیے بغیر ان کے چھوٹے سے پولٹری فارم کی بدبو سے بے خبر ہو کر ویسے تو اس پورشن کی طرف آتا ہی نہ تھا۔

''خنسا بلال کی کلاس فیلو تھی، جانے کیا چکر چلایا کہ بلال اُسی کا دیوانہ ہو گیا۔ زہر کھانے کی دھمکی دے کر اس سے شادی کروائی اور پھر ساری دنیا سے بے خبر ہو گیا۔ بس ہر وقت راج ہنس بنے دونوں چلہیں کرتے رہتے، بلال نے پڑھائی کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ جب تم پانچ سال کے تھے، تو خنسا کی دوستی ٹی وی میں چھوٹے موٹے رول کرنے والی ڈولی سے ہو گئی بس وہیں سے اس کا دماغ پھر گیا۔ یوں بھی ایسی عورتیں گھر کی ہو کر کب رہ سکتی ہیں۔ وہ ٹی وی ڈراموں میں کام کرنا چاہتی تھی جبکہ بلال سختی سے مخالفت کرتا روز روز لڑائی جھگڑا۔ آخر ایک دن اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ بلال بھی آخر کہاں تک برداشت کرتا۔ اُس نے بھی غصے میں طلاق دے دی اور وہ بڑے اطمینان سے رخصت ہو گئی۔ اس نے تمہارا بھی خیال نہ کیا۔ تمہاری پھیلی ہوئی بانہوں کو بھی نظر انداز کر دیا۔

اگر وہ چاہتی تو بلال اس کے حق میں تم سے دستبردار ہو سکتا تھا۔ وہ عورت کہاں، عورت کے نام پر دھبہ تھی۔ باعث بدنامی تائی اماں گھنٹوں اپنے پسندیدہ موضوع پر بول سکتی تھیں، لیکن مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ میں چلا آیا۔

''ارے کہاں چل دیے، سرمئی مرغ کو تو ٹیکہ لگوا لاؤ۔'' تائی اماں پکاریں۔

''تائی اماں پھر کبھی۔''

''اسے دیکھو ذرا دو گھنٹے باتیں بگھارتا رہا اور کام کا وقت آیا تو...... ارے ہے کس ماں کا بیٹا جو بھی نہ کرے کم ہے۔''

کمرے تک ان کی آواز میرا تعاقب کرتی رہی۔ میری آنکھوں میں گرم ریت چبھ رہی تھی، میرے دل کا کانچ تڑخ رہا تھا۔ میرا دماغ چیخ رہا تھا۔ کیا تھا جو میں خنسا کے وجود سے بے خبر رہتا۔ تائی اماں کم عمری میں ہی میرے اندر اپنی زہریلی گفتگو انجیکٹ نہ کرتیں یا پھر پاپا ہی مجھے یوں تنہا نہ چھوڑ جاتے یا آج خنسا ہی نہ دکھائی دیتی۔

اور اُس روز میں مکمل زہریلا ہو گیا۔

"میں انتقام لوں گا اُن سبز آنکھوں سے، سنہری بالوں سے اُس گلابی چہرے سے، ہاں میں قسم کھاتا ہوں اپنے دل میں اٹھنے والے اس طوفان کی کہ میری زندگی کا مقصد ہی انتقام ہے۔" اور مجھے یوں لگا میری رگوں میں لہو کے بجائے نیلا زہر دوڑ رہا تھا۔ اور نفرت کی چنگاریاں اس زہر کے سنگ سنگ میرے جسم کی ایک ایک رگ میں پھیل گئی ہیں۔

انسانیت کی موت ہو گئی ہے اور میں نے مکمل شیطان کا روپ دھار لیا ہے، میرا ضمیر آنکھیں موند کے کسی گڑھے میں جا سویا ہے۔

☆......☆......☆

وہ ہمارے نئے کرایہ دار تھے۔ میرا اکنامکس کا ٹیسٹ تھا اور میں لان میں بیٹھا بڑی محویت سے اسٹڈی کر رہا تھا کہ تواتر سے بجتی کال بیل نے سخت ڈسٹرب کیا میں جھنجلاتا ہوا اٹھا گیٹ کھولا۔ وہ سرپوش سے ڈھکی پلیٹ پکڑے کھڑی تھی میری نگاہ اس پر گڑ گئی۔ اس کی سبز آنکھیں، شانوں پر بکھرے سنہری بال کھلے ہوئے گلاب کی طرح خوبصورت چہرہ، میرے دماغ میں سیاہ آندھیاں چلنے لگیں، میرا جی چاہا یہ یہیں کھڑے کھڑے بھسم ہو جائے۔

"یہ امی نے بھجوایا ہے۔" اس نے پلیٹ میری طرف بڑھائی۔ اس کی آواز سے میں اپنے حواسوں میں لوٹ آیا اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ چھپاک سے اندر گھس گئی۔ اور اس کے واپس آنے تک میں ساری اسکیم مرتب کر چکا تھا۔

"کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟" میں نے بڑی خوبصورت مسکراہٹ چہرے پر سجا کے گہری گہری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے زینو کہتے ہیں۔"

"بہت خوبصورت نام ہے بالکل آپ کی طرح۔" اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

پھر آتے جاتے چھت سے ایک آدھ ڈائیلاگ ہو جاتا۔ اس کی ممی کہیں جاب کرتی تھیں۔ ان دنوں گرمی کی چھٹیاں تھیں اور وہ سارا دن بوڑھی ملازمہ کے ساتھ گھر پر تنہا ہوتی، اسی تنہائی سے گھبرا کے وہ میری طرف بڑھی تھی۔ وہ گھنٹوں چھت کی مشترکہ دیوار سے لگی رہتی۔ ہماری دوستی محبت تک جا پہنچی۔

"زینو! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"میں بھی تو......" وہ شرما جاتی۔

"آئی لو یو......" میں مخمورسی آواز بنا کے کہتا۔

"آئی لو یو! ٹو سفیان۔"

"لیکن اگر تمہارے والدین نہ مانے تو سنا ہے تمہارے یہاں آؤٹ آف فیملی شادیاں نہیں ہوتیں۔"

"میں تمہاری خاطر سارے زمانے سے ٹکرا لوں گی۔"

"تم بدل تو نہ جاؤ گی زینو!"

"تمہارا نام دل پر لکھا ہے سفیان! کبھی دل بھی بدلتے ہیں۔"

"اگر تم مجھے نہ ملیں تو تمہاری قسم خود کو شوٹ کر لوں گا۔" وہ تڑپ کے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔

"یوں نہ کہو سفیان! ہم کورٹ میرج کر لیں گے صرف چند سال ہی کی تو بات ہے۔"

وہ 18 سالہ بڑھ چڑھ کے اسکیمیں بنا رہی تھی۔ مجھ سے بھی زیادہ پُرجوش تھی وہ۔

''زینو! میرا بہت دل چاہتا ہے' تم مجھے کارڈ لکھو۔''

''لیکن ہم ہر روز اتنی باتیں تو کرتے ہیں پھر بھلا کارڈ۔''

''تم میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کرسکتیں، دیکھ لی تمہاری محبت۔'' میں خفگی سے منہ پھلا کے چلا آیا۔

''سنو سفیان رُکو!'' وہ پکارتی رہ گئی میں نے ایک نہ سنی۔

اگلے روز حسب توقع ایک شاندار رومانٹک محبت نامہ میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ واہ واہ کیا کیا شاندار رومانٹک اشعار تھے جہاں نثر نگاری سے گزارہ نہ ہوا وہاں خوب مرصع اشعار بیس صفحوں کا محبت نامہ۔ چند ہی دن بعد میں زینو کی امی کے آفس جا پہنچا۔

''آؤ بیٹا! کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے۔'' وہ خوشدلی سے بولیں۔

''جی آنٹی! تقریباً خیریت ہی ہے دراصل مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا ہے، میں نہیں چاہتا کہ انکل کو بھی اس معاملے کی بھنک پڑے۔''

''ہاں ہاں کہو۔'' میں نے بڑے اطمینان سے جیب سے وہ محبت نامہ نکال کے ان کی خدمت میں پیش کردیا اور مزے سے اُن کے سلگنے کا نظارہ کرنے لگا۔

''میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی زینو ایسی حرکت کرے گی۔ زینو ابھی چھوٹی سی تو ہے اور......'' اپنی پیشانی تھامے بڑبڑا رہی تھیں۔ میں نے اور پیٹرول چھڑکا۔

''دیکھیں نہ آنٹی! اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کتنی بری بات ہے آنٹی زینو کو ایسی چیپ حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''سفیان بیٹے! تم کسی سے مت کہنا۔''

''نہیں آنٹی! آپ کی عزت میری عزت ہے، میں تو بھول جاؤں گا کہ کبھی مجھے ایسا کوئی کارڈ ملا بھی تھا۔''

''جیتے رہو بیٹا! کتنے اچھے ہو تم۔''

''اچھا آنٹی! اب اجازت میں چلتا ہوں۔''

میں مسرور و شاداں گھر چلا آیا' اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر آنے والے طوفان کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ بجے زینو کے گھر سے' آنٹی کی گرج چمک اور دھموکوں کی آواز آنے لگیں۔ میں جالی سے لگا اندر کا سین دیکھ رہا تھا۔

''کمبخت بے شرم! ابھی سے تیرے یہ کرتوت ہیں' تو نے مجھے دنیا کو منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا۔'' وہ اس کے سنہری بال نوچ رہی تھیں۔ اس کے گلابی چہرے پر طمانچے رسید کررہی تھیں۔ زینو کی سبز آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں اور میرے دل میں کیسی سکون کی لہریں اُترتی جارہی تھیں، کیسا شانت ہورہا تھا میں، بہت عرصے بعد میرا دل زور زور سے قہقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر میں دیر تک ہنستا رہا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ میرے دماغ میں نوکیلی سلاخیں پیوست ہونے لگیں۔ ناقابلِ برداشت اذیت میری نس نس کاٹنے لگی، اور میں بے دم سا ہو کے گر گیا۔

اتنی اچھی نیند آرہی تھی کھٹر پٹر کی آواز سے آنکھ کھل گئی وہ الماری میں سر گھسیڑے جانے کیا تلاش کررہی تھی۔

''اے کون ہو تم اور سویرے سویرے یوں تلاشیاں کیوں لیتی پھر رہی ہو۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''میں چور نہیں ہوں جی! الماری سے بی بی

کی عینک ڈھونڈ رہی ہوں۔ قسم لے لیں، جو کبھی ایک تنکا بھی اِدھر سے اُدھر کیا ہو۔"

وہ میری طرف گھوم کے صفائیاں پیش کر رہی تھی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ پھر وہی سبز آنکھیں وہ چہرہ میرے سامنے تھا۔ میرا موڈ ایکدم سے خوشگوار ہو گیا۔

"ہاں تو نام کیا ہے تمہارا؟"

"کا کی ہے میرا نام...... بوٹا نائی کی بیٹی ہوں، اب میں جاؤں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کے شاہانہ انداز میں اجازت دی، پھوپو کے ہاں اس دور افتادہ دیہات کی پہلی صبح کا آغاز ہی خاصا دل خوش کن تھا۔ مجھے ویسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسے کسی بھیڑیے کو اپنا شکار دیکھ کے ہوتی ہے۔

اگلے روز میں سیر کے لیے دور تک نکل گیا۔ میری نگاہیں ہر طرف اسی کو کھوج رہی تھیں اور پھر وہ مجھے دکھائی دے گئی۔ سر پر پانی کا مٹکا اٹھائے۔ گاجر کھاتی چلی آرہی تھی واہ کیا آرٹ تھا۔ وہ ہاتھ چھوڑے خراماں خراماں چلی آرہی تھی، مجال ہے ایک چھینٹا بھی اچھل کر زمین پر گر جائے۔ کیسی جفاکش ہوتی ہیں یہ دیہاتی لڑکیاں مجھی اِس نازک گردن پر یہ اتنا بوجھ، میں حیرت سے تکتا رہ گیا۔

"سلام صاحب!" وہ کھلکھلائی۔

"اتنا بوجھ اٹھانے سے تھکتی نہیں۔"

"نہ صاحب تھکن کا ہم غریبوں کے پاس کیا کام، یہ تو آپ بادشاہ لوگوں کو ہوتی ہے۔"

"میری ملکہ بنو گی کا کی؟" پکے شکاری کی طرح میں نے اپنے شکار کو چارہ ڈالا۔

"مذاق نہ کرو صاحب!" وہ حیران سی مجھے دیکھتی رہ گئی۔

"کہاں آپ اور کہاں میں......"

پھر میری اس سے ملاقات کپاس کے کھیتوں میں ہوئی۔ عورتیں بڑی تیزی سے جھولی میں کپاس چُن چُن کے بھر رہی تھیں، اس کی اسپیڈ سب سے تیز تھی، میں حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے دیہات کی ہر چیز ہی انوکھی تھی اور میں کبھی اتنے دن نہ رُکتا اگر یہاں کا کی نہ ہوتی اور اگر میرے دل میں انتقام کے شعلے نہ لپک رہے ہوتے، اور اب کا کی اس آگ کا نشانہ بننے کو تھی۔

وہ میری طرف دیکھ کے بڑے دلآ ویز انداز میں مسکرائی، اس مسکراہٹ سے مجھے بہت حوصلہ ملا اور پھر معاملات بہت تیزی سے طے ہوئے ہم چھپ چھپ کے ملتے رہے، ساتھ جینے مرنے کی میں نے جھوٹی اور اُس نے سچی قسمیں کھائیں۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کے قسم کھلوائی کہ وہ میری اور اپنی محبت کا تذکرہ کسی سے نہیں کرے گی، اپنی عزیز ترین سکھی سے بھی نہیں ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا اور اسے اپنی ملکہ نہیں بناؤں گا۔ اور پھر وہ رات بھی آگئی جس کے لیے میں اتنے پاپڑ بیل رہا تھا۔ میں نے اسے خوب جذباتی کر کے گھر سے فرار پر آمادہ کر لیا۔

اُس رات گاؤں میں بہت بڑے میلے کا اہتمام تھا، سارا گاؤں رونق اور روشنیوں کا مرقع بنا تھا اور اس کے پکڑے جانے کے بہت واضح امکانات تھے، رات دیر تک میں جاگتا رہا۔ پتا نہیں کا کی پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اُس اجاڑ کھنڈر میں زیورات کی پوٹلی تھامے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ تاریک سرد رات میں اپنے گرم بستر میں گھسا ٹھٹھرتی کانپتی کا کی کا تصور کر کے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس کی خوف سے پھٹی پھٹی سبز آنکھیں اس کا رنگ اڑا چہرہ سرد ہواؤں میں لرزتا

کانپتا وجود، میرے دل میں انبساط کی لہریں اٹھنے لگیں۔

"کمرہ کس قدر گندہ ہو رہا ہے؟ صفائی کرنے والی کیا نام ہے اس کا کا کی نہیں آئی آج؟" میں نے نہایت مکاری سے پھوپو کی ماما سے پوچھا۔

"وہ کیسے آسکتی ہے اس کا تو تک ٹوٹ گیا ہے۔ (کمر ٹوٹ گئی ہے) منجی پر پڑی ہے۔

"کیا کوئی حادثہ ہو گیا؟" میں نے اپنی بیتابی چھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اب میں آپ کو کیا بتاؤں کمبخت دیکھنے میں اتنی معصوم لگتی تھی رات بارہ بجے کپڑوں اور زیور کی پوٹلی بغل میں دبائے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے بھائی کی آنکھ کھل گئی تو اس نے اپنی کلہاڑی کا دستہ اس کی کمر پر دے مارا اور پھر گھسیٹ کے اندر لے گیا۔ وہاں جو اس کو چار چوٹ کی مار لگائی باپ بھائیوں نے، کیا ہی کسی کالے چور کو پڑتی ہو گی ایسی مار...... تھپڑوں، لاتوں، گھونسوں سے بھرکس نکال دیا ہے، اس ذلیل بے شرم کا۔ مہینہ ہلدی چونا تھوپے گی، ڈاکٹری علاج کرائے گی پھر کہیں اٹھنے کے قابل ہو گی۔ لیں بھلا میں آپ کے سامنے کیا قصہ چھیڑ بیٹھی۔ میں ابھی ماسی جیراں کو بھیجتی ہوں۔ آپ کا کمرہ صاف کر جائے۔"

تھپڑ، لاتیں، گھونسے، اس حسین چہرے پر پڑے ہوں گے۔ وہ چیخی ہو گی اس کا چہرہ کیسے فق ہو گیا ہو گا۔ واہ کہاں کمند ٹوٹی جبکہ لب بام پانچ چھ ہاتھ ہی تھا۔ ہونہہ ملکہ بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اور رو رو کے سرخ آنکھیں وہ سوجا ہوا چہرہ وہ اجڑے بال۔

میرے اندر کی آگ سرد ہوتی جا رہی تھی، جلتے بھانبڑ اس کے آنسوؤں سے فنا ہو رہے تھے۔

"ہاہاہا، میں قہقہے لگا رہا تھا۔ آج دوسری مرتبہ میں نے خنسا کو شکست دی تھی، ان سبز آنکھوں کو، ان سنہری بالوں کو، اس گلابی چہرے کو جی چاہ رہا تھا خوب ناچوں گاؤں اپنی کامیابی کا جشن مناؤں۔ لیکن اُف مجھے نجانے کیا ہو رہا تھا۔ میرا دل کہیں پاتال میں اُترا جا رہا تھا اور میرے دماغ میں کیسی شدید درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سر پھٹنے کو تھا، نجانے مجھے خوشیاں راس کیوں نہیں آتیں۔

☆......☆......☆

اور پھر کتنی ہی نیلی سبز آنکھوں میں، میں نے آنسو بھرے مجھے کچھ یاد نہ تھا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ میرے اندر کی آگ سرد ہونے میں ہی نہ آئی تھی، اور میں خنسا سے مشابہ ہر چہرے کو دیکھ کر غصے سے پاگل ہو اٹھتا۔ اکثر لڑکیاں میرے فریب میں آ جاتیں، اور میں قدِ آئینے کے سامنے خود کو غور سے دیکھتا۔ یہ وجاہت، یہ خوبروئی، ایسا ویل ڈریسڈ، خوش مزاج شخص آخر کچھ تو ہے مجھ میں جو لڑکیاں میرے اک اشارے پر کھنچی چلی آتی ہیں۔

اب میں اس چھوٹے سے قصبے کی وسیع و عریض لال حویلی کے ایک کمرے میں پڑا سوچے جا رہا تھا کہ میں نے کیا کھویا، کیا پایا۔ زندگی رائیگاں گئی میرے حصے میں نقصان رہا۔ سخت ڈپریسڈ تھا میں پاپا کے دوست کے پاس چلا آیا جو پاپا کے بیرون ملک جانے کے بعد بھی مجھے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے اور جب بھی میری حالت زیادہ شکستہ ہوتی تو سکون کی تلاش میں انہی کے پاس آتا۔

جیرو نے بتایا کہ بڑے صاحب تو زمینوں پر

گئے گھر میں فقط بی بی ہیں (یہ بی بی پتا نہیں کون ہیں انکل نے تو شادی ہی نہیں کی۔ شاید کوئی مہمان ہوں خیر مجھے کیا)

''ارے صفی! یہ تم ہو۔'' اس کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ صفی! لفظ تازیانے کی طرح لگا۔

''نہیں، میں صفی شیطان ہوں۔'' میری دھیمی آواز اس نے شاید سنی نہیں۔

''تم یاد ہے، ہم کتنے عرصے بعد ملے ہیں پورے بیس سال بعد۔'' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ کون ہے جو اس قدر شناسائی کے دعوے کر رہی تھی۔ لمبی لمبی، کشادہ سبز آنکھیں کمر پر پھیلا سنہری بالوں کا آبشار، شگفتہ سا چہرہ۔ میری آنکھوں میں چمک آ گئی اور بھلا یہاں آتے ہوئے میرے خیالوں میں بھی کب تھا کہ شکار خود شکاری کا منتظر ہوگا۔

''تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں میں زینو ہوں یاد ہے۔'' جب میں گرمی کی چھٹیوں میں ماما کے ساتھ یہاں آتی تھی تو ہم کتنا انجوائے کرتے تھے اور جب آم کے پیڑ سے گر کے میرا بازو فریکچر ہو گیا تھا۔ پتا ہے صفی! پچھلے سال ماما کی ڈیتھ ہو گئی اور اس کے آٹھ ماہ بعد پاپا بھی......'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کھلا کھلا چہرہ ایکدم کملا گیا۔ جانے کیوں مجھے اِن آنسو بھری سبز آنکھوں کو دیکھ کے ذرا بھی خوشی نہ ہوئی میں نے اِن ہنستی آنکھوں میں آنسو بھرنے کا عزم کیا تھا لیکن یہ تو پہلے ہی رو رہی تھی۔

''بہت دکھ ہوا آنٹی اور انکل کا سن کے۔''

''اوہ! میں نے تمہیں بھی اُداس کر دیا۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارے لیے کولڈ ڈرنک بھجواتی ہوں۔ تمہیں مینگو اسکوائش پسند ہے نا! یاد ہے میں بوا جی سے چوری چوری تمہارے لیے کچن سے اسکوائش اُڑا کے لاتی تھی۔'' وہ ہلتے پردوں کے پیچھے غائب ہو گئی اور میرا دل گداز سا ہو رہا تھا۔ جیسے ہم وہی چھوٹے چھوٹے آگے پیچھے بھاگتے درختوں پر چڑھتے بچے ہوں۔

☆......☆......☆

''یہ کیا بوریت ہے بھئی' اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے لان میں آ جاؤ۔'' سفید دوپٹے میں گھرا اس کا چہرہ کتنا پیارا حوروں جیسا لگ رہا تھا۔

''اٹھو نا صفی! کیا سوچ رہے ہو بھئی؟ انکل کے نہ آنے سے اُداس ہو گئے ہو۔'' ایک تو یہ جب مجھے صفی کہتی تو جی چاہتا تھا۔ نہر میں چھلانگ لگا دوں۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے اسے ٹالنے کو کہا۔ حقیقت یہ ہے اسے دیکھ کے میں دو حصوں میں بٹ جاتا تھا اسے فنا کر ڈالوں کیسی عجیب کشمکش تھی کیا تھا۔ کاش اتنے حسین دل والی لڑکی کا چہرہ خنسا جیسا نہ ہوتا۔

''ڈاکٹر کو فون کروں؟'' میں نے اپنے لیے اس کی تشویش کو حیرت سے دیکھا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں، معمولی سر درد ہے۔''

''چائے بنا دوں۔''

''نہیں نہیں۔''

''انکل کے پاس بہت اچھا بام ہے۔''

''او گاڈ! مر نہیں جاؤں گا سر درد سے' چلی جاؤ یہاں سے، مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' جانتی نہیں تھی اس کا وجود مجھے کیسی کشمکش میں مبتلا کر رہا تھا، اور میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے بے دم ہوا جا رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل گئی اور میں اپنی ہی الجھنوں میں کھویا رہا۔

''گڈ مارننگ اب کیسے ہو صفی؟'' وہ سویرے سویرے ہی میری طرف رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''فرسٹ کلاس اور تھینک یُو۔''

''انکل رات آگئے ہیں اور بیتابی سے آپ کے منتظر ہیں۔''

''اوہ گڈ شو زینو! تم نے میرے کل رات کے رویے کا برا تو نہیں مانا وہ دراصل۔''

''کم آن صفی! میں کسی بھی بات کا برا نہیں مانتی اور ہم تو فرینڈ ہیں۔''

''اچھا اب جلدی سے آجاؤ۔ سچ بھوک بالکل نا قابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔''

☆......☆......☆

''ایک بات پوچھوں صفی!'' وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ٹکائے بیٹھی تھی۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنوں نے اس کو ملکوتی حسن عطا کر دیا تھا اور اس پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔

''ہاں کہو۔''

''تم اتنے اُداس کیوں رہتے ہو؟''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا بھئی میں تو بہت خوش باش قسم کا شخص ہوں۔''

''لیکن جب تم ہنستے ہو تو تمہاری آنکھیں ساتھ نہیں دیتیں۔ اور مجھے لگتا ہے تم کوئی بہت بڑا دکھ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہو۔''

''دکھ نہیں نفرت کا الاؤ ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''خوب تو آپ ماہرِ نفسیات بننے کی کوشش فرما رہی ہیں۔''

''ارے نہیں...... میں تو یونہی، ہاں یاد آیا یہاں بہت اچھے پکنک اسپاٹ ہیں، کیوں نہ انکل سے کہہ کے پکنک کا پروگرام بنایا جائے۔''

''سوچیں گے!''

''صفی، پہلے تو تمہیں بہت شوق تھا بوٹنگ کا۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔'' میں نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''ہاں تم پہلے سے بہت لمبے اور اسمارٹ ہوگئے ہو۔'' وہ پیشانی پر آئے بال پیچھے ہٹاتی ہوئی بچوں کی طرح معصوم لگی۔

اور میرا جی چاہا اس کا گلا گھونٹ دوں۔ بھلا یہ کون ہوتی ہے، میرے پتھر وجود میں دراڑیں ڈالنے والی۔

مجھے محسوس ہوا میرا چہرہ تپ رہا ہے، اور میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے صفی؟''

''پاگل ہو گیا ہوں میں، مجھ سے دور رہا کرو۔ ورنہ ان پیڑوں سے لپٹ کے روتی پھرو گی۔'' اور میں اس کو حیران چھوڑ کے گیٹ سے نکلتا چلا گیا۔

جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں اس کا اسیر ہو چکا ہوں۔

☆......☆......☆

اور وہ خنسا کا سا ہی چہرہ تھا۔ لیکن جانے اس چھوٹی سی نازک سی لڑکی میں کیا بات تھی، وہ نفیس خیالات کی پیاری سی لڑکی جو انجانے میں مجھے توڑ پھوڑ تھی۔ اس کے اندر کی خوبصورتیاں جو اس کی آنکھوں میں شمعوں کی طرح جھلملاتی تھیں، کھلی کتاب کی طرح اس کا چہرہ تھا۔ سچا بے ریا جہاں ہمہ وقت پُرخلوص مسکراہٹ کی چاندنی اجالا کیے رہتی اور اس کا دل کسی قدر حساس تھا۔

ایک مرتبہ تو جی چاہا ہاتھ بڑھا کے خوشیوں

کے جگنو اپنی مٹھی میں قید کرلوں پھر کبھی مٹھی نہ کھولوں۔

میرے وجود میں سمائے یہ بھڑکتے شعلے اس کو بھی بھسم کر ڈالیں گے وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ میں اُس کو بھی ڈس لوں گا۔

میں اُسے نہیں اپنا سکتا تھا اور نہ ہی میں اس سے اپنے دل میں اُمڈنے والے ان سنہری جذبوں کا اظہار کرسکتا تھا۔ کیونکہ میری یہ کیفیت یہ جذبے میرے لیے ہی اجنبی تھے مگر میں یہ جانتا تھا کہ میں بہت گناہ گار ہوں اور وہ بہتے ہوئے پانی کی طرح شفاف...... برستی بارش کی طرح اُجلی میں کسی سے محبت نہیں کرسکتا میرے اندر جنگ سی جاری تھی۔

اور اسی کشمکش میں، میں بیمار پڑ گیا۔

''صفی! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تم اتنے لاپروا کیوں ہو اپنی صحت کی طرف سے۔'' وہ ساحری میری بیماری پر جیسے تڑپ ہی گئی۔ اس کا ہاتھ میری پیشانی پر آیا۔ اس کے لمس سے کیسے رگ رگ میں سکون اُترتا جارہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں زینو! اتنی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''تم لیٹے رہو، چپ چاپ اتنا تیز بخار ہے، تم اتنے لاپروا کیوں ہو، ڈاکٹر کو دکھایا۔''

پتا ہے زینو! میرا جی چاہتا ہے یونہی بیمار پڑا رہوں۔ تم زندگی بھر مسیحائی کرتی رہو تم اُکتا تو نہیں جاؤ گی۔'' مجھ پر بے خودی سی طاری ہوگئی۔

''اللہ نہ کرے، تم کیسی باتیں کررہے ہو صفی! خدا نے چاہا تو کل تک تم بالکل ٹھیک ہو گے۔''

''چائے پیو گے؟''

''نہیں۔''

''ڈاکٹر کو فون کروں۔''

''نہیں نہیں، پلیز چلی جاؤ یہاں سے۔''

''میں تمہارا سر دباتی ہوں، مجھے بہت اچھا سر دبانا آتا ہے، درد یوں چٹکی بجاتے میں غائب ہو جائے گا۔''

''گیٹ آؤٹ فرام ہیئر' نہیں چاہیں مجھے تمہاری ہمدردیاں مرنے دو مجھے۔'' میں زور سے چیخا۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

یہ کشمکش میری جان لے لے گی اور گھٹن ناقابلِ برداشت ہورہی تھی، میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں یہ جادونگری چھوڑ چلا جاؤں گا پھر کبھی پلٹ کے نہ آنے کے لیے، لیکن میں ایسے تو نہیں جاسکتا، کوئی تو ہو، جس سے انسان سب کچھ کہہ سکے، اپنا دل چاک کرکے دکھا سکتے جس کے سامنے اپنے تمام زخم عیاں کردے، میں نے زینو کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا۔

''میں جارہا ہوں کیونکہ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں آج میں اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے تمہیں بے انتہا چاہا ہے، لیکن میں مکمل طور پر زہریلا ہوچکا ہوں اور ڈسنا میری فطرت بن گئی ہے، لیکن تم سے انتقام نہیں لے سکتا۔ میں نہیں چاہتا زینو کہ میرے اندر کی آگ تمہیں بھی بھسم کردے۔

اور میں نے اس سے کچھ بھی نہ چھپایا، ہر گناہ کا اعتراف کرلیا۔

''اے دنیا کی سب سے اچھی لڑکی مت لٹاؤ اپنے سچے جذبے مجھ پر میں اس قابل نہیں ہوں، میں بہت ذلیل، بہت گھٹیا شخص ہوں زینو! میری رگوں میں زہر دوڑ رہا ہے اور یہ زہر جانے کتنوں کے برباد کرچکا ہے، مجھ سے نفرت کرو، مجھ پر پتھر برساؤ۔''

وہ مجسمہ بنی ساکت کھڑی رہ گئی میں دل کا بوجھ ہلکا کرکے گاڑی کی طرف بڑھا۔ مجھے جاتے

دیکھ کر وہ میری طرف لپکی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی، شاید مجھے روک رہی تھی، لیکن میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے، میرا دل بند ہونے کو تھا اور میرے دماغ کو لگتا تھا کوئی نوکیلے کیل سے کھرچ رہا ہے، اور اچانک وہ خوفناک ٹرک اچانک ہی کہیں سے سامنے آ گیا اور پھر تمام منظر اندھیرے میں ڈوبتے چلتے گئے۔

اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور وہ اس کی بے تحاشا سرخ متورم آنکھیں، اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ اور دنیا و مافیہا سے لاپروا بول رہی تھی۔

"میں تمہیں نفرت کے اس تاریک جنگل میں نہیں بھٹکنے دوں گی میں کروں گی۔ تمہاری راہوں میں اُجالا، میں بنوں گی مشعل، تمہاری ذات کے سب اندھیرے دور کردوں گی، میں تمہارا سارا زہر چوس لوں گی۔ ہاں میں یہ تجربہ کر کے رہوں گی خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

"سفیان! میں خود کو مٹا ڈالوں گی تمہاری خاطر۔" آنکھیں کھولو صفی آنے والا کل بہت روشن ہے، اور زندگی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ تمہاری منتظر ہے۔" نیم بے ہوشی کے عالم میں اس کی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

اس نے میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کے آنسوؤں سے میرا سارا ہاتھ تر ہو گیا۔

"زینو! مت رو زینو رونے کے دن بیت گئے۔" میں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میری آواز سن کر جیسے وہ جی اٹھی اس کا چہرہ کھل گیا۔

"تھینک گاڈ! صفی پورے چوبیس گھنٹے بعد تمہیں ہوش آیا ہے تم کیسا فیل کر رہے ہو۔"

"مجھے لگ رہا ہے، میں ایک نئی دنیا میں آ گیا ہوں۔"

"بے انتہا خوبصورت بہت دلکش ہے یہ دنیا جہاں حوروں جیسی پریوں جیسی زینو ہے۔

"مجھے نئی زندگی عطا ہوئی ہے اور یہ زندگی آج سے تمہاری ہوئی۔" میں نے ہولے ہولے کہا۔ وہ جلتا چہرہ لیے مجھ پر جھکی تھی۔

"میں نے معاف کر دیا ہے ماما کو، پاپا کو، تائی اماں کو، خود اپنے آپ کو، آج انتقام کا باب بند ہوا۔ اور زینو میری رگوں میں سرخ سرخ لہو کے ساتھ تمہاری محبت کے جگنو گردش کر رہے ہیں آج میں نے اپنی زنجیریں توڑ دی ہیں۔ میں آزاد ہو گیا ہوں اور میرے اندر کوئی جنگ نہیں ہو رہی۔"

وہ پاگل لڑکی اتنی بے تحاشا خوشی پا کے روئے جا رہی تھی، اس کے رونے سے مجھے بہت تکلیف ہو رہی تھی اور شاید بولنے کے باعث میں نقاہت بھی محسوس کر رہا تھا۔

"میں کتنا پاگل ہوں خود ہی پلاننگ کر رہا ہوں، تم سے تو دریافت ہی نہیں کیا کہ زینو کیا تمہیں اس پٹیوں میں جکڑے، جگہ جگہ سے فریکچرڈ شخص کا ساتھ قبول ہے؟"

"ہاں!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور پھر شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ میں دلچسپی سے اس روتی ہنستی شرماتی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

سفر بہت سہل ہو گیا تھا، منزل نگاہوں کے سامنے تھی، اور خود تھکے ماندے مسافر کو پکار رہی تھی کہ آ جاؤ اپنے گھروں کو لوٹ چلیں اب وقت آ گیا واپس اپنے گھر لوٹنے کا۔

☆☆......☆☆

قسط 4

''شکر الحمد للہ کہ میں کلمہ گو ہوں اور اللہ پاک نے مجھے اتنی جرأت دی ہے کہ میں صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہہ سکتی ہوں۔ تم نے کیا کیا ہے اپنے گاؤں کے لیے آج تک؟ گاؤں کا واحد اسکول گائے بھینسوں کا باڑا بنا ہوا ہے۔ اور کتنے لوگ ہیں جنہیں کلمہ تک یاد نہیں ہے لیکن وہ مسلمان ہیں، یہ سب......

''تو شہر نہیں گئی۔'' رضیہ نے ذویا سے پوچھا۔
''یہ شادی دیکھ کے جاؤں گی۔''
''بہت سوہنی لگ رہی ہے تو۔'' رضیہ نے سر سے پاؤں تک اُس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے دل سے سراہا۔
''شکریہ، آپ بھی بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔''
''اچھا!'' وہ شرما سی گئی۔ ذویا نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔
''ذویا باجی! آپ بھی آونا۔'' منشی جی کی لڑکی نرگس نے ذویا کو ڈانس کے لیے بلایا۔ اور اُس کے کہنے کی دیر تھی سبھی لڑکیوں نے کہنا شروع کردیا۔ گانا اُس کی پسند کا ٹیپ پر چلا دیا گیا۔ تو ذویا بھی گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنے لگی۔ گانے کے بول فضا میں گونج رہے تھے۔

ملاں اے تے ماڑا نج یار جو ہے
نج وی ہووے او ساڈا پیار جو ہے
کیوں ڈھولے دا، کیوں ماہی دا میلہ کراں
میں تے لکھ واری، بسم اللہ کراں

رقص کرتے ہوئے یکا یک ذویا کی نظر دروازے پر پڑی تو اُس کے تھرکتے قدم رُک گئے اور بازو پہلو میں گر گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ اور باہر دلاور خان کھڑا اُسے خشمگیں نظروں سے تک رہا تھا۔ ذویا کے پورے بدن میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔
''کیا ہوا ناچو نا؟'' رضیہ نے کہا۔
''ہونہہ دیکھتا ہے تو دیکھے۔'' ذویا نے سر جھٹک کر دوبارہ میوزک کی لے پر رقص شروع کردیا۔
وہ اپنی حسین و دلنشین لگ رہی تھی کہ دلاور خان اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تو ذویا نے اُسے مسلسل اپنی جانب متوجہ پا کر غصے میں آتے ہوئے رقص کرنا چھوڑا اور رضیہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
''تم تو بہت اچھا ناچتی ہو۔'' رضیہ نے تعریف کی۔
''ناچتی تو آپ بھی ہیں...... وڈیرے سائیں کے اشاروں پر۔''

"یہ تو ہمارا لیکھ (نصیب) ہے۔" رضیہ نے افسردگی سے کہا۔

"یہ دلاور خان یہاں کیوں آیا ہے؟"

"انتظام دیکھنے آیا ہوگا۔ اس شادی کا سارا خرچہ وڈے سائیں اور دلاور خان نے اٹھایا ہے نا...... ماسٹر جی کی تو تنخواہ ہی تھوڑی سی ہے۔ وہ وڈیرے ہاشم کے عتاب کا نشانہ بنا ہوا ہے نا۔ کیا کرے بے چارہ...... اِدھر تو یہی ڈھنگ ہیں۔" رضیہ نے سنجیدگی سے بتایا۔

"شکر ہے کچھ تو نیکی کا کام کیا دلاور خان نے۔" ذویا نے آہستگی سے کہا۔

"ذویا باجی! آپ کو چھوٹے سائیں بلا رہے ہیں۔" گڈو نے آ کر بتایا۔

"کون؟ دلاور خان؟" ذویا نے اُسے حیرانگی سے دیکھا۔

"جی باجی!" گڈو نے سر ہلایا۔

"کیوں؟"

"پتا نہیں؟"

"اچھا چلو کہاں ہیں وہ؟" ذویا کچھ سوچ کر کھڑی ہوگئی۔

"اُدھر پنڈال میں ہیں آپ میرے ساتھ آئیں۔" ذویا اس کی پیروی میں پنڈال تک

آ گئی۔ دلاور خان کاٹن کا کڑکڑاتا سفید رنگ کا کُرتا شلوار اور پشاوری چپل پہنے غضب ڈھا رہا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی اور غصہ نمایاں تھا۔

''تم نے مجھے بلایا ہے؟'' ذویا نے اُس کے سامنے آتے ہی پوچھا تو وہ اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''تم واپس شہر کیوں نہیں گئیں اب تک؟''

''تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ سوال پوچھنے والے؟'' ذویا نے نہایت سنجیدہ پُر اعتماد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میرا کام ختم نہیں ہوا تھا اور میرے رہنے کے ٹھکانے بہت ہیں اس گاؤں میں...... تمہیں تو بہت تکلیف ہو رہی تھی نا میرے حویلی آنے اور رہنے پر تمہارے کہنے پر میں حویلی سے چلی آئی۔ اب میں کہیں بھی رہوں، کچھ بھی کروں۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے مسٹر دلاور۔''

''تم ہماری انسلٹ کر رہی ہو؟'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''او اچھا! اور جو تم نے میرے ساتھ کیا وہ کیا تھا؟'' ذویا نے تلخی سے کہا۔

''انسلٹ تم نے میری کی ہے۔ تم نہ لڑکی عزت کر سکتے ہو اور نہ مہمان کی۔''

''تم اسی لائق ہو۔'' دلاور خان نے تحقیر سے اُسے دیکھا۔

''اگر میں اسی لائق ہوں تو تمہیں کیا پرابلم ہے کہ اب میں کہاں ٹھہری ہوں؟ کیا کر رہی ہوں؟ اور تمہیں کوئی حق نہیں ہے مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کا...... میں نے نہ تو تمہاری کوئی چوری کی ہے نہ ہی تمہارا کوئی اُدھار چکانا ہے جو تم مجھ سے اس قدر روڈلی بی ہیو کرتے ہو۔ میں نہ تو تمہاری رشتے دار ہوں اور نہ ہی زر خرید لونڈی کہ تمہارا جو دل چاہے مجھے کہہ دو۔ نہ اب میں تمہاری مہمان ہوں اور نہ ہی یہ گاؤں تمہاری جاگیر ہے۔ میرے باپ دادا کی زمینیں بھی اسی گاؤں میں ہیں۔ اور میری مہمان داری کرنے والے بہت ہیں یہاں۔'' ذویا نے نہایت سخت لہجے میں جواب دیا۔

''ہونہہ، کسی غلط ہاتھ لگ گئی ناں تو اچھی طرح مہمان نوازی ہو گی تمہاری اسٹوپڈ گرل۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ سبھی تم جیسے بداخلاق اور بدتہذیب ہوں۔ گاؤں کے لوگ سیدھے سادھے ہیں۔ سب تم وڈیروں جیسے خود غرض اور بے حس نہیں ہیں۔''

''ہونہہ، سیدھے لوگ۔'' دلاور خان طنز سے مسکرایا۔

''بی بی یہ گاؤں ضرور ہے مگر یہاں بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو شہروں میں برائی کا باعث بن رہا ہے۔ اور مرد تو مرد ہوتا ہے خواہ شہر کا ہو یا گاؤں کا، اُس کو بھٹکنے میں ایک لمحہ درکار ہے بس۔ تم جو اپنے حسن کا اشتہار بنی پھر رہی ہو نا۔ بے بسی اور ذلت کا اشتہار بھی بن سکتی ہو۔'' وہ اُسے خوفناک نتائج کی دھمکی دے رہا تھا یا سمجھا رہا تھا۔ حقائق سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ اُسی کے اندازِ گفتگو سے بپھر گئی تھی۔

''Go To Hell۔''

''اپنی عزت خاک میں ملانے کا ارادہ ہے تو تمہاری مرضی ورنہ عزت سے یہاں سے چلتی بنو۔'' وہ سپاٹ لہجے میں تلخی لیے ہوئے تھا۔

''چلی جاؤں گی اپنا کام مکمل کر کے۔''

''اپنا کام تمام نہ کروا لینا، ذویا بی بی چلو حویلی۔''

"جی نہیں شکریہ۔" ذویا نے رُخ پھیر لیا۔

"ٹھیک ہے پھر ابھی فون کرو اپنے باپ کو اور بتاؤ انہیں کہ تم ہماری اب مہمان نہیں رہیں، تم یہاں ہماری مہمان بن کے آئی تھیں ہماری ذمے داری تھیں۔ اب اگر خدانخواستہ تمہارے ساتھ یہاں کچھ غلط ہو جاتا ہے تو اس کی ذمے دار تم خود ہو گی۔"

دلاور خان نے اُسی لہجے میں کہا تو وہ مسکرا کے بولی۔

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میرے ساتھ یہاں ضرور کچھ بُرا ہو گا؟ کہیں تم ہی تو میرے ساتھ؟"

"شٹ اَپ۔" وہ اُس کی بات کاٹ کر غصے سے بولا۔

"میں اس علاقے کو یہاں کے مردوں کو وڈیروں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہاں بھوک پیاس اتنی ہی ہے جتنی شہروں میں ہوتی ہے۔ مرد کی بھوک کبھی نہیں مٹتی یاد رکھنا میری یہ بات، شکر کرو کہ ابھی تک بچی ہوئی ہو۔" وہ اُسے ڈرا رہا تھا۔

"شکر الحمدللہ کہ میں کلمہ گو ہوں اور اللہ پاک نے مجھے اتنی جرأت دی ہے کہ میں صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہہ سکتی ہوں۔ تم نے کیا کیا ہے اپنے گاؤں کے لیے آج تک؟ گاؤں کا واحد اسکول گائے بھینسوں کا باڑا بنا ہوا ہے۔ اور کتنے لوگ ہیں جنہیں کلمہ تک یاد نہیں ہے لیکن وہ مسلمان ہیں...... یہ سب نہیں معلوم تمہیں، برائی گمراہی اور جہالت کو ختم کرنے کے لیے تم نے کیا کوئی عملی اقدام کیا؟ نہیں نا...... تم وڈیروں کے ہاتھوں بہنوں، بیٹیوں کی عزت محفوظ نہیں ہے جانتی ہوں میں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے تمہاری تقریر نہیں سننی ہے جو کہا ہے وہ کرو۔" وہ غصے سے بولا۔

"فار یور کائنڈ انفارمیشن میں نے اپنے مما پاپا کو حویلی چھوڑنے سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی اور جب تم نے مجھے حویلی سے چلے جانے کا حکم دیا تو میں نے سب سے پہلے پاپا کو فون کر کے بتایا تھا کہ میں حویلی چھوڑ رہی ہوں، اور یہ بھی کہ کیوں چھوڑ رہی ہوں، اور رہی بات ذمے داری کی تو تم اس قابل ہو کہاں کے کوئی ذمے داری اُٹھا سکو یا نبھا سکو۔ اپنے گریبان میں جھانکو، اپنے اطراف نظر دوڑاؤ تو پتا چلے تمہیں کہ یہاں کتنی بے حیائی پھیلی ہے۔ کس منہ سے تم مجھے میرے کردار کو اور شہر کو برا کہتے ہو؟ کبھی تم نے نماز پڑھی ہے؟ نہیں نا...... تو پھر مجھ سے کس دین اور شرم و حیا کی باتیں کرتے رہے ہو آج تک۔ اوروں کو نصیحت خود میاں فصیحت۔"

"شٹ اَپ!" وہ غصے سے بے قابو ہو کر بولا۔

"بس یہ ایک لفظ ہی سیکھا ہے انگریزی کا۔ "آئی لو یو" کہنا بھی سیکھ لیتے تو کیا تھا سائیں؟" ذویا نے ہنس کر کہا اور اُس پر بھرپور نگاہ ڈال کر واپس پلٹ گئی۔ وہ وہاں کھڑا آگ کی طرح سلگتا رہ گیا۔

ماسٹر جی کی بیٹی بانو کی شادی اگلے دن بخیر و خوبی انجام پائی۔ ذویا نے اپنا سامان تو پیک کر ہی لیا تھا۔ واپسی کے لیے اپنی زمینوں کا چکر لگاتے ہوئے جانے کا ارادہ تھا اُس کا۔ ماسٹر جی کی بیوی حلیمہ نے ذویا کو تحفے کے طور پر کڑھائی والا کرتا دیا۔ ذویا کو وہ کرتا بہت پسند آیا اُس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

گڈو کو جاتے ہوئے پانچ سو روپے دے دیے۔ وہ لینا نہیں چاہ رہا تھا لیکن ذویا نے بہت اپنائیت بھرے اصرار سے کہا تو اُس نے پیسے رکھ لیے۔ وہ اپنی زمینوں کا چکر لگانے رُکی تھی۔ ڈرائیور قاسم منشی جی کے پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ گندم کی

کٹائی ہو چکی تھی۔ گنا اور چاول بھی کھیتوں سے گوداموں تک پہنچ گئی تھی۔ کسان کھیتوں کی صفائی کر رہے تھے۔ زمین کو دوبارہ فصل کی بوائی کے لیے تیار جو کرنا تھا۔

''اوہ...... یہ روڈ مین' پھر آ گیا۔''

ذویا کی نظر سامنے سے آتے دلاور خان پر پڑی تھی جو اپنے گارڈ کے ہمراہ اُسی طرف آ رہا تھا۔

''جب مجھ سے اس قدر نفرت کرتا ہے چڑتا ہے تو میرے آس پاس کیوں منڈلاتا رہتا ہے؟ شاک لگا ہوگا بے چارے کو کے ذویا احتشام جو اُس پر مرتی تھی، اُس سے بات کرنے کو ترستی تھی۔ اب ایکدم سے اُسے اگنور کر رہی ہے، بے دھڑک اُسے کھری کھری سنا رہی ہے ایسا کیسے کر سکتی ہے یہ؟''

ذویا نے دل میں سوچا اور ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ شام کے چار بج رہے تھے اور وہ واپس شہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''تو تم واپس جا رہی ہو؟'' دلاور خان نے اُس کے قریب پہنچ کر اُسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں۔''

''دل نہیں لگا اپنے دوستوں کے بغیر۔'' دلاور خان کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''دوستوں'' کا لفظ اُس نے خاصا دانت پیس کر ادا کیا تھا۔

''ہاں نہیں لگا میرا دل میرے دوستوں کے بغیر کیونکہ میں فرسٹ ٹائم اُن کے بغیر کہیں باہر نکلی ہوں۔ اور مسٹر دلاور میرے دوست میرے بچپن کے ساتھی ہیں ہم سب ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ اپنے دل و دماغ اور نظر کا فتور تم اپنے پاس ہی رکھو تو بہتر ہے۔ میں کون ہوں؟ کیا کرتی ہوں؟ کس سے ملتی ہوں؟ کس سے دوستی کرتی ہوں؟ اس پر کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتے تم۔'' ذویا نے بہت سپاٹ لہجے میں اُسے اچھی طرح سے اُس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ وہ ضبط کر رہا تھا۔

''آواز نیچی رکھو لڑکی!'' وہ سختی سے بولا۔

''تم بھی تمیز سے بات کیا کرو لڑکے! نہ جان نہ پہچان پہنچ جاتے ہو ہر جگہ زہر اُگلنے...... کیوں؟ مجھ سے بات کیے بنا کھانا ہضم نہیں ہوتا تمہارا؟'' ذویا نے بہت شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خوش فہمیاں دیکھو لڑکی کی۔'' وہ طنز سے بولا۔

''میں تو تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا اور نہ ہی تمہاری آواز سُننا چاہتا ہوں دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔''

''میں تو جا ہی رہی تھی مسٹر دلاور تم ہی ہر بار چلے آتے ہو میرے راستے میں۔'' وہ ہنسی۔

''یہ محض اتفاق ہے ورنہ مجھے تمہارے منہ لگنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' وہ نخوت سے سر جھٹک کر بولا۔

''مجھے بھی زہر کا پیالہ منہ سے لگانے کا شوق نہیں ہے۔'' ذویا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اُسی وقت احتشام الحق کی کال آ گئی اُس کے موبائل پر اُس نے فوراً کال پک کر لی۔

''السلام علیکم پاپا! جی میں ٹھیک ہوں۔ بس دس منٹ میں ہم یہاں سے چل پڑیں گے۔ اوکے پاپا! انشاءاللہ! جلد ہی ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔''

''خس کم جہاں پاک۔'' دلاور خان کی آواز تھی ذویا نے تاسف سے اُسے دیکھا۔

''اپنی سوچ اور زبان کو پاک کرو مسٹر دلاور اس سے پہلے کہ کوئی اور تمہارے بارے میں یہ الفاظ استعمال کرے۔''

''شٹ اَپ، جاؤ یہاں سے۔'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

''میں تو جا ہی رہی تھی تم نے ہی یہاں آ کر میرا

ٹائم ویسٹ کیا ہے۔ تمہیں کیا لگا تھا کہ میں نہیں جانا چاہوں گی۔ تم سے اظہارِ محبت کروں گی کہ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گی دلاور، پلیز مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ میں مرجاؤں گی۔'' ذویا نے بہت ادا سے کہا اُسے چڑانے کے لیے۔

''میں جارہا ہوں اب جی سکو تو جی لینا، مرجاؤ تو بہتر ہے۔'' وہ بے رحمی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ذویا نے قاسم کو ہاتھ سے اشارہ کیا آنے کا خود بھی اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نگاہ دائیں بائیں دوڑائی تو اُسے دور سامنے جھاڑیوں میں کوئی آدمی دکھائی دیا۔ جس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور اُس نے پستول سے نشانہ تان رکھا تھا۔ وہ ٹھٹکی، رُکی۔

''اوہ مائی گاڈ!'' ذویا نے پستول کی سمت میں دیکھا تو اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اُس نے دلاور خان کو نشانہ بنایا ہوا تھا۔

''دلاور خان، رُک جاؤ۔'' ذویا اُسے آواز دیتی تیزی سے اُس کی سمت دوڑی تھی۔ ڈرائیور قاسم، منشی جی اور ماسٹر جی بھی اُس کے یوں چیخنے اور دوڑنے پر متوجہ ہوئے تھے۔ مگر دلاور خان نے اُس کی آواز کو اَن سنا کر دیا تھا۔

''رکو دلاور خطرہ ہے آگے رُکو۔'' ذویا تیزی سے بھاگتی ہوئی اُس کے قریب پہنچی تھی۔ ساتھ ہی گولیوں کی آواز فضا میں گونجی اور ذویا دلاور خان کی ڈھال بن گئی تھی۔

وہ خون میں لت پت بے جان ہوتی اُس کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی تھی۔ دلاور خان کے گارڈ نے جوابی فائرنگ کرکے گولی چلانے والے کو بھی زخمی کر دیا تھا۔

''ذویا۔'' دلاور خان نے پاگلوں کی طرح اُسے پکارا۔

''ذویا بی بی!'' ڈرائیور، منشی جی اور ماسٹر جی کے علاوہ گاؤں کے کافی لوگ فائرنگ کی آواز سن کر وہاں پہنچ گئے تھے۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو بی بی کو شہر کے اسپتال لے جانا ہے۔''

دلاور خان چلا رہا تھا۔ ذویا کو خون میں لت پت دیکھ کر اُس کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ وہ اُسے بانہوں میں اُٹھا کر گاڑی کی طرف دوڑا۔ بس ایک لمحہ لگا اس سارے عمل میں۔

اب تو بس جان دینے کی باری ہے محسن
میں کہاں تک ثابت کروں کہ وفا ہے مجھ میں

اس شعر کی تصویر بنی وہ اسپتال کے آئی سی یو میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ مما پاپا، مونٹی، پپی، ٹینا، بوبی، ساجد انکل، رضوانہ ساجد سبھی اسپتال میں پہنچ چکے تھے۔ مما کا رو رو کر برا حال تھا۔

''اب جی سکو تو جی لینا، مرجاؤ تو بہتر ہے۔''

دلاور خان کو اپنے ہی الفاظ تازیانے کی طرح لگ رہے تھے۔ اُس کی قمیض ذویا کے خون سے سرخ ہورہی تھی۔ وہ صدمے سے گنگ کھڑا تھا۔ ذویا کا ہنستا مسکراتا چہرہ، بے خوف اندازِ گفتگو اُس کی شوخیاں، شرارتیں، محبت، توجہ سب کچھ یاد آرہا تھا۔ اور اُس پر اپنی بے حسی، بے اعتنائی اور بدتمیزی اُسے اپنی ہی نظروں سے گرا رہی تھی۔ اُسے ذویا کی بند ہوتی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ دکھائی دی تھی۔ جو اُسے بہت بے چین کررہی تھی۔ دلاور خان کا رواں رواں ذویا کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ گاؤں میں مولوی صاحب نے مسجد میں ذویا کے لیے خصوصی دعا کرائی تھی۔

گولی چلانے والا رستم خان تھا جو اپنے غصے،

انتقام اور حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ ذویا کی دعوت قبول نہ کرنے اور دلاور خان کا اُس کے مویشی اسکول سے باہر نکالنے اور اُسے کھری کھری سُنا کر اُس بے عزتی پر وہ بدلے اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

ذویا کو گاؤں کے بارے میں رپورٹ ٹی وی اور اخبار تک پہنچانے کی سزا تو رستم خان اور ہاشم خان نے دینے کا پلان بنایا ہی تھا...... ایسے کام وہ اپنے خاص آدمیوں سے کرواتے تھے لیکن رستم خان کی جلد بازی اور بے وقوفی کی وجہ سے رستم خان نہ صرف زخمی ہوگیا تھا بلکہ سب کو اُس کی اور ہاشم خان کی درندگی بھی نظر آ گئی تھی۔

دلاور خان کے آدمیوں نے رستم خان کو پولیس کے حوالے کردیا تھا اور اس بار تو کمال یہ ہوا تھا کہ گاؤں والوں نے بھی اُس کے خلاف چشم دید گواہ ہونے کی گواہی دی تھی۔ ہاشم خان غصے سے پیر پٹختا پھر رہا تھا۔ اُسے پارٹی نے اس بار ٹکٹ دینے سے انکار کردیا تھا۔ ذویا کی گاؤں کے بارے میں رپورٹ چلنے پر ہاشم خان کا سیاسی کیریئر تباہ ہوگیا تھا۔ ذویا پر فائرنگ کی خبر بھی ہر چینل کی 'ہاٹ نیوز' بنی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

''ڈاکٹر صاحب! میرا بلڈ گروپ او پوزیٹو ہے میں ذویا کو خون دوں گا۔'' موتی نے ڈاکٹر کامران کی بات سُن کر خود کو سنبھالتے ہوئے کہا تو پپی بھی فوراً بول پڑا۔

''میں بھی، ہمارا بلڈ گروپ ایک ہی ہے۔''

''او کے دیٹس ویری نائس، نرس آپ انہیں لے جائیں اور بلڈ لیں۔'' ڈاکٹر کامران نے نرس کو ہدایت دی۔ وہ دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔

''پلیز ڈاکٹر میری بیٹی کو بچالیں۔'' فائزہ نے روتے ہوئے کہا۔

''آپ دعا کریں مس ذویا کو دو گولیاں لگی ہیں ایک دائیں بازو میں اور...... دوسری گولی نے اُن کی کڈنی Damage کردی ہے۔'' ڈاکٹر کامران کی اس بات نے سب کو بے دم اور خوفزدہ کردیا۔

''ہمیں کڈنی بھی ارینج کرنی ہوگی کوئی ڈونر تلاش کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر کامران نے سنجیدگی سے کہا اور آپریشن تھیٹر میں چلے گئے۔

''میں ذویا کو بلڈ اور کڈنی دینے کے لیے تیار ہوں۔'' دلاور خان نے بے چینی سے کہا تو ٹینا نے غصے سے اُسے دیکھا۔

''آپ اپنی مہربانی اپنے پاس ہی رکھیں مسٹر دلاور خان! ہماری دوست کو آپ کے خون اور گردے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا اگر ہماری ذویا کو کچھ ہوا نا تو ہم تمہیں بھی معاف نہیں کریں گے۔'' ٹینا نے اُسے نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ بے بسی سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔

''ٹینا، چلو یہاں سے۔'' بوبی نے ٹینا سے کہا مگر وہ بپھر گئی۔

''ذویا تمہاری وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔ اور تم نے اُسے اپنے ہی گھر...... میں ذلیل کیا...... تم ہو کیا چیز مسٹر دلاور خان؟''

''ٹینا چپ ہوجاؤ...... یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔'' بوبی نے اُسے شانوں سے پکڑ کر وہاں سے لے جانا چاہا اُس کا لہجہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ دلاور خان کے پاس بولنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بس بے بسی سے نظریں جھکائے ہونٹ کاٹتا ہوا ٹینا کی سُن رہا تھا۔

''کہنے دو مجھے۔'' ٹینا نے اُس کے ہاتھ ہٹائے

، لہجہ بھیگا اور سُلگتا ہوا تھا۔
"کون سی تعلیم حاصل کی ہے تم نے...... جس نے تمہیں عورت کی اور گھر آئے مہمان کی عزت تک کرنا نہیں سکھائی؟ تم ہو کیا دلاور خان؟ اگر تمہاری کوئی اہمیت ہے تو صرف اس لیے کہ ذویا نے تمہیں اہم سمجھا...... تم ذویا کی محبت' عزت اور دی گئی اہمیت کے بغیر نہایت بے وقعت ہو ہمارے لیے...... تمہیں کس بات کا گھمنڈ ہے؟ کیا سمجھا ہے تم نے کہ تمہاری بدتمیزیوں کے باوجود ہم اور ذویا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے؟ ہونہہ تو سُنو تم کچھ نہیں ہو ہمارے لیے اگر ہماری ذویا تمہیں گھاس نہ ڈالے تو۔"
"ٹینا بس کرو، ذوئی کو پتا چلا کہ تم نے اِسے ایسا کہا تو وہ خفا ہوگی۔" بوبی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔
"مجھے کہنے دو بوبی، تمہیں نہیں پتا اس نے ہماری ذوئی پر دوبار ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔" ٹینا نے روتے ہوئے کہا تو وہ شاکڈ رہ گیا اُسے ذویا کا گاؤں میں پہلی صبح ہی چہرے پر انگلیوں کے نشان ہونا یاد آ گیا تھا۔ جب ذویا نے بہانہ بنا دیا تھا۔
"واٹ؟" بوبی نے دلاور کو شعلہ بار نظروں سے دیکھا۔
"بوبی ...... وہ۔" دلاور خان نے کچھ کہنا چاہا مگر بوبی نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔
"تم تو میری بہن کی ایک نظر کے لائق بھی نہیں ہو۔ اور دیکھو اُس نے تمہارے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دی۔"
"زمیندار' جاگیردار اور سیاستدان ہو گے تم اپنے گاؤں میں ہمارے لیے تم کچھ بھی نہیں ہو سوائے ایک بددماغ' گھمنڈی اور بدتمیز آدمی کے ...... اور ایسے آدمی کی عزت کم از کم ہم تو نہیں کر سکتے۔" ٹینا نے اُسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا تو دلاور خان کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اُس میں سما جائے۔
اُس نے تو ہمیشہ حکم چلانا' رعب جمانا' غصہ کرنا ہی سیکھا تھا اور کیا تھا...... اُس کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا اس کہ کبھی کسی کے سامنے اُسے اتنا شرمندہ اور بے عزت بھی ہونا پڑے گا وہ بھی ایک لڑکی کے لیے' ایک لڑکی کے ہاتھوں...... شرمندگی سی شرمندگی تھی۔
"ٹینا آؤ بس کرو ذوئی کے لیے دعا کرو اس کو بعد میں دیکھ لیں گے۔" بوبی ٹینا کا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔ دلاور خان بنچ پر بیٹھ گیا۔
وہ سب کالج میں تھے اُن دنوں کالج میں فری بلڈ بینک کیمپ لگایا گیا تھا۔ اُن چاروں نے بھی اپنا بلڈ گروپ چیک کروایا تھا اور سوائے ٹینا کے اُن چاروں کا ایک ہی بلڈ گروپ تھا۔ "او پوزیٹو۔"
اور یہ بہت حیران کن بات تھی۔ کالج میں بھی انہیں حیرت اور رشک سے دیکھ رہے تھے کہ اُن دوستوں کا بلڈ گروپ سیم ہے۔
"چلو یہ ایک لحاظ سے بہت اچھا ہے اگر خدانخواستہ ہم میں سے کبھی کسی کو خون کی ضرورت پڑی تو ہم اُسے خون دے سکیں گے۔ کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔" ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
"بھئی مجھے تو معاف ہی رکھنا کیونکہ میرا دل بیٹھنے لگتا ہے خون دیکھ کر اور اگر میں اپنا ہی خون ایک بوتل میں جاتے دیکھوں گا تو میرا تو وہیں خون خشک ہو جائے گا۔" مونٹی نے فوراً کہا تھا۔
"ہاں اور امی کہتی ہیں کہ میرا خون تو ہے ہی ہلکا نظر بھی جلدی لگتی ہے اور اگر ایک قطرہ بھی خون کا نکل جائے تو ایک بوتل کے برابر سمجھو اس لیے پہلے سے ہی بتا رہا ہوں کہ ایک بوتل کے بدلے دو بوتل

خون کا انتظام میرے لیے بھی کر رکھنا ورنہ لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔" پھپی نے بھی فوراً ہی بات بنائی تھی پُر مزاح انداز میں وہ سب ہنس پڑے تھے۔

"چلو وقت پڑنے پر دیکھیں گے کون کتنے پانی میں ہے؟" ذویا نے کہا تھا۔

"یا اللہ ایسا کبھی نہ ہو......" بوبی نے دل سے دعا کی۔

"یا اللہ! کبھی ایسا وقت ہی نہ پڑے۔" آج وقت پڑا تھا اُن کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ بس یاد تھا تو یہ انہیں اپنی ذویا کی جان بچانی ہے چاہے اُس کے لیے انہیں اپنے خون کا آخری قطرہ تک کیوں نہ دینا پڑے۔

"ذویا کو کِڈنی میں دوں گا۔" بوبی نے پھپی اور مونٹی کے آنے پر انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو فائزہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں میں دوں گی اپنی بیٹی کو اپنا گردہ...... میں تمہاری زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔"

"مما' مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ نے انسان کو دو آنکھیں، دو کان اور دو گردے اسی لیے دیے ہیں کہ اگر خدانخواستہ ایک کام نہ کرے تو دوسرے سے کام چلتا رہے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر میں اپنی ایک کڈنی اپنی بہن کو دے دوں۔" بوبی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہارا جذبہ اور محبت قابلِ قدر ہے بیٹا مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اپنی بہن سے اتنی محبت ہے اُس کی اتنی فکر ہے انشاء اللہ ہماری ذویا کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہم سب ٹیسٹ کروائیں گے جس کے ٹشوز ذویا کے ٹشوز سے میچ کر گئے وہ اپنا گردہ ذویا کو دے گا۔"

احتشام الحق نے بوبی کے شانوں کے گرد بازو حمائل کر کے سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے انکل' ہم ذوئی کو کڈنی دیں گے اور اگر اُسے مزید بلڈ کی ضرورت پڑی تو ہم دوبارہ اُسے بلڈ دیں گے۔ آپ پریشان مت ہوں اُسے کچھ نہیں ہوگا۔"

مونٹی نے رسان سے کہا تو پھپی نے بھی سر ہلا دیا۔

"ہاں بالکل! ذوئی ہماری بچپن کی ساتھی ہے وہ ایسے کیسے ہمیں روتا چھوڑ کے جا سکتی ہے۔"

"یہ سب میری غلطی ہے میں اُسے وہاں چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ یا اللہ! میری بہن کو صحت زندگی عطا کر دے آئندہ میں کبھی بھی اپنی ...... بہن کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔"

بوبی یہ کہتے ہوئے بری طرح رو پڑا۔ مونٹی نے اُسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ سبھی رو رہے تھے۔ دلاور خان شرمندگی سے ذویا کے دوستوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن پر اُس نے ہمیشہ قہر آلود نگاہ ہی ڈالی تھی۔ آج وہ اپنی بچپن کی ساتھی اور دوست کے لیے محبت اور ایثار کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اُس کے لیے اپنے لہو کا آخری قطرہ تک دینے کے لیے تیار اپنا گردہ دینے کے لیے تیار تھے سب۔

پھر کچھ دیر بعد وہاں ذویا اور بوبی مونٹی ٹینا پھپی کے کلاس فیلوز اور یونیورسٹی فیلوز اور چند اساتذہ کرام بھی پہنچ گئے۔ سب ذویا کے لیے خون دینے آئے تھے۔ گردے کی ضرورت کا ذکر چھڑا تو تین اسٹوڈنٹس بھی گردہ دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

"جس بچی کے اتنے چاہنے والے ہوں دعائیں کرنے والے ہوں اُسے زندہ رہنا ہی ہوگا وہ بھی مکمل تندرستی کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ!" پروفیسر حنیف نثار نے یقین سے کہا۔

"انشاء اللہ!" سب نے ایک ساتھ کہا۔

دلاور خان کو اپنا آپ وہاں 'مس فٹ' محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے باہر نکل گیا اور

اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے شہر والے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

"تمہارے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں آزمائش شرط ہے۔"

"فکر نہ کرو تمہارا یہ احسان اگر مجھے اپنی جان دے کر اُتارنا پڑا اور اپنے جذبے کی سچائی کا یقین دلانے کے لیے جان سے گزر جانا پڑا تو میں دریغ نہیں کروں گی۔"

اپنی سانسیں تمہارے دل میں
بھر دیں گے تو جانو گے؟
کہ جان سے کتنے عزیز تر ہو

ذویا کی کہی ہوئی باتیں دلاور خان کی سماعتوں میں گونج رہی تھیں۔

اُس کے جذبے سچے تھے یہ اُس نے اُس کی بدسلوکی و بے اعتنائی کے باوجود اُس پر ظاہر ہی نہیں ثابت بھی کر دیا تھا۔ اگر وہ اُس سے محبت سے انکاری ہو گئی تھی اُس کے رویے کے سبب تب بھی اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ انسانیت سے پیار کرنے والی حساس دل کی مالک اور دوسروں کی زندگی بچانے کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دینے والی ایک بے خوف نڈر اور بہادر لڑکی ہے۔ اور یہ کہ اُس کے دوست بھی اُس کی طرح کتنے سچے، مخلص اور جانثار ہیں۔ اب دلاور خان کے پاس سوائے ندامت کے کچھ نہیں بچا تھا۔ ندامت کے ایسے کون سے آنسو تھے اُس کے پاس جو اُس کے اس ظلم کے داغ کو دھو دیتے؟

"میں نے تو اُس پر کوئی احسان بھی نہیں کیا تھا جو وہ اپنی جان کی بازی لگا بیٹھی...... احسان تو مجھ پر کیا ہے ذویا نے میری جان بچا کر۔"

دلاور خان نے خود کلامی کی۔ اُس کی نگاہوں میں ذویا سے ملاقات اور بات کے سارے لمحے سارے واقعے یاد آ رہے تھے۔ کہیں وہ گیت گا رہی ہے، کہیں اپنی پسند کے گانے پر محوِ رقص تھی کہیں اسٹیج پر ڈیبیٹ کرتی اور یونیورسٹی میں اپنے بھائی اور دوستوں کے ساتھ ہنستی بولتی واک کرتی نظر آ رہی تھی اور پھر اُسے اپنے ہر رویے اور عمل کی فلم بھی اپنی آنکھوں کے سامنے چلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اور آخری منظر جو اُسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ ذویا کا خون میں لت پت وجود جو اُس کی بانہوں میں تھا اُس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکان اُس کا دل چیر لینے کو کافی تھی۔

"یہ کیا کر دیا میں نے؟ یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟"

دلاور خان اپنے کمرے میں بند اپنی بے بسی پر چیختا ہوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"دلاور خان تم انتہائی بے رحم اور سنگدل شخص ہو تم نے ہر طرح سے ذویا کو زخمی کیا ہے، اُسے دکھ پہنچایا ہے اُس کی ہتک کی ہے، تذلیل کی ہے اس معصوم لڑکی کی۔ ہرٹ کیا ہے اُسے اور تم تو اُس سے ایک اَن دیکھی دشمنی پال رکھتی تھی۔

وہ اگر تمہیں پسند کرتی تھی یا تم سے محبت کرنے لگی تھی تو یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا کہ تم نے اسے قدم قدم پر ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ تم نے اُسے بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا...... کیوں؟ کیا مانگ لیا تھا اُس نے تم سے؟ تم نے کبھی اُس سے تمیز سے عزت سے بات تک نہیں کی، کس لیے آخر؟"

یونیورسٹی کے لڑکے اُس سے بات کرنے کو ترستے ہیں، اگر وہ کسی لڑکے سے ایک منٹ بات کر لیتی تو وہ لڑکے خوشی سے چھلانگیں مارتے پھرتے تھے۔ اُسے سر آنکھوں پر بٹھانے اور ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھنے والوں کی کمی تو نہیں تھی اور نہ ہے، تمہاری خوش نصیبی تھی یہ کہ ذویا احتشام نے تمہیں

منظورِ نظر جانا اور تمہیں اہمیت دی۔ لیکن تم نے اُس پر، اُس کے جذبے کی سچائی پر اُس کی پارسائی پر شک کیا۔ اُسے بے کردار سمجھا۔

اُسے بار ہا جتایا کہ وہ ایک بری لڑکی ہے، آوارہ مزاج، اور حیا سے عاری لڑکی ہے۔ کون سی لڑکی ہوگی جو اتنی تذلیل سہنے کے بعد بھی تم جیسے بے حس آدمی پر اپنی جان لٹائے گی؟

''سوائے ذویا احتشام کے تمہارے لیے ایسا کوئی دوسری لڑکی نہیں کر سکتی۔''

تم نے تو آخری وقت تک ذویا کی تضحیک کی، تذلیل کی لیکن آفرین ہے اُس لڑکی پر جس نے پھر بھی تمہاری موت کا راستہ اپنی جان پر کھیل کر روک لیا...... کیا کرو گے تم اگر ذویا نہ رہی؟

''کیسے معافی مانگو گے ذویا سے اگر وہ مر گئی تو؟'' دلاور خان کا ضمیر اُسے جھنجوڑ رہا تھا، لعنت ملامت کر رہا تھا۔ دل و دماغ اُسے آئینہ دکھا رہے تھے۔ اُس کے تفکر و خیال پر جمی گرد دھو رہے تھے۔

وہ جو خود پر ایک خول چڑھائے برسوں سے اپنی ذات کے پنجرے میں قید زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا اب اُس پنجرے سے باہر نکل آیا تھا۔

وہ خول ٹوٹ گیا تھا جو نہ دوسروں کو توڑنے پر کمر بستہ تھا بلکہ جس نے خود دلاور خان کو بھی توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ جو اپنے ہی وجود سے غافل تھا اب جو ذویا کے وجود کو لہولہان دیکھا تھا تو اپنے وجود میں زندگی کی حرارت کا درد کا احساس جاگا تھا۔

وہ جو اپنے ہی چہرے سے نگاہ چراتا تھا س، اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا پاتا آج ایک مدت کے بعد وہ اپنے چہرے کو حقیقت کے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ آج اُس پر انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ سب سے بدگمان ہو کر کتنا بھیانک چہرہ تخلیق کر چکا تھا اپنے لیے۔ اُسے ظلم زیادتی، ناانصافی مکر و فریب سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ منافقت سے نفرت تھی۔ لیکن زندگی نے اور زندگی سے وابستہ لوگوں اور رشتوں نے اُسے یہی کچھ دیا تھا۔

وہ کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی میں پس کر بے حسن بن گیا تھا۔ جتنا جو چیز اُسے اٹریکٹ کرتی وہ اتنا ہی اُس سے متنفر ہوتا چلا گیا۔ اُسے اب کسی سے کوئی غرض نہیں رہی تھی کہ اُس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ بس حکم کا غلام اور بے پروا شخص بن کر رہ گیا تھا۔

جو رہا ہے صحیح یا غلط اُس کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جب اپنی خوشی اور مرضی کا خون ہو جائے تو انسان دوسروں کی خوشی اور مرضی پر چلنے لگتا ہے یہی دلاور خان نے بھی کیا تھا۔ لیکن اُس کے اندر ایک غصہ، رنج اور ملال ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ مسکرانا بھول گیا تھا، اُس کے قہقہے کہیں گم ہو گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک میں، شرارت کی جگہ وحشت نے بسیرا کر لیا تھا۔ وہ ہر رشتے کو مطلبی اور ہر لڑکی کو جھوٹی سمجھنے لگا تھا۔ محبت سے اُسے نفرت ہو گئی تھی۔

اِس نفرت کا سبب ریشماں تھی۔ جس سے اُس نے محبت کی تھی مگر شادی جنت بی بی کے ساتھ ہو گئی۔ اور وہ ریشماں کے غم میں پگھلتا رہتا اگر اُسے دوسرے لڑکوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ڈیٹ مارتے نہ دیکھ لیتا۔ وہ اُس کے ساتھ مخلص نہیں تھی بس اُس کی دولت کی وجہ سے اُس سے دوستی اور محبت کے دعوے، وعدے کیے تھے اُس نے اور دلاور خان نے جوشِ محبت میں اُسے قیمتی تحائف بھی خرید کر دیے تھے۔ ریشماں کی اصلیت سامنے آئی تو دلاور خان نے محبت کا باب اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

ایسے میں ذویا احتشام کا آنا اُس کی ذات کی جھیل میں کنکر پھینک کر اُسے منتشر کرنا وہ برداشت نہیں کر سکا اور وہ ذویا سے بدتمیزی اور بدسلوکی کرتا چلا گیا۔ مونٹی اور پپی ہر وقت اُس کے ساتھ ہوتے تھے اس لیے وہ ذویا کو بھی ریشماں سے کمپیئر کرنے لگتا۔ لیکن آج ذویا نے ثابت کر دیا تھا اور اُسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ نہ تو ریشماں ہے نہ ہی بدکردار ہے وہ ایک بہادر بچی اور عظیم لڑکی ہے۔

ذویا کو دیے گئے دکھوں کی تلافی اپنے کہے گئے لفظوں کا ازالہ کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی دلاور خان کو...... زندگی میں جتنا بے بس اور دکھی وہ آج تھا۔ شاید جنت بی بی سے نکاح کرتے وقت بھی وہ اتنا دلگیر اور بے بس نہیں تھا۔

ذویا سے نفرت' بے حسی، بدگمانی اور بے اعتنائی تو اُسی لمحے اُڑنچھو ہو گئی تھی جس لمحے وہ اُس کی زندگی بچانے کی خاطر گولیوں سے لہولہو ہو کر اُس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی تھی۔ دلاور خان کی نفرت بھی اُسی خاک میں رُل گئی تھی جس خاک پر ذویا کا لہو ٹپکا تھا۔ اور جذب ہو گیا تھا۔

گاؤں کی مسجد اور حویلی بختاور میں بھی ذویا کی صحت و سلامتی کے لیے قرآن خوانی اور خصوصی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

''نہیں، ذویا کو کچھ نہیں ہوگا۔ اُسے زندہ رہنے ہوگا میرے لیے ورنہ اب میں کیسے زندہ رہوں گا؟'' دلاور خان ایک بھیانک خواب سے جاگا تھا۔ جس میں اُس نے ذویا کو سفید لباس میں مردہ دیکھا تھا اور اُس خواب نے اُس کی نیند توڑ دی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اُس نے شکر ادا کیا کہ یہ محض خواب تھا۔ وہ تیزی سے بستر چھوڑ کر واش روم میں گھس گیا۔ نہا کر تیار ہوا جوس پیا اور اسپتال روانہ ہو گیا۔

''ڈاکٹر صاحب! میری بچی بچ تو جائے گی نا؟'' فائزہ نے بھیگتی آواز میں ڈاکٹر کامران سے پوچھا۔

''اللہ پر بھروسا رکھیں اور دعا کریں اللہ کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ ہم نے آپریشن تو کر دیا ہے لیکن ذویا کی حالت ابھی خطرے میں ہے۔ اور یہ خطرہ اللہ رب العزت یقیناً ٹال سکتا ہے۔'' ڈاکٹر کامران نے اُن سب کو دیکھتے ہوئے پُریقین لہجے میں کہا۔

''انشاء اللہ! ہماری ذویا بہت جلد ہنستی کھیلتی ہمارے بیچ ہو گی اُس نے تو ابھی اپنے پاپا کا بزنس بھی چلانا ہے، دلہن بننا ہے، اُس کے...... ہاتھوں پر مہندی لگے گی۔ اُبٹن لگے گا۔ ایسے کیسے وہ مٹی اوڑھ کے سُو سکتی ہے؟ کچھ نہیں ہوگا اُسے وہ تو میری بہادر بیٹی ہے بہادر شیر بیٹی؟'' احتشام الحق نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے دلگیر لہجے میں کہا تو فائزہ اور ٹینا کی سسکیاں پھر سے بلند ہونے لگیں۔

چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے ذویا کو بے ہوش اور مشینوں کے ذریعے سانس کا رشتہ جوڑے ہوئے۔ اُس کے لیے سب گھر والوں اور دوستوں' کلاس فیلوز نے آنسوؤں کے خزانے لٹا دیے تھے۔ دعاؤں کے دیپ مسلسل جل رہے تھے اُن کے آنسوؤں سے...... دلوں کا درد فرش سے ارش تک پہنچ گیا تھا۔ نجانے کس کے آنسو؟ کس کی دعا؟ اور التجا پر آئی تھی کہ ذویا نے پورے اڑتالیس گھنٹے بعد آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس خبر نے سب کے دلوں کو سکون بخشا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہوں۔'' فائزہ نے ڈاکٹر کامران کو دیکھتے ہوئے بے کلی و بے قراری سے کہا۔ حال تو دلاور خان کا بھی

کچھ ایسا ہی تھا مگر وہ کسی سے بھی حالِ دل کہہ نہیں سکتا تھا کہہ بھی دیتا تو کوئی اُس کی بات پر یقین نہ کرتا یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ یقین تو اُسے بھی نہیں تھا کہ وہ ذویا کے ساتھ اتنا نار واسلوک کرتا رہا ہے۔

''دیکھیے اس وقت کسی کو مس ذویا سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آپ کو ابھی مزید انتظار کرنا ہوگا۔''

''پلیز ڈاکٹر! میں صرف دیکھوں گی اپنی بچی کو دو دن سے اُس کی آواز نہیں سنی میں نے...... پلیز مجھے دیکھنے دیں دور سے دیکھنے دیں۔'' فائزہ نے ڈاکٹر کامران کی بات سُن کر مچل کر کہا۔

''پلیز ڈاکٹر صاحب! ہمیں ایک نظر ذویا کو دیکھنے دیں۔'' بوبی نے بھی بے قرار لہجے میں التجا کی۔

''ٹھیک ہے آپ لوگ ذویا سے مل سکتے ہیں لیکن اُس سے بات نہیں کریں گے نہ ہی اُسے بولنے پر اکسائیں گے کیونکہ ذویا کو صرف آرام چاہیے کسی قسم کا ذہنی یا قلبی دباؤ اُن کی حالت خراب کر سکتا ہے۔'' ڈاکٹر کامران نے رضا مندی ظاہر کرتے ہوئے ساتھ ہی ہدایت بھی دی۔

''نہیں ہم اُس سے کچھ نہیں پوچھیں گے بس اُسے دیکھ کے آجائیں گے۔'' بوبی نے تیزی سے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ دو دو کر کے اُسے دیکھنے آئیں۔'' ڈاکٹر کامران نے کہا سب سے پہلے فائزہ اور احتشام الحق ڈاکٹر کامران کے پیچھے گئے۔

آئی سی یو میں ذویا ایک بیڈ پر بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ مشینوں میں جکڑی ہوئی آکسیجن ماسک اُس کے اندر سانسوں کی مالا بن رہا تھا۔ اُس کے آدھے جسم کو طرح طرح کی مشینیں جکڑے ہوئے تھیں۔

احتشام الحق اور فائزہ نے اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کو اس حال میں دیکھا تو اُن کے دل کٹ کر رہ گئے۔ وہ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول لگ رہی تھی۔ جو شاخ سے جدا ہو کر مرجھا جاتا ہے۔ بے رنگ، بے بُو، بے آس تازگی اور زندگی کی رمق سے خالی...... ذویا کے مسکراتے ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی۔ جسم کی گلابیاں، سرسوں کے پھول میں بدل چکی تھیں۔

''ذویا...... میری بچی۔'' فائزہ نے تڑپ کر کہا تو اُس نے آواز کے جواب میں اپنی آنکھیں بہت کوشش کر کے کھولیں تھیں۔ آنکھوں کی پتلیوں پر دھندلا سا عکس نمودار ہوا تھا۔ ذویا نے پھر سے آنکھیں بند کیں اور پھر سے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو عکس کچھ واضح ہوا تھا۔ وہ مما، پاپا کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔ پاپا نے اُس کی مسکراہٹ کے جواب میں اُسے فلائنگ کس دیا تھا اور ہاتھ سے وکٹری کا نشان بنا کر اُسے شاباش بھی دی تھی۔

''چلیے باقی لوگ بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔'' ڈاکٹر کامران نے آہستگی سے کہا تو وہ دونوں اُسے ہاتھ کے اشارے سے الوداع کہہ کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اُن کے بعد ٹینا اور مونٹی، ذویا کو دیکھ کر پھر پپی اور ساجد نظامی گئے۔ آخر میں بوبی گیا تو ذویا کی حالت دیکھ کر تڑپ کر رہ گیا۔

ذوئی تمہیں پتا ہے مونٹی اور پپی نے تمہیں بلڈ دیا ہے اس لیے اب جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ میری بہنا، ورنہ تمہیں پتا ہے نا وہ دونوں اپنا بلڈ رائیگاں جانے کا صدمہ جھیل نہیں سکیں گے۔''

بوبی نے پُرمزاح لہجے میں کہا تو وہ مسکرانے لگی اور دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ بوبی اُس کی نگاہوں میں لکھا سوال پڑھ چکا تھا۔ وہ دلاور خان

کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں دلاور خان کو تلاش کر رہی تھیں۔

''دلاور خان ...... بالکل ٹھیک ہے باہر بیٹھا ہے۔ اُسے کچھ نہیں ہوا۔ ہاں احساسِ ندامت ضرور ہو رہا ہے اب...... کیا بلاؤں اُسے؟'' بوبی نے پوچھا تو ذویا نے اپنی آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں گویا اثبات میں ہاں میں جواب دیا۔

''او کے میں بُلاتا ہوں اُسے۔'' بوبی باہر آیا تو دلاور خان کو اُسی سمت نگاہ جمائے دیکھا یقیناً وہ بھی ذویا کو دیکھنا چاہتا تھا۔

''وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ چلیے تاکہ اُسے اطمینان ہو جائے کہ تم زندہ ہو۔''

بوبی نے اُس کے غمزدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے کل ہوتے دل کو سنبھالتا خاموشی سے آئی سی یو میں داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر اُس کا دل دہلانے اور روح لرزانے کے لیے کافی تھا۔ وہ اس کے پیروں کی جانب آ کھڑا ہوا۔ ذویا کی پلکوں پر جیسے منوں بوجھ پڑ گیا تھا۔ بہت تگ و دو کرنا پڑی تھی اُسے دلاور خان کے چہرے تک نگاہ اٹھانے میں، وہ اُس کے چہرے پر رقم شرمندگی اور بے چینی دیکھ سکتی تھی۔

''ذو...... یا......'' دلاور خان کے لب ہلے اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ جو پیاس اس وقت ذویا کے حلق میں کانٹے اُگا رہی تھی وہی پیاس دلاور خان کا حلق خوف کی صورت سُوکھا رہی تھی۔

''میں نے تو...... کبھی بھی تم پر کوئی...... احسان نہیں کیا پھر تم نے اپنی جان دے کر بدلہ چُکانے کی کوشش کیوں کی؟ تمہیں زندہ رہنا ہے اس لیے نہیں کہ میں اپنے گلٹ سے نجات چاہتا ہوں بلکہ اس لیے کہ...... اب میں بھی جینا چاہتا ہوں۔ خوش رہنا چاہتا ہوں ہنسنا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ احسان تو تم نے مجھ پر کیا ہے میری زندگی بچا کر، اور اس زندگی پر اب تمہارا حق ہے...... میں مقروض ہوں تمہارے ہر اُس جذبے اور احساس کا جس میں تم نے مجھے اہمیت دی۔

میں بہت شرمندہ ہوں اپنے ہر لفظ ہر عمل اور ہر اُس خیال پر جس سے تمہیں تکلیف پہنچی۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ تم میری جان بچاتیں۔ مجھ جیسے بے حس اور بدتمیز آدمی کو مر جانے دیا ہوتا۔ کیوں اپنی زندگی خطرے میں ڈالی تم نے؟'' وہ بول رہا تھا اور ذویا کے زخموں میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ درد کی لہریں اُس کے پورے وجود کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ اُس نے بے چین ہو کر گردن دائیں بائیں ہلائی تو بوبی اور دلاور خان نے خوفزدہ ہو کر اُسے دیکھا۔

''ذویا...... کیا ہوا؟'' دلاور خان نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''میں نے آپ لوگوں کو تاکید کی تھی کہ ان سے کوئی بات نہ کی جائے مگر آپ کو پیشنٹ کی کنڈیشن کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ پلیز باہر جائیں آپ لوگ۔'' ڈاکٹر کامران اُسی وقت آئی سی یو میں نرس کے ہمراہ داخل ہوئے تھے۔ دلاور خان کو باتیں کرتے سُنا اور ذویا کو مچلتے دیکھا تو ناراض لہجے میں بولے۔ دلاور خان شرمندہ ہو گیا۔ وہ اُس سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر اُسے ڈاکٹر کے غصے اور ذویا کی بگڑتی حالت کے پیشِ نظر باہر جانا پڑا۔ بوبی بھی اُس کے ساتھ ہی چلا آیا۔

فائزہ بری طرح رو رہی تھی۔ اور وہ سب انہیں حوصلہ دے رہے تھے۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی کے پاس جانے کی؟'' فائزہ نے دلاور خان کو آئی سی یو سے آتے دیکھ لیا تھا جونہی وہ اُن سب کے قریب پہنچا وہ غصے سے پھٹ پڑیں۔

"آنٹی میں......" وہ بوکھلا گیا لفظ اُس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

"تمہاری وجہ سے میری بیٹی اِس حال کو پہنچی ہے۔ تم تو ہمیشہ اُس سے نفرت کرتے اور...... جھگڑتے تھے نا۔"

"فائزہ سنبھالو خود کو۔" مسز ساجد نظامی نے انہیں شانوں سے پکڑ کر بٹھایا۔

"میں نے منع بھی کیا تھا ان کو کہ مت بھیجیں ذویا کو گاؤں اور اس...... دلاور خان کی...... حویلی تو ہرگز نہ بھیجیں...... خار کھاتا ہے یہ میری بیٹی سے...... لیکن...... احتشام نے میری ایک نہیں سنی۔" فائزہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ دلاور خان اور احتشام الحق شرمندگی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے حوصلہ رکھو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہماری ذویا تندرست ہو جائے گی۔" مسز ساجد نظامی نے انہیں تسلی دی۔

"انشاء اللہ! اور آنٹی میں دوں گا ذویا کو کڈنی اور اگر بلڈ کی ضرورت پڑی تو وہ بھی دوں گا آپ فکر نہ کریں پلیز خود کو سنبھالیں۔" دلاور خان نے خلوص دل سے کہا۔

"مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔" فائزہ نے غصے سے کہا۔

"اور نہ ہی ہماری ذویا کو آپ کے خون اور گردے کی ضرورت ہے۔ وہ آپ سے گردہ اور خون لے کر جینے کی بجائے مرجانا پسند کرے گی۔" بوبی نے سپاٹ لہجے میں کہا تو دلاور خان کے دل پر آری سی چل گئی۔

"جی اور ویسے بھی بوبی کے ٹشوز میچ کر گئے ہیں ذویا کے ٹشوز سے بوبی اپنی بہن کو اپنا گردہ دے رہا ہے۔" ٹینا نے بھی اُسے شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے رکھائی سے کہا۔ تو دلاور خان نے بے بسی سے دکھ اور کرب سے بھیگتی آنکھوں سے آئی سی یو کے بند دروازے کو دیکھا تھا۔ جو گواہ تھا اُس کی لاپروائیوں' نفرتوں اور زہریلے لفظوں کا اُس کی بے توجہی کا...... وہ سب جو اُس پر برہم تھے تو ٹھیک ہی تو تھے۔

اُس نے اُن کی چہیتی لاڈلی اور آنکھ کا تارا ذویا کو اپنے رویے سے لفظوں سے گھائل کیا تھا جبکہ وہ اُسے زندگی کا نیا رُخ دکھاتی ہوئی موت کے دہانے پر جا پہنچی تھی۔

"گولیوں کے زخم تو بھر ہی جائیں گی لیکن جو زخم تم نے اُسے اپنے رویے اور لفظوں سے دیے ہیں وہ شاید کبھی نہ بھر سکیں۔ جو گھاؤ تم نے اُس کے دل پر لگائے ہیں وہ کیسے بھریں گے؟" فائزہ نے اُسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو گھاؤ میں نے دیے ہیں اُن پر مرہم بھی میں رکھوں گا۔ ذویا کو جو زخم میری وجہ سے ملے ہیں اُن کی مسیحائی بھی میں خود کروں گا۔" دلاور خان نے دھیمے لہجے میں کہا اور وہاں سے باہر نکلتا چلا گیا۔

شہر کیا گاؤں کیا ہر کوئی دلاور خان سے خفا تھا۔ اُس پر غصہ تھا اور ذویا کے لیے ہر زبان سے تعریفی کلمات ادا ہو رہے تھے۔ اُس کے مما پاپا نے بختاور خان سے حویلی میں اپنی بیٹی کی مہمان نوازی درحقیقت بے عزتی اور دلاور خان کے منفی سلوک پر شکایت کی تھی۔ جس پر وہ شرمندگی سے دوچار ہو گئے۔ انہیں دلاور خان سے ایسی حرکت کی توقع نہ تھی۔ وہ بھی اُس پر غصہ ہوئے چیخے چلائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دلاور خان کو زندگی میں اتنی شرمندگی اور خفت اٹھانا پڑ رہی تھی۔ مگر وہ اِن سب سے بے نیاز صرف ذویا کی صحت وسلامتی کے لیے متفکر اور دعا گو تھا۔ وہ جو کبھی نماز نہیں پڑھتا تھا ان دنوں پانچ

وقت کا نمازی ہو گیا تھا۔ صرف ذویا کی صحت سلامتی رب سے مانگنے کے لیے...... اور اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے کے لیے۔

بوبی کا گردہ ذویا کو لگایا جا چکا تھا۔ وہ اب تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی۔ سب کی دعائیں قبول ہو گئیں تھیں۔ اُسے آج ہی ریکوری روم میں شفٹ کیا گیا تھا۔ مما' پاپا نے دو کالے بکروں کا صدقہ دیا تھا۔ اور کچھ رقم ذویا اور بوبی کے سر سے وار کے غریبوں میں تقسیم کر دی تھی۔

'حویلی بختاور' سے بختاور خان کے ساتھ عیشاں بی بی (بے جی) اور جنت بی بی بھی ذویا کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ پھولوں اور پھلوں کے ٹوکرے لے کر ذویا کی بہادری کی وجہ سے اُن کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ الیکشن میں اب بختاور خان اور دلاور خان دونوں ہی حصہ لے رہے تھے اور اس بار دونوں کے جیتنے کا امکانات تھے کیونکہ رستم خان اسپتال سے جیل جا چکا تھا اور اُس کے باپ ہاشم خان کو نیب نے کرپشن کے الزامات میں گرفتار کر لیا تھا۔ اُس کی پارٹی نے اب اُسے پارٹی کی رکنیت سے ہی برطرف کر دیا تھا اور الیکشن کمیشن نے اُس کی تعلیمی اسناد بھی جعلی قرار دے کر اُسے الیکشن کے لیے نا اہل بھی قرار دیا جا چکا تھا۔ اس ساری صورت حال کا فائدہ بختاور خان اور دلاور خان کو پہنچ رہا تھا۔

ذویا کی اُن کی گاؤں کے بارے میں اخبار اور ٹی وی تک پہنچائی گئی رپورٹس نے بھی اُن کے گاؤں کی طرف حکام بالا کی توجہ مبذول کروادی تھی۔ دلاور خان نے اسکول کو اُس کی اصل حالت میں لا کر کام شروع کروا دیا تھا۔ بختاور خان کو اپنے گاؤں میں گیس کی فراہمی کا اجازت نامہ مل گیا تھا۔ اور اس سب کے پیچھے ذویا کی رپورٹس ثابت ہوئی تھیں۔

گاؤں سے منشی جی ماسٹر جی اور اُن کی بیوی حلیمہ گڈو اور مولوی صاحب بھی دیسی مرغیوں اور دیسی گھی کی سوغات لے کر ذویا کی مزاج پرسی کو آئے تھے۔ ذویا کو اُن سب کی آمد نے دلی مسرت سے ہمکنار کیا تھا۔ وہ سب گاؤں والوں کی طرف سے اُس کے لیے دعائیں اور محبتیں لے کر آئے تھے۔ یہ سب مما' پاپا اور سب کے لیے بہت خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔

ذویا صرف چار دن کے لیے گاؤں گئی تھی اور سب کے دل جیت لیے تھے اُس نے۔

دلاور خان بھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ صبح شام اسپتال آتا' ذویا کو دور سے دیکھتا ڈاکٹر سے اُس کی کنڈیشن کے بارے میں دریافت کرتا اور خاموشی سے واپس چلا جاتا۔ اس بات کی خبر ذویا سمیت سب کو تھی۔ آج وہ بہت ہمت کر کے بڑا سا تازہ پھولوں کا گلدستہ لے کر ذویا سے ملنے کے ارادے سے آیا تھا۔

وہ اپنے دوستوں کے بیچ گھری ہوئی تھی۔ بوبی اُس کے دائیں جانب بیٹھا تھا اور ٹینا بائیں جانب' موتی اور پپی اُس کے پیروں کی طرف بیڈ پر بیٹھے تھے۔ وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اور وہ سب اُسے پھل کھلانے کی کوشش کر رہے تھے اُس کا دل بہلا رہے تھے۔

''یار ذوئی کھالو نا خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ کمزوری محسوس ہو رہی ہے کھاؤ گی نہیں تو کمزوری کیسے دور ہو گی؟'' ٹینا نے سیب کی قاش اُس کے منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''بس دل نہیں چاہ رہا۔'' ذویا نے مدھم آواز میں کہا۔

''دیکھو ذوئی......'' پپی نے بڑے سنجیدہ لہجے میں اُسے مخاطب کیا تو وہ سب اُسے دیکھنے لگے کہ وہ

ایسا کیا کہنے والا ہے۔

''زندگی کئی طرح سے تمہیں کمزور بنا دیتی ہے لیکن یاد رکھو تین طریقے اسے ہیں جو تمہیں ہمیشہ اسٹرونگ بناتے ہیں اور وہ ہیں بریک فاسٹ، لنچ ڈنر...... تھنک ہٹ کے ایٹ ڈٹ کے۔''

پپی نے اپنی بات مکمل کی تو ذویا کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ وہ سب بھی ہنس پڑے۔

''یا اللہ! ارے بچو! یہ تم کیا ذویا کو گھیرے بیٹھے ہو اُٹھو شاباش پہلے کیا کم گرمی ہے جو تم سب ایک ہی بیڈ پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ چلو صوفے پر بیٹھو سب۔'' فائزہ کمرے میں داخل ہوئیں تو انہیں دیکھتے ہی گھبراہٹ کا شکار ہو کر بولیں۔

''نہیں آنٹی! ہم اب چلتے ہیں کل آئیں گے۔'' وہ سب ہنستے ہوئے ایک ایک کر کے اُٹھ گئے۔ مونٹی نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... دھیان سے جانا......''

''اوئے وہ دلاور خان باہر کھڑا ہے اور آج تو اُس کے ہاتھوں میں یہ بڑا سارا گلدستہ بھی ہے۔'' مونٹی نے باہر جھانکا ہی تھا کہ دلاور خان پر نگاہ پڑتے ہی اُس نے اندر منہ کر کے ذویا کی طرف دیکھتے ہوئے اطلاع دی۔

''لگتا ہے آج وہ اور بلبل بے تاب گفتگو کر کے ہی رہیں گے۔''

پپی نے مسکراتے شوخ لہجے میں کہا تو ذویا بے پرواہی سے مسکرا دی۔ دل میں ایکدم سے دھڑکنوں نے شور مچایا تھا۔ لیکن وہ تو دل کی آواز پر کان نہ دھرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''ہاں دلاور ملا تھا ابھی مجھے کہہ رہا تھا ذویا سے ملنا ہے، ذوئی بیٹی مل لینا بے چارہ روز باہر سے ہی چلا جاتا ہے۔ بہت شرمندہ ہے اپنے کیے پر۔''

فائزہ نے ذویا کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔

''او ذوئی تجھے پتا ہے دلاور خان بھی سیاست میں آ گیا ہے۔ اس بار الیکشن لڑ رہا ہے۔'' ٹینا نے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''چلو چھٹی ہوئی اُس کے بگڑنے میں جو کمی کسر رہ گئی تھی وہ اب پوری ہو جائے گی...... آئی ہوپ وہ جیت جائے گا کیونکہ لڑنے کا تو کافی تجربہ ہے اُسے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' ٹینا ہنسی۔

''بُری بات ہے بیٹا ایسے نہیں کہتے صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ خبردار جو کسی نے اُس سے بدتمیزی کی ہو۔'' فائزہ نے انہیں نرمی سے ڈپٹتے ہوئے تنبیہہ کی تھی۔

''او کے آنٹی۔'' سب نے ایک ساتھ کہا اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلے گئے۔

''السلام علیکم!'' بوبی کے بلانے پر دلاور خان نے ذویا کے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے اُسے دیکھا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' ذویا نے آہستگی سے جواب دیا۔

''تم بیٹھو میں کاؤنٹر سے ہو کر آتی ہوں۔'' فائزہ نے دلاور خان کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا آگے چلا آیا۔ فائزہ باہر نکل گئیں۔

''کیسی ہو؟'' دلاور خان نے اُس کے رخِ مہتاب کو دیکھا۔

''الحمدللہ، زندہ ہوں رُوبصحت ہوں۔''

''شکر ہے اللہ کا' یہ پھول میں تمہارے لیے لایا ہوں۔''

اُس نے کلمہ شکر ادا کرتے ہوئے بکے اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''رکھ دیجیے۔ افسوس آپ کو یہ پھول میری قبر پر چڑھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ مجبوراً آپ کو عیادت کے لیے ہی لانا پڑے یہ پھول...... مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے؟'' ذویا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بخدا میں نے تمہاری زندگی کی دعائیں مانگی ہیں تم نے تو احسان کیا ہے مجھ پر میری تمام تر بداخلاقی اور بدسلوکی کے باوجود تم نے اپنی زندگی داؤ پر لگادی میری خاطر۔''

دلاور خان نے گلدستہ اُس کے سرہانے رکھ کر اُسے دیکھتے ہوئے کہا اور وہیں کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

''آپ کی خاطر نہیں انسانیت کی خاطر آپ کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تب بھی میں اُسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی...... لہٰذا احسان مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور آپ کو تو بہت چڑ ہے نا گھسے پٹے فلمی ڈائیلاگ سے...... مگر دیکھ لیں ہوا کیا ایک بددماغ شخص جو خود کو بڑا ہیرو سمجھتا ہے اُس کی جان ایک لڑکی نے بچائی اُس کے حصے کی گولیاں کھا کر......سواسٹرینج نا۔''

''تمہیں ڈاکٹر نے زیادہ بولنے سے منع کیا ہے۔'' دلاور خان شرمندگی کے احساس میں گھر کر یہی بول سکا۔

''آپ کو سُننے سے تو منع نہیں کیا نا؟''

''ذویا...... میں بہت نادم ہوں اپنے کیے اور کہے پر...... پلیز مجھے معاف کردو۔'' دلاور خان کا چہرہ لہجہ اور الفاظ اُس کی شرمندگی اور بے بسی کی عکاسی کررہے تھے مگر ذویا کو اُلجھن ہورہی تھی۔

''کردیا معاف...... اور کچھ......؟'' ذویا نے سپاٹ لہجے میں کہا دلاور خان نے کرب سے اُسے دیکھا۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اُس سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔

''نہیں...... میں تم سے......''

''آپ کو مزید کچھ کہنے یا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ذویا نے اُس کی بات کاٹ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

''مجھ سمیت سبھی کو یقین آگیا ہے کہ آپ اپنے رویے پر نادم ہیں لہٰذا اب آپ کو مزید جدوجہد کرنے کی صبح شام اسپتال کے چکر لگانے یا میرے لیے پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

''انسانیت کے ناطے میں نے آپ کی جان بچائی ہے اور بس...... جو کچھ آپ نے اس حادثے سے چند سیکنڈ پہلے کہا تھا وہ میں بھولی نہیں تھی اور نہ اب بھولی ہوں۔ ''خس کم جہاں پاک۔'' یہی کہا تھا نا آپ نے؟ اور یہ بھی کہ جی سکو تو جی لینا مرجاؤ تو بہتر ہے۔ آپ کی دلی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ مجھے افسوس ہے۔'' ذویا نے نہایت سنجیدہ اور سپاٹ تلخ لہجے میں کہا وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ گیا۔

''میری دلی خواہش تم ہو ذویا پلیز مجھے دل سے معاف کردو ورنہ میرے دل کو کبھی بھی سکون نہیں ملے گا۔''

''دلاور انسان معاف تو کردیتا ہے لیکن بھولتا کبھی نہیں ہے۔ اس لیے مجھے مزید پریشان مت کریں۔ معاف کردیا ہے آپ کو، اب آپ سے ملنا یا بات کرنا میں ضروری نہیں سمجھتی۔ ویسے بھی ہمارے بیچ کوئی تعلق کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اب بھی بن سکتا ہے۔ آپ میرے یونیورسٹی فیلو ہیں اس سے زیادہ میں آپ کو نہیں جانتی...... تشریف آوری کا بہت شکریہ میں اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

ذویا نے اُس کی جانب دیکھے بنا اُسی لہجے میں کہا تو وہ بے بسی سے اُسے دیکھتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ وہ اُس سے شکوہ نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اسی سلوک کا مستحق ہے۔

"اور ہاں......" ذویا کی آواز پر اُس کے دروازے کی جانب اٹھتے قدم تھم گئے۔ اُس نے گردن گھما کر اُس کی طرف دیکھا۔

"بیسٹ آف لک فار یوئیر الیکشن...... آئی ہوپ یو وِل وِن دی الیکشن۔"

ذویا نے اپنی بات مکمل کرتے ہی اپنی آنکھیں موند لیں وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا اسپتال کی حدود سے باہر نکل گیا۔

آج تیسری شب تھی۔ جب ذویا کو محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اُس کے پیروں کی جانب کھڑا رو رہا ہے۔ اُسے اپنے پاؤں پر کوئی گرم سیال چیز گرتی ہوئی محسوس ہوئی وہ دواؤں کے زیر اثر ہوتی تھی جبھی نہ ٹھیک سے آنکھیں کھول پاتی نہ ہی دیکھ پاتی کہ کون ہے؟ مگر آج کی شب اُسے ان سسکیوں نے تڑپا دیا تھا۔

اُس نے بے چین ہو کر آنکھوں پر پڑے پردے دھیرے دھیرے سے اٹھائے تو سامنے ایک دھندلا سا عکس دکھائی دیا۔ ذویا نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں۔ دو تین بار یہی عمل دہرایا تو آنکھوں کی بتیاں روشن اور منظر صاف ہو گیا۔

"دلاور خان۔" آنکھوں نے حیرت سے دماغ کو آگاہ کیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں لمحے بھر کو تھم سی گئی تھیں۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ دلاور خان ہے جو پتھر جیسا رویہ اور لفظ برساتا رہا ہے اُس پر...... اس وقت اُس کے سامنے یہ پتھر ریزہ ریزہ لگ رہا تھا۔ اُس پتھر سے چشمے ابل رہے تھے اشکوں کے، جو اُس کے پاؤں کو بھگو رہے تھے۔ یکا یک وہ اُس کے قدموں میں جھکا اُس کے پاؤں پر بوسے دیے اور اپنے آنسو پونچھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"معافی مانگنے کا یہ کون سا انداز تھا؟"

ذویا کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گئی۔ حلق خشک تھا اور آنکھیں اُس منظر کی گواہی اور شدتوں سے سیراب......

دلاور خان کا یہ خاموش اظہارِ ندامت، اظہارِ معذرت و محبت تو پتھر کو بھی موم کر سکتا تھا۔ ذویا احتشام تو خود موم کی گڑیا تھی۔ وہ تو پل بھر میں پگھل گئی تھی۔

وہ جو ذویا کو ہمیشہ خود سے دُور کرتا آیا تھا۔ اُسے ہمیشہ بے عزت کرتا آیا تھا۔ زبان سے زہر اور آنکھوں سے انگارے اُگلتا تھا اُسے دیکھتے ہی...... آج اُس کی آنکھوں سے زم زم اور زبان سے ہونٹوں سے امرت رس کے چشمے پھوٹ رہے تھے ذویا احتشام کے لیے۔

کیا وہ محض اُس کے معافی مانگنے کا انداز تھا؟

کیا احساس ندامت کی شدت میں وہ بہہ گیا تھا؟

یا......

اس سارے عمل میں کہیں ذویا کی محبت بھی کار فرما تھی۔ جو دلاور خان کو اس قدر جھکنے پر مائل کر گئی تھی؟

کیا تھا دلاور خان کے اس عمل میں؟

معذرت......

ندامت......

یا......

محبت......کی شدت؟

ذویا سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن اُس کے رگ و پے میں ایک انوکھی' الوہی' خوشی اور بے خودی سی سرایت کرتی جا رہی تھی اس سوچ اور اس احساس کے ساتھ کہ آخر کار اُس کے جذبے کی سچائی رنگ لے آئی تھی۔ وہ درد جو اُس کے دل میں تھا اب دلاور خان بھی اُس درد 'محبت' سے آشنا ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھی بے حد خوش۔

''اگر آپ کسی کو بہت زیادہ چاہو اور وہ آپ کو چھوڑ جائے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئیں تو اس یقین سے صاف کر لیجیے گا کہ زندگی کے کسی پل آپ کو یاد کر کے وہ آپ سے زیادہ روئے گا۔'' ذویا کو بہت پہلے کہی گئی اپنی اسکول ٹیچر کی یہ بات اچانک یاد آ گئی تھی۔ اور بالکل سچ معلوم ہو رہی تھی۔

آج اُس نے دلاور خان کو اپنے لیے روتے دیکھ لیا تھا۔ وہ شاید اُس کی ناقدری کر کے رو رہا تھا۔ کھونے کے احساس سے ڈر گیا تھا۔

قریب تر ہے جو فکر و خیال میں میرے
وہی ہے دُور بہت دُور آسماں کی طرح

دلاور خان اپنے موبائل میں ذویا کی تصویریں اور فوک سونگ جو اُس نے اُسے سینڈ کیا تھا کی ویڈیو دیکھ رہا تھا اور اشک بہا رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔

خود پہ بیتی ہے تو روتے ہو سکتے ہو
وہ جو ہم نے کیا تھا کیا وہ عشق نہیں تھا؟

ذویا کی تصویر اُس کی آنکھیں اُس سے سوال کر رہی تھیں۔ وہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دُور جتنا بھی رکھا تم کو
دل نے اتنا ہی پاس پایا ہے
میں زباں سے کہوں نہ کہوں لیکن
تیری اُلفت میرا سرمایہ ہے

ذویا اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر جا رہی تھی۔ دوائیں اور علاج ابھی جاری رہنا تھا لیکن وہ خود بھی اسپتال کے ماحول سے اُکتا گئی تھی۔ گھر جانا چاہتی تھی۔ اور ڈاکٹرز کو بھی اُس کی حالت بہت بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ جبھی اُسے اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی۔ سب بہت خوش تھے۔ فائزہ نے اُس کا صدقہ دیا۔ احتشام الحق اسپتال کے واجبات بلز وغیرہ کلیئر کروا کے آ گئے۔ بوبی اور فائزہ اُس کے دائیں بائیں بازو سے پکڑے آہستہ آہستہ چل رہے تھے تاکہ اُس کے زخموں میں تکلیف نہ ہو۔

باہر گاڑی کے قریب پہنچ کر اُس کی نگاہ سامنے اٹھی تو دلاور خان کو اپنی گاڑی لیے وہیں کھڑا دیکھا۔ وہ اپنی گاڑی سے باہر کھڑا اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ ذویا کی دھڑکن تیز ہو گئی اور آنکھ بھیگ گئی۔

''بوبی وہ۔'' ذویا نے بوبی کا ہاتھ زور سے بھینچا۔

''یہ تو روزانہ آتا ہے تمہارے منع کرنے کے باوجود......'' بوبی نے اُس کی آنکھوں کے تعاقب میں بس ایک لمحے کو ہی دیکھا تھا کہ دلاور خان کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ...... وہ تو روز اُس کے فون اٹینڈ کر رہا تھا۔ دلاور خان اُس سے ذویا کی خیریت معلوم کرتا تھا اور اسپتال بھی باقاعدگی سے چکر لگاتا تھا۔

''اب کیا فائدہ؟'' ذویا افسردگی سے بولی۔

''ارے اب کون سا تمہاری عمر نکل گئی ہے۔ ابھی تو تم جوان ہو۔'' بوبی نے مسکراتے گنگناتے لہجے میں کہا وہ بھی مسکرا دی۔

وہ سب 'احتشام ولا' پہنچے تو ذویا کو ایک زبردست سرپرائز بھی ملا اُس کے بڑے بھائی مصطفیٰ بھی امریکہ سے آ چکے تھے۔ ذویا کی حالت کا انہیں علم ہو چکا تھا۔ لیکن اُن کے ایگزامز ہو رہے تھے اور مصطفیٰ کی تو جاب سے چھٹی کا مسئلہ بھی تھا۔ اس لیے احتشام الحق نے انہیں اُس وقت آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ بھی ذویا کے لیے بہت پریشان تھے۔ لیکن اب اُسے زندہ سلامت اور تندرست ہوتا دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ ذویا بھی اُن کو ایک طویل عرصے بعد اپنے درمیان پا کر بہت خوش تھی۔

(باقی آئندہ)

افسانہ

خولہ عرفان

آج کی خاص عورت

ہم تم تو پھر بھی ایک دوسرے سے خیالات کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ اُن کو تو سننے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ لنچ ٹائم ختم ہو گیا تھا اور وہ مجھے حقیقت کا آئینہ دکھا کر پشیمان چھوڑ کر مسکراتی ہوئی واپس اپنی نشست پر جا چکی تھی۔ آفس میں میری صرف فوزیہ سے ہی دعا سلام تھی لنچ ٹائم میں......

میں نے اوون پر سے لکڑیاں اُتاری ہیں۔ اب خدارا! یہ نہ پوچھیے گا کہ میں نے اوون پر لکڑیاں رکھی ہی کیوں۔ بہت دردناک داستان ہے۔ دراصل رات سے گیس بہت ہلکی آ رہی تھی روٹیاں پاپڑ کی طرح سخت بن رہی تھیں اور سالن! اس میں تو کھدکی تک نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے سوئی گیس کی موجودگی میں اس کی لو بڑھانے کے لیے لکڑیوں کو بطور ایندھن استعمال کر رہے تھے تاکہ سالن تو تیار ہو۔

باجی کا فون آیا ہوا تھا اور میں اُن کو اپنی دکھ بھری داستان ان کے ایک سوال کے جواب میں کہ ''کیا ہو رہا ہے؟'' گوش گزار کر رہی تھی۔ میں سانس لینے کو رکی تو باجی نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے پھر سوال داغ دیا کہ ہائے پھر کیا ہوا؟'' میں نے لہجے میں زمانے بھر کا دکھ سمو کر جواب دیا۔

''پھر کیا باجی کھانا تو تیار ہو گیا اب اس کے سائیڈ ایفیکٹس جو راکھ کی صورت میں چولہوں پر موجود ہیں انہیں صاف کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ یقین کریں اماں جی کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ چولہوں کو دیکھ دیکھ کر۔'' میں نے اپنی یادداشت کے کے پردے ہٹا کر اماں کے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یاد ہے نا آپ کو جب وہ بتاتی تھیں کہ بغیر گیس کے وہ کیسے مٹی کے تیل کے چولہوں پر یا لکڑیاں جلا کر اینٹوں پر کھانا پکاتی تھیں۔ قربان جانے کا دل چاہتا ہے اپنی حکومت کے، ہمارے بزرگوں کا دور یاد دلا کر ماضی بھولنے نہیں دیتے۔'' باجی نے میرے طنز کو ہنستے ہوئے سنا۔

''اچھا ٹھیک ہے تم اب پہلے کاموں سے فارغ ہو جاؤ پھر بات کریں گے بلکہ تم خود فون کر لینا مجھے پتا نہیں یاد رہے گا کہ نہیں کیونکہ حمیرا کو ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے ابھی تو سو رہی ہے لیکن جاگتی ہے تو بڑے فضیتے کرتی ہے اپنے ابا پر گئی ہے پوری کی پوری۔'' انہوں نے میاں میں موجود ناپسندیدہ باتوں کا اولاد میں سرائیت کر جانے پر

خالص زنانہ انداز میں بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ میں نے جلدی جلدی صفائی سے فارغ ہو کر بریانی کا مصالحہ چڑھا دیا۔ کیونکہ آنچ اچھی آرہی تھی اور نند بھی بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ بچوں کو بریانی پسند بھی ہے۔ خوش ہو جائیں گے جب تک میں چاول چننے سے فارغ ہوئی بریانی کا مصالحہ بھی تیار ہو گیا تھا چاول بھگو کر بچوں کے کمرے کی خبر لی۔ چھٹی کا ایک ہی دن ملتا ہے اور ہفتے بھر کا کام سمیٹنا ہوتا ہے کیونکہ بحیثیت ورکنگ لیڈی مجھے سارے کام اس ایک چھٹی کی آس پر ہی چھوڑنے پڑتے ہیں۔ بچے بھی اٹھ گئے تھے ان سے کہا کہ فوراً الگنی پر سے کپڑے اُتار کر لے آؤ سوکھ کر گرنے لگیں گے رات کو ہی دھو کر ڈالے تھے۔ بچوں نے ناشتہ کر کے الگنی پر سے کپڑے اتار کر کمرے میں ڈھیر لگانا شروع کر دیے۔ میں نے بڑی بیٹی زوبیہ کی جانب دیکھا۔

"بیٹا میرے، بابا اور اپنے بہن بھائیوں کے کپڑے الگ کر لو۔" یہ کہہ کر جلدی سے کچن میں آئی کہ چاول چولہے پر چڑھا دوں۔

"لیکن یہ کیا؟ گیس پھر غائب! خیر وہی رات والا عمل دہرایا گیا۔ لکڑیاں اوون پر رکھیں

لیکن اس وقت تک بریانی کھچڑی میں تبدیل ہوچکی تھی۔ جب بریانی دسترخوان پر سب کو نکال کردی تو سب نے پوچھا۔

''یہ کون سی ڈش ہے؟ میں نے کہا کہ یہ مضافاتی بریانی ہے اِس کو ہلکی آنچ پر پکایا جاتا ہے اور صبر وشکر کے رائتے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ بہت مزہ آئے گا کھا کر دیکھو۔ اس کے بعد تم لوگوں کو مزیدار سی آج کی شہری آئسکریم بھی کھلائیں گے۔ سب نے بریانی بھلے سے کم کھائی مگر کھالی۔ میں نے اس پر بھی شکر کیا کہ چاولوں کی کچھ مقدار تو کم ہوئی اور گیس والوں کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے دسترخوان بڑھالیا۔ جب آئسکریم بچوں کو نکال کردی تو آئسکریم کپ دیکھ کر کہنے لگے۔

''مامی آپ نے ان کپس میں کولڈ ڈرنک کیوں بھردی۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔

''نہیں بیٹا رات ہی تو ماما سے آئسکریم منگوا کر تم لوگوں کے لیے الگ الگ کپس بنا کر رکھے تھے۔ بیٹا آئسکریم ہی ہے۔'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ دراصل رات سے بجلی نہیں تھی فرج نہیں چل سکا تھا لیکن خیر ہے آئسکریم آئسکریم ہوتی ہے جمی ہوئی ہو یا پگھلی ہوئی۔ بچوں نے کھا ہی لی۔ طبیعت میں عجیب سی بیزاری پیدا ہوگئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کام کرنا بھولتی جارہی ہوں۔ کھانے سے فارغ ہوکر جب کمرے میں آئی تو دیکھا کہ جن صاحبزادی پر کپڑوں کے لیے تکیہ کیا تھا۔ وہ سب کپڑوں کو تکیہ بنا کر اُن پر استراحت فرما ہیں۔ تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن غصہ پیتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

''بیٹا کب کہہ کر گئی تھی کہ کپڑے الگ الگ کرلینا اور تم لیٹی ہوئی ہو پھر خود ہی جلدی جلدی کپڑے الگ کیے۔ بچوں کے کپڑے ان کی الماری میں رکھے اور اپنے میاں جی کے کپڑے الگ کرلیے کہ پہلے بچوں کا کمرہ سمیٹ لوں پھر کپڑے لے جاؤں گی ابھی کمرہ سمیٹ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ میاں صاحب کی درد بھری آواز سنائی دی۔

''بیگم چائے تو پلا دو۔'' میں نے کہا۔

''اچھا آتی ہوں۔'' تو پھر وہی درد وغم میں ڈوبی فریاد سنائی دی۔

''بس میرے ہی کاموں کو ٹالتی رہنا سب کے کام کرلینا۔'' اور یہ آواز سننے کے بعد کمرے میں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ اُن کو چائے دے کر آئی کہ اب اپنے کمرے میں کپڑے لے جا کر اُس کو بھی سمیٹ لوں لیکن جب کمرے میں دوبارہ آئی تو بیڈ پر تولیہ پڑا ہوا نظر آیا۔ غصے میں بڑبڑاتے ہوئے اس کو اندر ہینگر پر ٹانگا تو سامنے سائیڈ بورڈ پر پھر زوبیہ کی کہانیوں کی کتابیں نظر آئیں سوچا کہ ان کو بھی شیلف میں رکھتی جاؤں۔ شیلف میں کتابیں رکھ کر مڑی تو سوئیوں اور ریلوں کے ڈبے پر ہاتھ لگا جو سائیڈ بورڈ پر ہی رکھا تھا۔ ساری سوئیاں اور ریلیں نیچے بکھر گئیں اُن کو واپس ڈبے میں رکھ کر فارغ ہوئی تو دوسری بیٹی صاحبہ نے سر پر تیل لگانے کا شوق پورا کیا تھا اور سائیڈ بورڈ پر ہی تیل کی شیشی چھوڑ کر جاچکی تھیں۔ وہ شیشی اُٹھا کر کمرے سے باہر شیلف میں رکھی اور پھر اپنے کمرے میں آگئی۔

کمرے میں واپس آ کر خیال آیا کہ بچوں کے کمرے میں گئی کیوں تھی لو اپنے کپڑے تو وہیں کے وہیں رہ گئے۔ پھر گئی کہ کپڑے لے آؤں تو بیڈ پر زوبیہ صاحبہ اپنی کتابیں اور بیگ چھوڑ کرسی

تفریحی دورے پر جا چکی تھیں۔ دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں تو چیخنے کا سہارا لیا زوبیہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''کیا ہوا امی؟'' میں نے غصہ سے کہا کہ امی کی بچی امی تم کو پاگل نظر آ رہی ہے دو دفعہ کمرہ صاف کر کے جا چکی ہوں۔ جب آتی ہوں بستر پر کوئی نہ کوئی کاپی کتاب رسالہ یا کپڑا پڑا نظر آتا ہے تم کو اِن سب چیزوں کے رکھنے کی جگہ نہیں پتا کیا؟'' میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔

• بچی فوراً پریشان ہوگئی دوسری صاحبزادی بھی میرا پارہ تمام ریکارڈ توڑتا دیکھ کر بھاگی ہوئی آئیں لیکن اطمینان قابلِ دید تھا، فرمایا۔

''امی ابھی کمرہ صاف کر دیتے ہیں آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں۔'' اور میں دونوں کو غصے سے گھورتے ہوئے ان کے کمرے سے اپنے کپڑے لے کر کمرے میں آگئی۔ سر گھوم رہا تھا کہ صبح سے شام ہونے کو آ گئی تھی نہ کام ختم ہونے کا نام لے رہا تھے اور نہ گھر سمیٹنے میں آ رہا تھا۔ سر پکڑے بیٹھی ہی تھی کہ سونے پر سہاگہ شوہر نامدار آ گئے۔ یار کیوں بچیوں پر چیخ رہی ہو باہر آواز جاتی ہے۔

''مار لیا کرو مگر چیخا نہ کرو خدارا!'' انہوں نے التجائیہ انداز میں کہا تو میں نے تنک کر جواب دیا۔

''ہفتے میں ایک دن گھر کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے آج بھی بچوں کو کوئی نصیحت نہ کروں باقی دن تو ویسے ہی آفس سے آنے کے بعد میرے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔ بچے آگ لگائیں یا باغ، صرف کھانا پکانا اور زیادہ سے زیادہ اُن کی پڑھائی سے متعلق ہی کام ہوتے ہیں۔'' تو فرمانے لگے کہ ''بھئی بچیوں پر میں تو ہرگز ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا اُن کی تربیت تمہاری ذمہ داری ہے۔ اتنے مطمئن انداز پر صرف اُن کو کھولتے دماغ کے ساتھ گھور کر ہی رہ گئی۔

پھر بات بدل کر میں نے کہا کہ سب چھوڑیں باجی کی طرف جانا ہے۔ حمیرا کو ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے اُس کو دیکھ کر آنا ہے ورنہ باجی کہیں گی کہ بتانے کے باوجود بھانجی کو دیکھنے نہیں آئی۔'' ویسے بھی کل سے وہی اسکول اور آفس کا لگا بندھا معمول شروع ہو جائے گا اور وقت نہیں مل سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ تم کام سے فارغ ہو جاؤ تو چلے چلیں گے۔ کام سے فارغ ہو کر جب باجی کے گھر سے واپس آئی تو نو بج چکے تھے۔ فٹافٹ بچوں کو سونے کے لیے لٹایا اور خود بھی کپڑے بدل کر سونے کے لیے لیٹ گئی کہ بچوں کے اسکول اپنے اور میاں جی کے آفس کے لیے صبح ہی اٹھنا ہوتا ہے۔ لیٹ کر آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ ایکدم خیال آیا کہ یونیفارم اور کپڑے تو استری ہی نہیں کیے۔ مگر پورا دن گھن چکر بننے کے بعد اب بالکل بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میاں جی سے کہا پلیز آپ بچوں کی یونیفارم پر استری کر دیجیے گا۔ انہوں نے جن محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر حامی بھری تو میں نے فوراً ہری جھنڈی دکھاتے ہوئے کہا۔

''جناب آپ کو استری کرنی ہو تو کر دیجیے گا ورنہ میں صبح اُٹھ کر خود کرلوں گی لیکن پلیز سکون سے سونے دیجیے گا۔'' تو انہوں نے فوراً اپنی لائن صاف کی۔

''ارے بیگم تم تو بلاوجہ میری محبتوں پر شک کرتی ہو۔'' میں نے مسکرا کر کروٹ لی اور مجھے پھر نہیں خبر کب سو گئی۔ چھٹی کا دن ہمیشہ ہی ایسی افراتفری میں گزرتا تھا۔

یار گھریلو عورتوں کے بھی کتنے مزے ہوتے ہیں سکون سے نیند پوری کرتی ہیں۔ کام بھی

سارے وقت مقررہ پر ہوجاتے ہیں۔ شوہر اور بچوں کو قابو کرنے کی تراکیب کے لیے بھی وقت خوب مل جاتا ہے۔ اگلے دن آفس میں لنچ ٹائم کے موقع پر میں نے اپنی کولیگ فوزیہ سے کہا اور اگر غور کرو تو ایسی خواتین کے میاں بھی بیگمات کے سب سے زیادہ وفادار نظر آتے ہیں۔ فوزیہ نے کہا۔

''نہیں صوفیہ یہ قانون تم سب خواتین پر نہیں لگا سکتیں۔ بہت سی بلکہ زیادہ تر گھریلو خواتین ایسی ہیں جو نہ صرف بہت کسمپرسی میں زندگی گزارتی ہیں۔ بلکہ میاؤں کے طعنے اور نخرے بھی برداشت کرتی ہیں لیکن کسی کو بھی اپنی مشکلات کا پتا نہیں لگنے دیتیں۔ تم تو صرف بنیادی ضروریات کی عدم فراہمی یا اس میں تعطل کی وجہ سے پریشان ہو جبکہ اُن میں سے بہت سی خواتین کو یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ بنیادی ضروریات ہے کس چڑیا کا نام۔ تم اپنی پریشانیوں سے باہر نکل کر دیکھو ہر ایک پریشان اور دُکھی ہے۔

ہم تم تو پھر بھی ایک دوسرے سے خیالات کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ اُن کو تو سننے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ لنچ ٹائم ختم ہو گیا تھا اور وہ مجھے حقیقت کا آئینہ دکھا کر پشیمان چھوڑ کر مسکراتی ہوئی واپس اپنی نشست پر جا چکی تھی۔ آفس میں میری صرف فوزیہ سے ہی دعا سلام تھی لنچ ٹائم میں جب بھی مل کر بیٹھتے تو سوشل ایشوز ضرور زیر بحث لاتے تھے۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جبکہ میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ مجھے تقریباً روز ہی آفس پہنچنے میں آدھے پون گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ سر اور کولیگز دونوں ہی بہت تعاون کرنے والے مل گئے تھے۔ اُن ہی کی دی ہوئی رعایت تھی لیکن پھر بھی اندر سے ضمیر ضرور ملامت کرتا رہتا تھا کہ اپنے مسائل کا فائدہ اٹھانا اچھی بات نہیں ہے۔

شام کو ظہیر اپنے آفس سے واپسی پر مجھے بھی لینے آتے تھے لیکن جس دن نہیں آیا کرتے تھے اُس دن حشر ہو جاتا تھا گھر میں ساس سسر بھی موجود تھے اور پھر بچے بھی اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ اپنے سارے کام خود کر سکتے تھے۔ اس لیے کافی حد تک کام ہلکا ہو گیا تھا اور زندگی بھی منظم انداز میں چل رہی تھی لیکن گزشتہ چند سالوں سے گیس، بجلی اور پانی کی وقتاً فوقتاً ہونے والی عدم فراہمی نے مزاج میں بہت چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ بچے بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے اور بھی کبھی کہہ بھی دیتے تھے کہ امی آپ اب بہت غصہ کرنے لگی ہیں۔ خود اپنی طبیعت کی بیزاری سے بھی ڈر لگتا تھا کہ کسی بھی وقت میری اس تنک مزاجی پر میاں صاحب کہیں بے بھاؤ کی نہ سنا ڈالیں۔

ایسے ہی معروف دنوں میں سے ایک دن جب پانی کی عدم فراہمی چل رہی تھی۔ اچانک پانی آنے لگا۔

میاں جی کی ہر اطلاع سن کر فوراً میں نے لانڈری بیگ کھول کر کپڑے دھونے کے لیے نکال لیے۔ جب ان کے پاس پہنچی تو ان کو کچن میں کھڑا پایا۔ میں نے کہا کہ آپ تو کہہ رہے تھے کہ پانی آ گیا ہے تو فرمایا۔

''میری جان نل سے نہیں چولہوں سے پانی آ رہا ہے۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بار بار آنکھیں صاف کر کے دیکھا لیکن آنکھوں میں نہیں اوون میں ہی پانی بھرا ہوا پایا۔ پتا چلا کہ پانی کی لائن پھٹ گئی ہے اور گیس کی لائن میں پانی رس رس کر شامل ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے گیس

کے ساتھ پانی بھی آرہا ہے۔میں نے کہا۔
''خدا کی شان دیکھیں کہاں چولہوں میں گیس نہیں آرہی تھی کجا یہ کہ پانی کی سہولت بھی میسر آگئی۔لیکن پھر آگ اور پانی کا ملاپ ناممکن تھا اس لیے پہلے اوون صاف کیا۔میاں جی نے گیس کمپنی کو فون کیا، کھانا باہر سے آیا اور کپڑے واپس لانڈری میں چلے گئے۔میں نے میاں سے کہا۔
میر درد کو خواتین کے مستقبل میں ہونے والے اس درد کا پہلے سے ہی احساس ہوگیا تھا کیا خوب کہا ہے انہوں نے۔
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے
پانی ہوتا ہے تو بجلی نہیں ہوتی بجلی آتی ہے تو گیس غائب ہوجاتی ہے اور جب بجلی اور گیس دونوں موجود ہوں تو پانی ناراض ہوجاتا ہے۔
حکومت تو بنیادی ضروریات بھی مہیا کرنے سے قاصر ہے۔سارے کے سارے حکمران صرف بڑی بڑی باتیں بناتے ہیں۔میاں نے کہا۔
''بیگم آپ دراصل بہت تھک گئی ہیں اور حقوقِ نسواں کے حصول کے پیش نظر یہ حکومت کا ابتدائی قدم ہے کہ آپ خواتین صرف آرام کریں نہ بنیادی سہولیات ہوں گی نہ اُن سے وابستہ خواہشات کی تکمیل کے لیے آپ بے چین ہوں گی اور نہ ہی کوئی آپ کو کام نہ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرائے گا۔آپ لوگوں پر تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں والا محاورہ پورا اترتا ہے۔میں نے بھی اُن کے محاوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمانبرداری دکھائی اور جاکر لیٹ گئی لیکن ذہنی کوفت برداشت کی حدوں کو پار کر کے مجھے نفسیاتی مسائل سے قریب کرتی محسوس ہورہی تھی۔
ایسے ہی شب و روز میں ایک دن اچنبا ہوا یعنی چولہا کھولا تو گیس شاندار آرہی تھی۔بجلی بھی صحیح وولٹیج کے ساتھ بنا تعطل آرہی تھی اور پانی کی بھی فراوانی تھی۔میں نے میاں جی سے پوچھا کیا آج کوئی خاص دن ہے۔میاں نے جواب دیا۔ ربیع الاول کا مہینہ چل رہا ہے ہوسکتا ہے حکومت نے تین چار دن کے لیے لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کا اعلان کیا ہو۔میں نے شکر ادا کیا اور سوچا کہ آفس سے واپسی پر آج شاپنگ کے لیے چلی جاؤں گی۔خوش قسمتی سے بچوں کے اسکول میں کسی پروگرام کی وجہ سے چھٹی تھی اس لیے پُرسکون ہوکر روانہ ہوگئی۔آفس سے واپسی پر طارق روڈ جانے والی جس بس میں سوار ہوئی وہ بھری ہوئی تھی۔
ڈرائیور کے سامنے والی سیٹوں پر ایک عورت اور دو بارہ چودہ سال کی بچیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ حلیے سے مانگنے والی لگ رہی تھیں اور کپڑوں سے بساند آرہی تھی میں نے ایک دفعہ کے بعد دوبارہ اُن لوگوں کی طرف نہیں دیکھا اُن کے گندے حلیے سے کراہیت محسوس ہورہی تھی۔ڈرائیور کی پچھلی سیٹوں پر دو خوش لباس و خوش شکل خواتین اور پانچ چھ سال کی ایک بچی براجمان تھی۔می ں نے بہت پیار اور نرمی سے کہا کہ ''بیٹا امی کی گود میں بیٹھ جاؤ تو برابر والی خاتون میری اس خود ساختہ رشتہ داری پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔
''کیوں بھئی اس بچی کا کرایہ دیا ہے یہ کیوں سیٹ سے اٹھے میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ کرایہ تو میں نے بھی دیا ہے خاتون! ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔تو اندازِ بے نیازی سے ارشاد فرمایا کہ آپ نے اپنی مرضی سے کھڑے

ہو کر سفر کرنے کا کرایہ ادا کیا ہے نہ چڑھتیں اس بس میں۔ میں نے کہا۔

کوئی بات نہیں اگر ڈرائیور کنڈیکٹر اجازت دیں تو اس سیٹ کو گھر بھی لے جایئے گا۔ اور اُن کا مزید کوئی جواب سنے بغیر اُن کی طرف سے منہ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ تھکن سے بری حالت ہو رہی تھی شدت سے بیٹھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ اتنے میں جو خستہ حال سی ماں بیٹیاں بیٹھی تھیں اُن میں سے ایک بچی خود اُٹھ کر اپنی ماں کی گود میں ٹیک لگانے والے انداز میں بیٹھ سی گئی اور مجھے اس خالی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا کہ میں اپنی ٹھن فن میں ان کے حلیے سے کراہیت محسوس کر رہی تھی لیکن یہ نہ جان سکی کہ اُن کا اخلاق کتنا اچھا ہے۔ میں شکریہ کہہ کر ناک پر رومال رکھ کر بیٹھ گئی۔ طارق روڈ پر اُتر کر اپنے معاشرے کے لوگوں کے رویوں کے بارے میں سوچتی رہی کہ کتنا تضاد ہے ہمارے قول وفعل اور ظاہر و باطن میں۔ بڑا گھومنے کے بعد بازار میں بچیوں کے لیے دو سوٹ پسند آئے اور بیٹے کے لیے جینز اور ٹی شرٹ لی۔ پیکنگ کروا کر پرس میں سے والٹ نکالا تو ہاتھ پرس کے اندر سیر کر کے خالی باہر نکل آیا۔ ایکدم ساری حسیات جاگ گئیں اور چہرے سے ہویداں تھکن رفو چکر ہوگئی۔ دکان پر کھڑے کھڑے پورا پرس الٹ دیا ۔ لیکن نہ والٹ نکلا پیسوں کا اور نہ ہی ایک پھوٹی کوڑی۔ مزید یہ کہ موبائل بھی غائب تھا۔ نظر میں وہ فقیر حلیے والی ماں بیٹیاں گھوم گئیں۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی پھر کچھ حواس قابو میں کر کے دکان سے ہی میاں کو فون کر کے بلایا۔ دکاندار کو کپڑے واپس کیے اور معذرت کر لی۔ گھبرا کر خوب دل کی بھڑاس نکالی کہ ہمارا تو حال یہ ہے کہ

ہیں کوا کب نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

بداخلاقی اور بے اعتباری کی بھی انتہا ہے۔ انسان کس پر بھروسہ کرے۔ میاں نے کہا اتنا دل خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کو اگر پیسوں کے جانے کا دکھ ہے تو یاد رکھو کہ یہ تو آنی جانی چیز ہے۔ میں نے کہا کہ پیسوں کے جانے کا دکھ نہیں ہے بلکہ اپنے لوگوں میں روز بروز گرتی ہوئی اخلاقی اقدار کا دکھ ہے۔

میاں نے کہا کہ اللہ پر بھروسہ کرو اور اپنی اصلاح پر صرف دھیان دو۔ ہمارے اندر بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ اپنے اوپر بات آتی دیکھ کر خاموشی سے اپنے کام کے لیے اٹھ گئی۔

دوسرے دن آفس میں سر نے بلایا تو یہ غم کی داستان ان کو بھی سنائی۔ انہوں نے واقعے پر تعزیت کرنے کے بعد کہا کہ مسز صوفیہ کل سے آفس ذرا وقت پر آ جائے گا۔ مجھے پتا ہے کہ آپ کے ساتھ مسئلے ہیں لیکن آپ کی کولیگ مسز فوزیہ کی والدہ ایک ہفتے سے اسپتال میں داخل ہیں۔ کل سے ان کی طبیعت کافی خراب ہے۔ اس لیے فوزیہ تھوڑی تاخیر سے آئیں گی ویسے بھی آپ کے تاخیر سے آنے پر آپ کا کام اُن ہی کو دے دیتا ہوں۔ بہت تعاون کرنے والی خاتون ہیں امید ہے کہ آپ بھی بھرپور تعاون کریں گی۔

میں نے حیرانگی اور شرمندگی کی درمیانی کیفیت میں کہا۔

”لیکن سر فوزیہ نے کبھی اپنے کسی مسئلے کا مجھ سے ذکر نہیں کیا ورنہ میں......“ سر نے بات کاٹنے کی معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ دراصل فوزیہ نے ہی مجھے منع کیا تھا کہ صوفیہ کو بچوں کی وجہ سے صبح بہت مسئلہ ہوتا ہے جب تک میں آ سکتی ہوں

آپ اسے پریشان نہ کریں۔

"ٹھیک ہے سر! کل سے انشاء اللہ میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔" میں سر کو مطمئن کر کے اُن کے آفس سے باہر آ گئی۔

آفس سے واپسی پر فوزیہ کے گھر کا ایڈریس لے کر اس کے گھر پہنچی دروازہ یقیناً فوزیہ کے شوہر نے ہی کھولا تھا۔ فوزیہ کا پوچھنے پر چہرے پر موجود ناگواری کے بھرپور تاثر نے شرمندگی کے گہرے احساس میں جکڑ لیا اور اندر سے آنے والی اُس کی آواز سُن کر اپنا وجود زمین میں گڑتا محسوس ہوا جو بدتمیزانہ لہجے میں فوزیہ سے مخاطب تھا کہ لو صبح سے اپنی اماں کے ساتھ مری ہوئی تھیں۔ اب مزید تمہارے رشتے دار آ گئے ہیں۔ جاؤ جا کے دیکھو۔ میں نے دل میں شکر کیا کہ اس وقت ظہیر میرے ساتھ نہیں ہیں ورنہ میں اُن سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہتی۔

تھوڑی دیر میں دروازے پر فوزیہ کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ گھر میں بسی پریشانی کا جو مجھے محسوس ہو رہی تھی اس کے چہرے پر کہیں عکس نہیں تھا نہ ہی شوہر کے لفظوں کا کوئی تاثر اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات چھوڑے ہوا تھا۔ میں نے بھی مسکرا کے ایسا ہی تاثر دیا جیسے کچھ نہیں سنا۔ علیک سلیک کر کے تھوڑی دیر اس کے اوسط درجے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی جس کے رنگت اڑے پردے اچھے وقتوں کے انتظار کا رنگ لیے صفائی اور قرینے سے رکھی ہوئی چیزوں کے ساتھ کسی حد تک گھر کی پریشانی کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے فوزیہ کی والدہ کی خیریت لی اور پھر گھر پر دیر ہو جانے کا بہانہ کر کے اسے آفس کی طرف سے بے فکر ہو جانے کا کہہ کر گھر واپس آ گئی۔ اسے تو میں نے اطمینان دلا دیا تھا۔ لیکن میرا اپنا اطمینان کھو چکا تھا۔ مجھے اپنا وجود بس میں بیٹھنے والی عورتوں میں مدغم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اُن سے قطعاً الگ نہیں بلکہ اُن ہی کا ایک حصہ ہوں۔

جس طرح وہ اپنے آرام اور عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر غیر اخلاقی اطوار دکھانے پر مجبور تھیں اسی طرح میں بھی اپنے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر تاخیر سے پہنچ کر اپنے آفس کولیگز کو پریشان کرنے کا باعث تھی لیکن صرف ایک فوزیہ تھی جس کے آگے حالات و مفلسی اور دھوکہ سب مجبور کھڑے تھے کوئی اسے جھکا نہیں سکا تھا۔ نہ اُس کے حالات اُس کے فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ تھے، نہ اس کی مفلسی اسے کسی کو دھوکہ دینے پر مجبور کر رہی تھی اور نہ ہی اس نے اپنے اخلاق اور عورت کے مرتبے کو کسی مقام پر گرنے دیا تھا۔

میری آنکھوں سے خاموشی سے انسو بہہ رہے تھے کہ اتنے عرصے اُس کے ساتھ رہ کر نہ اس کو جاننے کی کوشش کی اور نہ اسے پہچان سکی اور جب اپنی حقیقت کا ادراک ہوا تو خود کو ایک عام سی عورت پایا جو کہیں نہ کہیں اپنی آزمائشوں، ضرورتوں اور خواہشوں کے آگے ہار جانے والی آج کی عام سی عورت ہے۔ لیکن اس دور کی اُس خاص عورت کو دیکھ لیا جس کے لیے اللہ نے آسمان پر جنت اور زمین پر آزمائش کے لیے یہ دنیا بنائی ہے۔ جو مرد کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اس کے حوصلہ شکن رویوں کے باوجود شکر گزاری اور خوش دلی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

صائمہ نصیر احمد

پھانس

''میرے اور بھی کزنز ہیں لیکن جو احساسات میرے دل میں ماہم کے لیے ہیں۔ وہ کسی اور کے لیے نہیں۔ بچپن سے میرے ذہن نے جو خاکہ بہن کا بنایا ہے ماہم اس پر پورا اترتی آئی ہے۔ میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں بالکل اسی طرح جیسے ایک بھائی اپنی بہن سے......

''پھوپو! دوپہر کے لیے کیا بنانا ہے؟'' ماہم گھر کی صفائی کرنے کے بعد سائرہ کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں سائرہ کو استری کرتے دیکھ کر وہ اختیاراً آگے بڑھی۔

''پھوپو! یہ کیا کر رہی ہیں آپ، میں کرلوں گی نا، چلیں چھوڑیں یہ سب......'' وہ سائرہ کو شانوں سے پکڑ کر وہاں سے ہٹانے لگی۔

''ارے...... ارے...... ماہم!'' سائرہ گھبرا کر خود کو چھڑانے لگیں مگر ماہم نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔

''یہ میں لنچ کے بعد پریس کرلوں گی۔ ویسے بھی اتنی لمبی لمبی دوپہریں ہیں کہ کٹتی ہی نہیں۔''

''ماہم! تم تھک جاؤ گی اتنے سارے کام کر کے۔'' سائرہ کے لہجے میں بھتیجی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

''یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ تم سارے گھر کے کام کرو اور میں یہاں فارغ بیٹھ کر پلنگ توڑتی رہوں۔ ساتھ میں بور ہوتی رہوں۔''

''بور کیوں ہونے لگیں آپ، آپ ٹی وی پر اپنے فیورٹ پروگرام دیکھیں۔ ڈرامے یا پھر کوکنگ شوز دیکھیں اور انجوائے کریں۔'' ماہم مسکراتے ہوئے بولی۔ جب تک میں یہاں ہوں تب تک آپ کے لیے فل آرام اینڈ نو کام۔''

''ماہم! کچھ بھی ہو، مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تم سے کام کراتے ہوئے۔ تم یہاں کچھ ہی دنوں کے لیے آئی ہو۔''

''ارے پھوپو نہ تو میں مہمان ہوں اور نہ ہی چند روز میں یہاں سے جانے والی ہوں۔ میں دو مہینے گزار کر ہی جاؤں گی تب تک کے لیے آپ کو مجھے برداشت کرنا ہی ہوگا۔'' ماہم سائرہ کی بات کاٹتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔

''میرا بس چلے تو تمہیں یہاں سے جانے ہی نہ دوں۔'' سائرہ کے لہجے میں ماہم کے لیے جیسے دنیا بھر کا پیار سمٹ آیا۔ جواب میں ماہم مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس پھوپو اسے بہت پیار کرتی ہیں۔

ماہم سائرہ کے اکلوتے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ انہیں کچھ زیادہ ہی عزیز تھی۔ ان دنوں وہ پشاور سے یہاں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ آتے ہی ماہم نے سب کام اپنے ہاتھ میں

لے لیے۔ سائرہ بہت کم ہی دوسروں کے کام سے مطمئن ہوتی تھیں لیکن ماہم نے جس سلیقے اور ترتیب سے گھر سنبھالا۔ سائرہ تو حیران ہی رہ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کی لاڈلی اور چلبلی بھتیجی اتنی سلیقہ منداور گھر کے کاموں میں ماہر ہوسکتی ہے۔ ان چند ہی دنوں میں ماہم نے سب کو اپنا عادی بنادیا۔

عدیم' تیمور اور ثاقب جو پہلے ماں کے اکیلے پن کی وجہ سے اپنے کافی حد تک کے کام خود کرلیتے تھے۔ اب ذرا ذرا سی بات پر ماہم کو آواز دیتے خاص طور پر صبح کے وقت اس گھر میں ماہم کے نام کی صدائیں ہی بلند ہوتیں۔ عدیم کہتا۔

''ماہم پلیز! میری شرٹ تو پریس کردو۔''

دوسری جانب تیمور پکارتا۔

''ماہم آپی! یہاں میری بک رکھی تھی وہ نہیں مل رہی۔'' ثاقب الگ سے فرمائش کرتا۔

''ماہم آپی! میرے لیے اچھا سا پراٹھا بنادیں جو بالکل سرخ ہونا چاہیے۔'' ایسے میں سائرہ انہیں ٹوکتی۔

''کچھ شرم کرو یہ کیا ہر کام کے لیے اسے تنگ کرتے رہتے ہو۔'' پر ماہم کا کہنا تھا کہ اسے یہ سب کر کے خوشی ملتی ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سائرہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی۔ وہ باقاعدگی سے دوپہر میں دو گھنٹے کی نیند لیتی تھیں۔ ماہم نے کچن سمیٹا اور کمرے میں آ گئی۔ نماز پڑھ کر وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ ماہم اپنے گھر میں اس وقت کبھی بھی نہیں سوتی تھی پر چونکہ یہاں وہ صبح جلدی جاگ جاتی تھی اس لیے اس وقت کھانا کھاتے ہی اس پر نیند حملہ آور ہوجاتی تھی۔ اسے سوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر ہونے والی بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے وال کلاک میں دیکھا جو چار بجا رہی تھی۔

''اِس وقت کون آ گیا؟'' ماہم نے جھنجلا کر سوچا۔ ثاقب اور تیمور گھر پر تھے اس لیے اُس نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند آنکھوں سے غائب ہوچکی تھی۔ ماہم کو اپنی اس عادت سے سخت چڑ تھی کہ ایک بار آنکھ کھلی تو پھر مشکل سے ہی نیند آتی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے کون آیا ہوگا۔ عدیم اور انکل اس وقت نہیں آتے تھے۔ ابھی وہ اسی سوچ میں تھی کہ ثاقب آوازیں دیتا ہوا آ گیا۔

''ماہم آپی......! ماہم آپی......!'' ماہم جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ جاگ رہی ہیں؟'' ثاقب نے کہا تو ماہم بے اختیار ہنس دی۔

''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟''

ثاقب جھینپ گیا۔ ''و......وہ میرا مطلب تھا کہ میں نے آپ کی نیند تو خراب نہیں کی۔''

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں، تم بتاؤ کوئی کام تھا؟'' ماہم نے پوچھا۔

''ہاں وہ میرے دوست آئے ہیں اگر آپ چائے بنادیں تو......'' اسے اب شرمندگی سی ہورہی تھی یہ سوچ کر کہ اس نے ماہم کی نیند خراب کی۔

''اچھا تو یہ تمہارے دوست تھے جن کی بیل سے میری آنکھ کھلی۔''

''ہمارے ٹیسٹ ہونے والے ہیں۔ ہم نے سوچا مل کر اسٹڈی کریں گے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آ کر میرے موبائل پر مس کال کردینا تو میں دروازہ کھول دوں گا۔ مگر وہ بہت ہی اسٹوپڈ

ہیں۔'' ثاقب نے معصومیت سے کہا۔ اسے واقعی میں اپنے دوستوں پر غصہ آیا تھا۔ جس کا اس نے ان کے سامنے اظہار بھی کر دیا تھا۔ ثاقب کو ڈر تھا کہیں ماں کی نیند خراب نہ ہو جائے ورنہ وہ بہت غصہ ہوں گی۔ باہر چھائی خاموشی سے لگ رہا تھا کہ بجنے والی بیل سائرہ پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ کیونکہ دوسری صورت میں وہ ثاقب کی کلاس لے رہی ہوتیں۔

''اچھا تم اپنے دوستوں کے پاس جاؤ مگر اتنا بتا دو کہ چائے یا ساتھ میں کچھ اور بھی۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' ثاقب نے کہا۔

''ٹھیک ہے بناتی ہوں کچھ......'' ماہم مسکرائی۔

''تھینک یو آپی!'' ثاقب یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ ماہم نے بال سمیٹ کر کیچر لگایا اور منہ ہاتھ دھو کر کچن کی جانب چل دی۔

ماہم کو آئے ہوئے مہینہ ہونے کو تھا لیکن وہ ابھی تک کہیں گھومنے کے لیے نہیں گئی تھی۔ اس بات پر سائرہ سخت برہم تھیں۔

''غضب خدا کا، کسی کو ذرا سا احساس نہیں ہے کہ کزن آئی ہوئی ہے اسے گھوما پھرا کر تفریح کرا دیں۔ سب اپنے آپ میں ہی مگن ہیں۔ بس کام کے وقت کزن یاد آتی ہے۔ ماہم یہ کر دو...... ماہم وہ کر دو۔'' سائرہ بہت غصے میں تھیں۔ یہ سب وہ خاص طور پر عدیم کو سنا رہی تھیں کیونکہ ثاقب اور تیمور اپنی طرف سے ماہم کو کمپنی دے رہے تھے۔ کئی بار وہ اسے آئس کریم کھلانے بھی لے جا چکے تھے۔

''ممی! میں خود ماہم سے کئی بار کہیں جانے کے لیے کہہ چکا ہوں لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے سیر سپاٹے کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ باہر جانے کے نام سے ہی اسے اُلجھن ہونے لگتی ہے۔'' عدیم بہت سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ماہم حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں نے یہ کب کہا تھا؟'' عدیم کی بات سن کر سائرہ کو کچھ تعجب ہوا، مگر ماہم کے چہرے پر چھائی حیرت دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گئیں۔

''ماہم اگر تمہیں کہیں آنا جانا اچھا نہیں لگتا تو کم از کم ممی کا دل رکھنے کے لیے ہی مان جاؤ۔'' عدیم نے التجائیہ انداز میں ماہم سے کہا۔

''عدیم! تم نے کہیں خواب تو نہیں دیکھ لیا۔'' ماہم کو اس کے جھوٹ پر غصہ آنے لگا۔

''پھوپو! نہ تو اس نے مجھے کہیں جانے کے لیے کہا ہے اور نہ ہی میں نے منع کیا ہے۔'' ماہم کو غصہ ہوتا دیکھ کر عدیم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ثاقب اور تیمور بھی مسکرانے لگے۔ ماہم کو بہت جلد غصہ آ جاتا تھا جبکہ عدیم اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

''عدیم! یہ بتاؤ کب لے کر جا رہے ہو ماہم کو گھمانے؟'' سائرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں نے کب انکار کیا ہے بس یہ ماہم راضی ہو جائے تو چلے چلیں گے۔'' عدیم مسکراتے ہوئے بولا اسے ماہم کو ستانے میں مزہ آ رہا تھا۔

''عدیم! جھوٹ اور ڈھٹائی کی بھی حد ہوتی ہے۔'' وہ غصے سے اسے دیکھنے لگی۔

''بھائی جان! آپ پروگرام سیٹ کریں۔ آپی کو ہم منا لیں گے۔'' تیمور خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''تیمور! تم بھی......'' ماہم نے اسے گھورا۔ تو تیمور ہنسنے لگا۔

''یار تیمور! اگر ماہم نہیں جانا چاہتی تو کوئی بات نہیں ہم اسے سب جگہوں کے بارے میں

تفصیلاً بتا دیں گے۔ پھر اسے یوں لگے گا جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے سب دیکھ رکھا ہو۔" عدیم نے اسے چھیڑنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں مجھے کچھ بتانے کی، تم لے جانا نہیں چاہتے تو مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارے ساتھ کہیں جانے کا۔" ماہم نے خفگی سے کہا۔

"دیکھا ممی! خود ہی کہہ رہی ہے کہ اسے کوئی شوق نہیں۔"

"عدیم! بہت ہو گیا مذاق...... سیدھی طرح بتاؤ کب لے کر جا رہے ہو سب کو پکنک پر......" ماہم کو ناراض ہوتا دیکھ کر سائرہ نے سخت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

سائرہ کے موڈ کو دیکھ کر عدیم سمجھ گیا کہ اب ذرا سی بھی اِدھر اُدھر کی بات کی تو وہ ناراض ہو جائیں گی۔ اس لیے ماہم کو مزید تنگ کرنے کے بجائے بڑی فرمانبرداری کے ساتھ بولا۔

"جب آپ کہیں، بندہ حاضر ہے۔"

"اسی سنڈے کو چلتے ہیں، کتنا وقت ہو گیا ہے سب گھر والے مل کر پکنک کے لیے نہیں گئے اور اب تو ماہم آپی بھی ہیں۔ سچ میں بہت مزہ آئے گا۔" سائرہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ثاقب بول اٹھا۔

"پھوپو! مجھے کہیں نہیں جانا۔" ماہم روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"لیکن کیوں؟" ثاقب نے کہا۔ وہ اس پکنک کو لے کر کافی ایکسائیٹڈ ہو گیا تھا۔

"یہ کب سے اتنے نخرے جو دکھا رہا ہے۔" ماہم خفگی سے بولی۔

عدیم نے جھٹ سے کہا۔ "ہاں اب نخرے کرنے کی باری تمہاری ہے۔" سب ہی بے ساختہ ہنس دیے۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" ماہم جھینپ گئی ساتھ ہی اس نے پاس پڑا کشن اُٹھا کر اسے دے مارا۔

ماہم کے آنے سے جہاں سائرہ بے حد خوش تھیں وہیں پر انہیں زندگی میں بیٹی کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی۔ سائرہ کی بہت خواہش تھی کہ اس کی ایک بیٹی ہوتی مگر خدا نے اسے تین بیٹوں کی ماں بنا دیا تب اس نے قسمت کے لکھے پر صبر شکر کرتے ہوئے اپنے دل میں بیٹی کے لیے موجود جذبات اور محبتوں کا رُخ ماہم کی سمت موڑ دیا۔

اس نے ماہم کی صورت میں بیٹی کو تلاشا۔ یہ الگ بات کہ اس بیٹی کو وہ مہینوں یا سال بعد دیکھ پاتی۔ سائرہ کے شوہر جمال احمد کا بزنس کراچی میں سیٹ تھا۔ جبکہ بھائی اپنی جاب کے سلسلے میں پشاور میں مقیم تھا۔ ان کے درمیان موجود فاصلوں اور دوریوں نے ان کے پیار کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

سائرہ اب یہ سوچ سوچ کر اُداس ہو رہی تھی کہ ماہم کے چلے جانے سے گھر کتنا بے رونق اور سونا سونا ہو جائے گا۔ ماہم کے جانے کا سوچ کر ہی وہ گھبرا جاتیں۔

پھر ماہم اپنے گھر واپس چلی گئی۔ پتا ہی نہیں چلا اور دو مہینے گزر گئے۔ اُسے وداع کرتے وقت سائرہ ایسے رو رہی تھیں جیسے سچ مچ میں وہ اپنی بیٹی کی رخصتی کر رہی ہوں۔ ان دونوں پھوپو بھتیجی کو یوں روتا دیکھ کر عدیم نے انہیں چھیڑا تھا۔

"آپ لوگ تو ایسے رو رہی ہیں جیسے یہ اپنے گھر نہیں گوانتانا موبے جا رہی ہو۔" اس پر سائرہ نے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے بڑی سختی

سے اسے گھورا تھا کیونکہ رونے کی وجہ سے ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

سب ہی اُداس تھے ماہم نے انہیں اپنا عادی بنا دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں اس گھر کا حصہ رہی ہو۔ اس کے بغیر گھر بہت خالی خالی لگنے لگا تھا۔ ثاقب اور تیمور دونوں ماہم کو بوریت سے بچانے کے لیے اپنا فارغ وقت گھر پر ہی گزارتے تھے۔ لڈو کھیلتے تو کبھی کرکٹ اور کبھی دنیا جہان کے قصے سنتے اور سناتے۔ ماہم کے چلے جانے سے ان کی پرانی روٹین پھر سے شروع ہو گئی۔ کالج سے آتے ہی یا تو کمپیوٹر کے آگے بیٹھ جاتے یا پھر دوستوں کے ساتھ باہر نکل جاتے۔ عدیم اور جمال صاحب وہ تو اپنے بزنس میں ہی اس قدر مصروف تھے کہ گھر کے لیے ان کے پاس بہت کم ہی وقت بچتا تھا۔

شب و روز بہت پھیکے پھیکے گزر رہے تھے۔ سارا دن سائرہ گھر میں اکیلی ہوتیں۔ خالی گھر انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ ایسے میں انہیں ماہم کی یاد ستانے لگتی اس کی باتیں ان کے کانوں میں گونجتیں۔

اس روز کھانا کھاتے ہوئے ثاقب کہنے لگا۔

''میں ماہم آپی کو بہت مس کر رہا ہوں۔''

''ہاں ہم تو جیسے انہیں بھول گئے ہیں۔'' تیمور نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''واقعی مجھے خود بھی ماہم کی بہت یاد آتی ہے۔'' سائرہ نے اُداسی سے کہا۔

''ماہم کی یا پھر اُس کے کام کی؟'' جمال صاحب مسکرائے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ماہم سائرہ کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

''میں اتنی خود غرض نہیں ہوں۔ مجھے ماہم سے محبت ہے اسی لیے مجھے اس کی یاد آ رہی ہے اور یہ اس کا پیار ہی تھا جو اس نے مجھے میرے ہی گھر میں مہمانوں کی طرح بٹھائے رکھا ورنہ تمہاری وہ چہیتی بھانجیاں انہیں ذرا توفیق نہیں ہوتی کہ بوڑھی ممانی جو اکیلے ہی ہماری خاطر داریوں میں لگی ہوئی ہیں اس کی کچھ مدد ہی کر دیں۔ آتے ہی ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی ہیں جیسے زندگی بھر کبھی ٹی وی دیکھا نہ ہو...... ندیدی کہیں کی۔'' نجانے کیوں جمال صاحب کی بات سن کر انہیں غصہ آ گیا اور وہ بولی چلی گئیں۔

''چلو اس بہانے ہی سہی، تم نے اپنے بوڑھا ہونے کا اعتراف تو کیا۔'' جمال صاحب شرارت سے مسکرائے۔

''یہ تو میں نے بات برائے بات کہا ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' سائرہ نے فوراً ہی تردید کی۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی عمر کے بارے میں کانشس تھی۔

''اب میں سوچ رہی ہوں کہ میں ماہم کو چند دن اور روک لیتی۔'' سائرہ نے کہا۔

''تم اسے کتنا بھی روکتی آخر کار اسے گھر جانا ہی تھا۔'' جمال صاحب بولے۔

''کتنا اچھا ہوتا اگر آپی ہمیشہ یہیں پر رہتیں۔'' ثاقب نے اُداس سے لہجے میں کہا۔

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔'' سائرہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ بہت دنوں سے دل میں دبی ہوئی بات بالآخر زبان پر آ گئی۔ جمال صاحب پل بھر میں سمجھ گئے کہ سائرہ کا اشارہ کس جانب ہے۔

''وہ کیسے ممی؟'' ثاقب بہت ہی اشتیاق اور بھولپن سے بولا۔ تیمور بھی کھانے سے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے ماں کی جانب دیکھنے لگا۔

''عدیم اور ماہم کی شادی کرا کے......'' سائرہ نے کہا تو ثاقب اور تیمور اچھل پڑے۔

''واؤ مّمی......! کیا آئیڈیا ہے۔'' تیمور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ خیال آپ کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آیا۔'' وہ دونوں اس نئے رشتے کا سن کر بہت پُرجوش ہوگئے تھے۔ جمال صاحب نے بھی رضا مندی دے دی۔ سائرہ کی خوشی اس وقت قابل دید تھی۔ اُن کی ہمیشہ سے یہی خواہش تھی مگر ساتھ میں یہ ڈر تھا کہ جمال اس بارے میں کیا کہیں گے۔ اب شوہر کی جانب سے گرین سگنل ملتے ہی وہ کہنے لگی۔

''میں کل ہی بھائی جان اور بھابی سے بات کرتی ہوں۔''

''میرے خیال سے ان لوگوں سے بات کرنے سے پہلے تم عدیم سے پوچھ لو تو زیادہ بہتر رہے گا۔'' جمال صاحب نے کہا۔ عدیم اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ وہ کسی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا۔

''عدیم کو بھلا کیا اعتراض ہونے لگا۔'' سائرہ کے لہجے میں خیرانگی در آئی۔

''اعتراض کی تو بظاہر کوئی بات نہیں۔ لیکن پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہے۔'' سائرہ نے عجیب نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''ٹھیک ہے، وہ آئے تو میں اس سے پوچھتی ہوں۔''

☆......☆......☆

''مّمی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' سائرہ کی بات سن کر عدیم کو جیسے کرنٹ لگ گیا تھا۔ وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ آتے ہی سائرہ نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

''کیوں کیا خرابی ہے ماہم میں؟'' عدیم کے اس طرح ری ایکٹ کرنے پر وہ ناگواری سے بولیں۔

''ماہم میں کوئی خرابی نہیں، لیکن میں نے کبھی ماہم کے لیے ایسا نہیں سوچا بلکہ میں نے ہمیشہ اُسے اپنی بہن مانا ہے۔'' ماں کی بات سُن کر وہ پریشان ہوگیا تھا۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئے وہ تمہاری بہن نہیں کزن ہے۔ اکثر گھروں میں کزنز بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں مگر اس سے وہ بہن بھائی نہیں بن جاتے۔'' سائرہ کو غصہ آگیا۔

''میرے اور بھی کزنز ہیں لیکن جو احساسات میرے دل میں ماہم کے لیے ہیں۔ وہ کسی اور کے لیے نہیں۔ بچپن سے میرے ذہن نے جو خاکہ بہن کا بنایا ہے ماہم اس پر پورا اترتی آئی ہے۔ میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں بالکل اسی طرح جیسے ایک بھائی اپنی بہن سے کرتا ہے۔'' سائرہ گنگ کھڑی اسے دیکھنے لگیں۔ عدیم یہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح انکار کرسکتا ہے۔

''عدیم! یہ تم کیا بے تکی اور بچکانہ سی بات کررہے ہو۔''

''مّمی! کیا آپ ہمیشہ یہ نہیں کہتی کہ ماہم آپ کی بیٹی ہے۔'' عدیم نے الٹا اس سے سوال کردیا تو پریشان سی کھڑی سائرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر میں جب اسے بہن مانتا ہوں تو یہ میرا بچکانہ پن کیسے ہوگیا۔ مّمی! پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو آپ چاہتی ہیں وہ پاسیبل نہیں، میرا ذہن اسے اس روپ میں کبھی بھی قبول نہیں کرے گا۔'' اس نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

عدیم کا انکار سائرہ کے لیے ایک بہت بڑا

شاک تھا۔ اس نے عدیم کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی پر اس کی الگ ہی سوچ تھی۔ اسے ماہم اس نئے رشتے میں قبول نہیں تھی۔ سائرہ چاہتیں تو اپنی بات زبردستی منوا سکتیں تھیں لیکن وہ اپنی مرضی دوسروں پر مسلط نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس نے ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بچوں کی خوشی کو اہمیت دی تھی جبکہ یہاں تو معاملہ عمر بھر کا تھا۔

کئی دنوں تک وہ سخت اپ سیٹ رہیں۔ ان کی شروع سے خواہش تھی۔ ماہم ان کی بہو بنے مگر جب سے ماہم نے یہاں آ کر اس کے گھر کو بہت احسن طریقے سے سنبھالا تھا تب سے اس نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ ماہم کو ہی بہو بنائے گی۔ ان کی نظر میں عدیم کے لیے ماہم سے بہتر کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ماہم کی ساری خوبیاں ایک طرف کر کے بھی اس کا پلس پوائنٹ یہ تھا۔ وہ ان کی بھتیجی تھی۔ سب سے بے حد پیار کرتی تھی اور مخلص تھی۔ مگر افسوس ان کا یہ ارمان دل میں ہی رہ گیا۔ عدیم سختی سے اپنی بات پر قائم تھا۔

''ممی! آپ جس سے چاہیں میری شادی کر دیں مگر پلیز...... مجھے اس رشتے کے لیے مجبور نہ کریں۔'' سائرہ عدیم کو منا بھی نہیں پائی تھی کہ ماہم کا رشتہ اس کے پاپا نے اپنے دوست کے بیٹے سے کر دیا۔ اور جلد ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ یہ خبر سن کر اس کے اندر چھنا کے سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

''کیا ضرورت تھی بھائی جان کو اتنی جلدی کرنے کی، کیا پتا عدیم مان ہی جاتا۔'' انہوں نے دکھ سے سوچا تھا۔

ماہم جس کی قسمت تھی اُس کے گھر چلی گئی۔ شادی میں شرکت کے لیے سائرہ اور عدیم گئے تھے۔ اُن کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر بھائی اور بھتیجی کی خوشی کے لیے انہیں جانا ہی پڑا۔ ثاقب اور تیمور کے ایگزام تھے جس کی وجہ سے وہ نہیں جا سکے تھے۔ وہاں جا کر ماہم کی خوشی کو دیکھتے ہوئے اسے قدرے تسلی ہوئی اُس کے دل میں جو کسک تھی وہ کچھ کم ہو گئی تھی۔ وقاص سے مل کر اسے اطمینان ہوا وہ ہر لحاظ سے ماہم کے لیے موزوں تھا۔ ماہم بھی اس رشتے سے خوش نظر آ رہی تھی۔

سائرہ اور عدیم واپس آ چکے تھے وقت اپنے مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ سائرہ ایک بار پھر عدیم کی شادی کے بارے میں سوچنے لگی تھیں۔ وہ اپنی تنہائی سے گھبرا گئی تھیں۔ اُس کے خیال میں بہو کے آنے سے ہی اس گھر کی رونق بڑھ سکتی تھی۔ خود لڑکی دیکھنے کے بجائے اس نے عدیم سے اُس کی پسند پوچھی۔

''ممی! میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ میری پسند وہی ہوگی جیسے آپ منتخب کریں گی۔'' عدیم نے سب کچھ اس پر چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر میری پسند سے شادی کرنا ہی تھی تو اس وقت میری پسند کو جھٹلایا کیوں تھا۔'' سائرہ نے ناگواری سے کہا تھا۔

''ممی! پتا نہیں، آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں۔'' عدیم کے لہجے میں بے بسی در آئی تھی۔

انہیں اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ ماہم اس کی بہو بن نہ سکی اور اب عدیم کے لیے لڑکی ڈھونڈتے ہوئے یہ احساس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اُس کی نظر میں آج کل کی لڑکیاں لاپروا اور غیر ذمہ دار ہوتی ہیں اور پھر ایک دو ملاقاتوں میں کسی لڑکی کے مزاج اور عادت واطوار کے بارے میں جاننا بھی ناممکن سی بات تھی۔

دل میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے لیے وہ مدیحہ کو بہو بنا کر لے آئیں یہ رشتہ ایک جاننے والے کے توسط سے ہوا۔ سائرہ پہلی نظر میں ہی مدیحہ کی من موہنی اور بھولی صورت سے متاثر ہوگئی تھیں۔ یہ اور بات کہ اُس کا دل مکمل طور مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ مدیحہ اس گھر میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی۔ وہ اُس کے توقعات پر پورا اتر سکے گی بھی یا نہیں۔

مدیحہ ایک سمجھدار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ چند ہی دنوں میں اس نے سب گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ وہ بڑی بہو ہونے کے ناطے اپنی ذمہ داریاں بہت خوبی کے ساتھ ادا کر رہی تھی۔ مدیحہ کے رویے کو دیکھتے ہوئے سائرہ کو اب مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ غیر ارادری طور پر ماہم اور مدیحہ کا موازنہ کرتی رہتی تھی۔ اس کے خیال میں مدیحہ کچھ بھی کرلے ماہم کی طرح نہیں ہو سکتی۔

اسی سوچ کے ساتھ وہ مدیحہ کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں پکڑ کر اس پر تنقید کرتے ہوئے ماہم کی مثالیں دیا کرتیں۔ ایسے میں مدیحہ اُس کی ہر تنقید کو خاموشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ سنتی۔

سائرہ یہ بھول گئی تھی کہ شوقیہ چند دنوں کے لیے کوئی کام کرنا اور بات ہے جبکہ حقیقی ذمہ داریاں اٹھانا الگ بات، ماہم بھتیجی تھی اس لیے اس کی ہر ادا پیاری تھی۔ وہ گھر کے کام کرتی یا پھر ثاقب اور تیمور کے ساتھ ہلا گلا مچائے رکھتی۔ دونوں صورتوں میں سائرہ خوش تھیں لیکن...... اگر اب مدیحہ دیوروں کے ساتھ کرکٹ کھیلتی۔ شور شرابہ کرتی تو شاید سائرہ کو یہ سب برا ہی لگتا۔ بھتیجی اور بہو میں جو فرق ہے سائرہ اسے نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔

عدیم کی بیٹی ہوئی تو سائرہ کو لگا اس کی تمنا پوری ہوگئی۔ سب گھر والوں کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔ خوب خوشیاں منائیں گئیں۔ ثمن کے آجانے سے مدیحہ کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں لیکن اس کی پوری کی کوشش ہوتی تھی کہ سائرہ کو کوئی شکایت نہ ہو۔

انہیں دنوں ماہم کے شوہر وقاص کا تبادلہ کراچی میں ہوگیا۔ وہ لوگ یہیں شفٹ ہوگئے۔

اس روز سائرہ اور مدیحہ کو ماہم کے گھر جانا تھا۔ سائرہ صبح سے ہی تیار ہو کر بیٹھ گئی۔

ماہم سے عرصے بعد ملنے کی خوشی اس سے سنبھالے نہیں جا رہی تھی۔ ماہم کی شادی کے بعد ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور اب ماہم ایک بیٹے کی ماں تھی۔

''ممی! آپ عدیم کے ساتھ چلی جائیں۔ ثمن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اس لیے میں نہیں جاسکوں گی۔'' سائرہ مدیحہ کے تیار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب مدیحہ نے آ کر بتایا۔

''کیوں کیا ہوا ثمن کو؟'' سائرہ ایک دم سے پریشان ہوگئیں۔

''معمولی سا ٹمپریچر ہے مگر بعد میں طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے اس وجہ سے میں نے سوچا۔ میں گھر میں رک جاتی ہوں۔'' اسے یوں پریشان ہوتا دیکھ کر مدیحہ نے جلدی سے کہا۔

''میرے خیال سے میں پھر کبھی چلی جاؤں گی۔'' ثمن کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہوگئی تھی۔

''نہیں ممی! فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ چلی جائیں۔ ماہم انتظار کر رہی ہوگی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر......'' وہ تذبذب میں

پڑ گئی۔

''میں نے کہا نا...... ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اور پھر میں ہوں نا'' مدیحہ نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ مدیحہ کا خود بھی دل چاہ رہا تھا ماہم سے ملنے کو اس نے ماہم کا اتنا ذکر سنا تھا کہ اسے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ثمن کی طبیعت کی ناسازی کی بنا پر اس کا جانا ملتوی ہو گیا۔

اس وقت سائرہ ماہم کے گھر میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے گود میں ماہم کا گول مٹول سا بیٹا تھا۔ عدیم کچھ دیر بیٹھ کر جا چکا تھا۔ وقاص بھی آفس گیا ہوا تھا۔

''ماہم! تم خوش تو ہو نا'' سائرہ نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں پھوپو! میں بہت خوش ہوں۔ وقاص میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' ماہم نے مان بھرے لہجے میں کہا۔

''تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو؟'' اس نے استفسار کیا۔ وہ جب سے آئی تھیں ماہم کے حلیے کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھیں۔ اُلجھے بے ترتیب سے بال، ملگجا سا لباس اور اس پر بے ڈول ہوتا جسم، دیکھنے میں وہ کہیں سے بھی پرانی ماہم نہیں لگ رہی تھی۔

بس بات کرنے کا انداز اب بھی وہی تھا بلکہ بولنے کی اسپیڈ بہت حد تک بڑھ گئی تھی۔

پہلے تو اس کی حالت دیکھ کر اسے شک ہوا کہیں وقاص اور ماہم میں جھگڑا نہ ہوا ہو لیکن ماہم کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے ایسا کچھ نہیں لگ رہا تھا۔

''ماہم! لگتا ہے تم اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتی۔''

''وقاص بھی یہی کہتے ہیں مگر آپ خود سوچیں، میں گھر میں کسی ماڈل کی طرح بن ٹھن کے تو نہیں رہ سکتی...... کتنے کام ہوتے ہیں گھر کے فرصت کہاں ملتی ہے۔'' بہت ہی لاپروا انداز میں اس نے کہا۔

''پھر بھی بیٹا! انسان کو خود اپنے لیے وقت نکالنا چاہیے۔''

''چھوڑیں پھوپو! مدیحہ کیسی ہے اس کے بارے میں بتائیں۔ مجھے بہت اشتیاق تھا اس سے ملنے کا۔'' اس نے بات بدل دی۔

سائرہ مسکرائی اور اسے مدیحہ کے بارے میں بتانے لگیں۔ اسی اثناء میں ماہم کا بیٹا سرمد رونے لگا۔

''لگتا ہے اسے بھوک لگی ہے۔ پھوپو! آپ اسے تھوڑی دیر کے لیے سنبھالیں میں سیریلیک بنا کے لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کچن کی جانب چل دی۔

سرمد چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سائرہ اسے اٹھائے ہوئے ماہم کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئیں۔ وہاں کی حالت دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔

سنک گندے برتنوں سے بھرا پڑا تھا۔ سلپ پر آٹے کے ذرات پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جانب انڈے کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔

''ماہم! یہ برتن رات کے پڑے ہوئے ہیں؟'' سائرہ نے سرمد کو اسے پکڑاتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

''جی پھوپو! رات کو میرے سر میں درد تھا اس وجہ سے میں یہ دھو نہ سکی۔'' کمال بے نیازی سے جواب دیا گیا۔

''رات کو تمہارے سر میں درد تھا تو صبح سے تم کیا کر رہی تھی۔'' یہ سائرہ نے محض دل میں کہا۔

ڈرائنگ روم میں بھی بہت بے ترتیبی سی تھی مگر کچن کی حالت زیادہ ہی خراب تھی۔ سائرہ بہت ہی صفائی پسند طبیعت کی مالک تھیں۔ گندگی ان سے بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے یہ سب دیکھ کرانہیں بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔

''ماہم! تم سرمد کو سیریلیک کھلاؤ تب تک میں یہ برتن دھولیتی ہوں۔'' ان سے رہا نہ گیا۔

''ارے پھوپو! یہ میں بعد میں دھولوں گی۔'' فی الحال بھی اس کا برتنوں کو دھونے کا کوئی ارادہ نظرنہیں آرہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہم باتیں بھی کریں گے اور ساتھ میں کام بھی ہوجائے گا۔'' سرمد کو سیریلیک کھلانے کے بعد مارے شرم کے وہ بھی کچن کی صفائی میں ان کا ساتھ دینے لگی۔

کچھ ہی دیر میں وہاں کا نقشہ بدل گیا۔ ماہم سائرہ کو لے کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ وہاں کی حالت بھی باقی گھر سے مختلف نہیں تھی۔ گیلا تولیہ ابھی تک بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے کے قریب تھا۔ مگر ماہم کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ سائرہ سے اس بار بھی صبر نہ ہوا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

''وقاص لنچ گھر پر کرتا ہے؟''

''نہیں پھوپو! لنچ تو وہ آفس میں ہی کرتے ہیں۔ لیکن آج میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ کھانا باہر سے ہی لے آئیں۔

میری پھوپو آرہی ہیں میں ان کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔'' ماہم ان سے پیار جتاتے ہوئے کہنے لگی۔

''اچھا...... میرا تو خیال تھا آج میں اپنی بھتیجی کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گی۔''

''چلیں پھر کبھی سہی...... ویسے بھی میرے ہاتھ میں ذائقہ بالکل بھی نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ مجھے اس کام سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں۔ وقاص اکثر باہر سے تیار کھانا لے آتے ہیں۔'' ماہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن پہلے تو تمہیں بہت شوق تھا کوکنگ کا؟'' سائرہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

''وہ تو چند دنوں کا شوق تھا جس سے میں جلد ہی بور ہوگئی تھی۔'' ماہم سرمد کا ڈائپر بدلتے ہوئے بولی۔ ساتھ میں اس نے گندہ ڈائپر بیڈ کے پاس نیچے کارپٹ پر رکھ دیا۔ اپنی ہر بات سے ماہم اسے حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھے جارہی تھی۔

''ماہم! گندہ ڈائپر رکھنے کی یہ جگہ تو نہیں تھی۔''

''اس وقت میرا اٹھنے کا موڈ نہیں ہے۔ جب کسی کام سے اٹھوں گی تو اسے بھی دیکھ لوں گی۔'' بہت ہی لاپرواانداز میں جواب ملا۔ سائرہ یہ سوچ کر رہ گئی۔

''کم از کم ہاتھ تو دھولو۔'' سائرہ کو اُس کے موٹاپے کی طرف مائل جسم کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

پورا دن ماہم کے ساتھ گزار کر جب شام کو وہ واپس جارہی تھی تو ایک ہی بات اُن کے ذہن میں تھی۔

''شکر ہے آج مدیحہ میرے ساتھ نہ آسکی ورنہ وہ دل میں کیا سوچتی۔ یہ وہ ماہم ہے جس کی میں اسے مثالیں دیا کرتی تھی۔''

ایک بار پھر وہ ماہم اور مدیحہ میں موازنہ کررہی تھی مگر اب سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ ماہم کو بہو نہ بنانے کی پھانس جواب تک دل میں چبھی ہوئی تھی نکل گئی تھی۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

حبیبہ عمیر

پلکوں پر ٹھہرے خواب

خوبصورت جذبوں کی عکاسی کرتی

بے مثال تحریر جو اپنے پڑھنے والوں پر سحر طاری کر دے قسط 4

''ولی آج آپ مجھے امی کے ہاں چھوڑ آیئے گا اور واپسی پر لیتے جایئے گا۔'' بھلا وہ اتنی بڑی خبر کیسے نہ اپنی ماں، بہن کو بتاتی۔

''جی بیگم صاحب جیسا آپ کہیں۔'' وہ اس کی ٹھوڑی کو چھو کر بولا۔ جواباً ایک بھرپور مسکراہٹ سے شائلہ نے نوازا۔

''اماں دیکھو شائلہ آئی ہے۔'' نائلہ نے جیسے ہی اسے دیکھا ویسے ہی ہانک لگائی۔

''ارے تُو اتنی صبح خیریت ہے ناں۔'' ذکیہ بیگم اُسے اتنی صبح سامنے دیکھ کر پریشان ہوئیں۔

''ہاں اماں خیریت ہے بس تم دونوں ادھر آؤ ایک بہت بڑی خبر دینی ہے۔'' وہ تخت پر بیٹھ کر بولی۔

''کیا ہوا خیریت ہے ناں کہیں عالی کی بات تو پکی نہیں ہوگئی۔'' نائلہ کو اپنی فکر ہوئی۔

''ارے نہیں اس سے بہت بڑی خبر ہے۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

''اماں وہ ہے ناں ودعیہ۔''

''آہاں اس منحوس نے کیا کیا۔'' ذکیہ بیگم نے بات کاٹ دی۔

''اماں پوری بات تو سن لو۔'' شائلہ چڑ گئی۔

''اماں بولنے دو اس کو، پہلے ہی اپنی ہانکنے لگتی ہو۔'' نائلہ بدمزہ ہوئی۔

''اماں اس چوہیا کے دادا اس کے نام زمین لگا گیا ہے، جس کی قیمت لاکھوں کروڑوں کی ہے جس کی وہ اکیلی وارث ہے۔'' اس نے جیسے دھما کہ کیا۔

''کیا!! وہ چوہیا لاکھوں کی وارث!!'' ذکیہ بیگم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''تجھے کس نے بتایا۔'' نائلہ بے چین ہوگئی۔

''کل وکیل آیا تھا، خالو سے بڑی تفصیل سے بات کی، اس نے کہا ہے کہ ودعیہ کی شادی کے بعد وہ زمین کا مالک اس کا شوہر ہوسکتا ہے۔'' اس نے مطلب کی بات بتائی۔

''ہے کہیں آپا کو پتا ہے اس کا۔'' انہیں فکر ہوئی۔

''جہاں تک میرا خیال ہے ناں تو خالہ کو یا کسی کو کچھ نہیں پتا سوائے خالو کے۔''

''کیونکہ کسی کے منہ سے ذکر نہیں سنا میں نے۔'' شائلہ سوچتے ہوئے بولی۔

''اگر خالہ کو پتا چلا ناں تو یقیناً وہ عالی کا رشتہ طے کر دیں گی۔'' نائلہ کو نئی پریشانی لگ گئی۔

''ارے نہیں کرے گی، میں نے اس کے دل میں ودعیہ کے منحوس ہونے کا ڈر اتنا بٹھا دیا ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے وقار صاحب کا پیار دیکھا تھا بچپن ہی سے اس کے لیے، اس لیے آپا کو باتیں سنا سنا کر اس کے لیے نفرت پیدا کر دی ہے ورنہ آج وہ ولی کی بیوی ہوتی۔'' انہوں نے فخر سے کارنامہ بتایا۔

''ارے رہنے دو اماں تم! جب پیسہ دکھتا ہے ناں تو بڑے بڑے سب بھول جاتے ہیں۔'' نائلہ نے بات کاٹی۔

''صحیح کہہ رہی ہے یہ اماں!'' شائلہ نے ساتھ دیا۔

''تو پھر؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اماں میرا خیال ہے تم اس کشور رضوان کا رشتہ ڈال دو۔ خالہ کو ایسے جتاؤ جیسے اس چوہیا پر احسان کر رہی ہو اپنے ہونہار بیٹے کے لیے مانگ کر، اس میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔''

وہ کیسے؟ ذکیہ بیگم بولیں۔

''دیکھو اول تو تمہارے بیٹے کو کوئی اپنی بیٹی دے گا نہیں۔'' اس نے سچائی بیان کی جس سے ان کا منہ کڑوا ہو گیا۔

''کرتا کراتا ہے نہیں یہ کچھ سوائے لڑکیاں تاڑنے کے۔ اس کا رشتہ بھی ہو جائے گا، پیسے کے ساتھ ساتھ زر خرید غلام ٹائپ نوکرانی بھی آ جائے گی جو نہ صرف گونگی ہو گی بلکہ بہری بھی ہو جائے گی اور تیسرا نائلہ کا رستہ بھی بالکل صاف ہو جائے گا۔''

اس نے رات بھر سوچ سوچ کر جو پلاننگ کی تھی اسے دونوں کے گوش گزار کیا۔

''واہ شائلہ کیا دماغ ہے تیرا۔ تو نے ثابت کر دیا کہ تو میری بیٹی ہے۔

ذکیہ بیگم نے فخر سے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

''ہاں بھئی بڑا زبردست پلان ہے آپا کا۔'' نائلہ بھی فخر سے بولی۔

''اب بس ذرا دیر نہ کرنا کل ہی آ جانا ٹھیک ہے۔'' اس نے تنبیہ کی۔

تُو فکر ہی نہ کر ہم آئے کہ آئے۔'' ذکیہ بیگم نے ہاتھ نچا کر کہا۔

☆......☆......☆

ارے ودعیہ تمہارا رزلٹ کب ہے؟ عالی نے ناشتے کی میز پر پوچھا۔ انہیں کب سے دلچسپی ہو گئی میرے رزلٹ میں۔ ودعیہ نے چڑ کر سوچا۔ ناشتے کی میز پر بس وہ دونوں تھے۔ وقار صاحب اور ولی جا چکے تھے۔ شائلہ بھی ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور رقیہ بیگم آرام کر رہی تھیں۔

کچھ پوچھا ہے میں نے؟ وہ اس کی خاموشی سے جھنجلا گیا۔

15 کو ہے؟ وہ ہنوز پلیٹ کو گھور رہی تھی۔ جبکہ وہ اسے گھورنے میں مصروف تھا۔ وہ کام کر کے فارغ ہو کر ناشتہ کر رہی تھی۔ چٹیا سے نکلتے بال چہرے پر آ گئے۔ پسینے کی بوندیں گلے اور ماتھے پر رقص کر رہی تھیں جبکہ وہ پلیٹ کو گھور رہی تھی۔

آپ کو پتا ہے بی بی آج کیا تاریخ ہے وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

اس نے ایسا دیکھا جیسے کہہ رہی ہو تمہیں پتا ہے تو بتا دو مجھے تو نہیں پتا۔ آج 16 تاریخ ہے تم کتنی بے خبر ہستی ہو ودعیہ خالد۔ اسے نا چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔ بولا کوئی بندہ اپنے رزلٹ سے اس قدر بے خبر کیسے ہو سکتا ہے جبکہ رزلٹ بھی معمولی نہ ہو بلکہ B.A کا ہو لوگوں کی رات کی نیندیں حرام ہوئی ہوتی ہیں اور یہ ایک مہارانی ہیں جنہیں سرے سے دلچسپی ہی نہیں۔ وہ کہہ کر رُکا نہیں بلکہ اپنی ٹوپی اٹھا کر ہنستا ہوا نکل گیا۔

عالی بھائی کو آخر کیا ہوتا جا رہا ہے کہیں تو مہینوں نہیں مسکراتے تھے اور آج کل بلاوجہ ہی مسکرائے جا رہے ہیں وہ سوچ رہی تھی اور ہاں میں اتنی بے خبر کب سے ہو گئی کہ رزلٹ کی ہوش نہیں رہی۔ پہلے رزلٹ پتا کر لیں وہ دوڑی۔

☆......☆......☆

''ارے اماں تم کیسی ہو۔'' شمائلہ ذکیہ بیگم سے ایسی ملی جیسے اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی ہو کہ انہوں نے آنا ہے۔

ارے ذکیہ آ نئی آؤ۔ رقیہ بیگم بھی شمائلہ کی آواز سن کر کمرے سے نکل آئیں۔ دونوں بہنیں ایسے ملیں جیسے صدیوں بعد ملیں ہوں۔

جبکہ ودعیہ کچن میں تھی اس نے بے دلی سے کیبنیٹ سے گلاس نکالے اور مشروب ڈالنا شروع کیا۔

وہ ٹرے لے کر نکل ہی رہی تھی کہ ماموں آ گئے اور ان کے ہاتھ میں پھلوں والے شاپر تھے۔ بیٹا انہیں سنبھال لو۔ وہ کاؤنٹر پر رکھ کر لاؤنج میں آئے جہاں مہمان موجود تھے۔

السلام وعلیکم بھائی صاحب، ذکیہ بیگم بڑی ادب سے بولیں۔

وعلیکم السلام وقار صاحب نے جواب بھی فراخ دلی سے دیا اور ادھر ہی بیٹھ گئے۔ ''بیٹا ولی نہیں آیا کیا؟'' انہوں نے شمائلہ سے پوچھا۔

''نہیں، کہہ رہے تھے کہ لیٹ ہو جاؤں گا۔''

ودعیہ مشروبات لے کر آ گئی۔ نائلہ، ذکیہ بیگم اور رضوان آئے تھے۔

آج رضوان کا روایتی حلیہ نہیں تھا بلکہ بڑے ادب سے براجمان تھا۔ ودعیہ جانے لگی تو ذکیہ بیگم نے روک لیا۔

''ارے بیٹا ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔''

ودعیہ کو لگا شاید کسی اور کو بلا رہی ہیں۔ ''جی میں؟'' اس نے حیرانی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

ہاں ہاں بیٹا تم ہی ان کے لہجے میں شیرینی ہی شیرینی تھی اسے لگا کہ کہیں اسے شوگر ہی نہ ہو جائے وہ بادل نخواستہ بیٹھ گئی۔ جو اس کو اپنے پاس بیٹھا لیا اور اب پیار بھی کر رہی ہے۔

ابھی ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ عالی بھی آ گیا۔

ارے واہ خالہ آئیں ہیں۔ وہ سلام کے بعد بولا۔ جبکہ ودعیہ کو یوں خالہ کے پہلو میں دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ اسے نہایت ناپسند کرتی ہیں جبکہ دوسرا جھٹکا اسے رضوان کو دیکھ کر لگا جو نیک بچہ بنا سر جھکا کر خلاف معمول بیٹھا تھا۔ وہ بھی خالہ کے سامنے پڑے فلور کشن پر بیٹھ گیا۔

''میں سب کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' شمائلہ کہہ کر اٹھ گئی۔

بھابی میں بنا دیتی ہوں۔ ودعیہ کو وہاں سے اٹھنے کا بہانہ ملا اسے عجیب کوفت ہو رہی تھی خالہ اور نائلہ کے درمیان بیٹھ کر خاص کر نائلہ کے بدن سے اٹھتے عالی سستی پرفیوم کی خوشبو سے۔

ارے نہیں ودعیہ رہنے دو بھئی میں بنا لاتی

ہوں۔ وہ مسکرا کر بولی۔

ورطہ حیرت یہ ہو کیا رہا ہے ودعیہ کو الگ جھٹکا لگا جبکہ عالی بھی حیران و پریشان تھا۔

بھائی صاحب آج میں اپ کے در پر سوالی بن کر آئی ہوں ذکیہ بیگم نے تمہید باندھنا شروع کی۔

میں کچھ سمجھا نہیں وقار صاحب کچھ تعجب سے بولے۔

بھائی صاحب چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے میں دراصل اپنے رضوان کے لیے ودعیہ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔ آخر بلی تو کرے سے باہر آ گئی تھی۔

اوہ تو یہ معاملہ ہے عالی نے سوچا جبکہ اس کو ہزار والٹ کا کرنٹ لگا۔ وہ اچھل پڑی۔ رقیہ بیگم کا منہ کھلے کا کھلا تھا جبکہ وقار صاحب کا رنگ متغیر ہو گیا۔

بھائی صاحب، رضوان آپ کے سامنے کا بچہ ہے، میرا اکلوتا بیٹا ہے آپ کی ودعیہ راج کرے گی راج انہوں نے شفقت سے ودعیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا جبکہ نظریں رضوان پر ٹکیں تھیں جس کا سر ادب سے جھکا گھٹنے چھو رہا تھا اتنی فرمانبرداری پر عالی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جسے اب اس نے بڑی مشکل سے روکا۔

آپ کچھ بولیں ناں بھائی صاحب، ذکیہ بیگم نے بڑے ادب سے کہا۔

''دیکھیے بہن میں آپ کو کوئی جھوٹا دلاسہ نہیں دوں گا۔ یہ جوڑ کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔'' (ودعیہ کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ریس لگی ہو) ودعیہ نے ماشاء اللہ گریجویشن کیا ہے اور آپ کا بیٹا معاف کیجیے گا میٹرک پاس بھی نہیں ہے کمائی نام کو نہیں ہے ایسے میں اس کا رشتہ کیسے کر دوں۔ ویسے مجھے ابھی ودعیہ کی دو وقت کی روٹی بھاری نہیں پڑی ہے۔ وہ ضبط سے بول رہے تھے جبکہ ذکیہ بیگم کا منہ کھل گیا انہیں وقار صاحب سے اتنی سفاکی کی ہزگر امید نہیں تھی۔

ہم سب آپ کے ہونہار سپوت (انہوں نے زور دیا) سے خوب واقف ہیں (رضوان نے بھی پہلو بدلا) اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں وٹے سٹے کا قائل نہیں ہوں تو آپ میری طرف سے معذرت سمجھیں۔

وقار صاحب نے ایک ہی جست میں بازی لپیٹ دی۔ تینوں بلکہ پانچوں کا منہ کھلا رہ گیا۔ نائلہ، ذکیہ، رقیہ، شائلہ اور رضوان۔ جبکہ ودعیہ نے سکھ کا سانس لیا۔ عالی کو عین اسی جواب کی امید تھی لہٰذا وہ پرسکون تھا۔ اچانک اس کی نظر ودعیہ کے پرسکون ہوتے چہرے پر پڑی تو وہ لاشعوری طور پر مسکرا دیا۔

ماحول ایک دم تناؤ بھرا ہو گیا جسے عالی نے توڑا۔

ودعیہ تم نے رزلٹ دیکھ لیا وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

وہ ایک دم چونکی، آ آہاں دیکھ لیا۔

''پاس ہو گئیں تم کتنے نمبر آئیں ہیں۔''

497 نمبر آئیں ہیں وہ بولی۔

ارے واہ بڑے اچھے نمبر ہیں۔ B.A میں بھابھی اسی بات پر سب کا منہ میٹھا کرائیں ہماری ودعیہ نے B.A کر لیا ہے اس نے 'ہماری' پر زور دیا۔

تمہارا رزلٹ آ بھی گیا۔ وقار صاحب بھی بالکل نارمل ہو گئے۔ جی ماموں۔ وہ مختصر بولی۔

ابو کل کا آیا ہوا ہے مگر اس بے خبری کو ہوش نہیں تھی۔ عالی گلاب جامن جو ذکیہ بیگم اس یقین

سے لائیں تھیں کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے کو کھاتے ہوئے بولا۔

نائلہ کو پہلے کا غم بھول کر یہ فکر لگ گئی تھی کہ کہیں اس کا بھی رزلٹ نہ پوچھ لیں کیونکہ وہ پیپرز میں فیل تھی۔

ارے ہاں نائلہ نے بھی تو پیپرز دیے تھے۔ عالی ایک دم یاد آنے پر بولا۔ نائلہ کو اچھو لگ گیا۔ ارے جاؤ جلدی کچن میں پانی پیو۔ شائلہ نے موقع غنیمت جانا اور اسے بھگا دیا۔ جبکہ عالی سب سمجھ گیا اڑ گئی ہو گی بیچاری۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ جبکہ ذکیہ بیگم اور رضوان کو نا چاہتے ہوئے بھی گلاب جامن سے منہ میٹھا کرنا پڑا آخر کو ودعیہ پاس ہوئی تھی۔

ودعیہ نے کمرے میں آ کر شکرانے کے نفل پڑھے کہ معاملہ ایک دم ہی نمٹ گیا اگر ماموں ہاں کر دیتے تو...... وہ اس کے آگے سوچ ہی نہ پائی اسے اپنے پاس ہونے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنی ماموں کے انکار کرنے کی۔

☆......☆......☆

اماں یہ تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ دو دنوں بعد شائلہ پھر ادھر موجود تھی۔

''تیرے سسر نے تو حد کر دی انکار ہی کر دیا سیدھا۔'' رضوان بھی بولا۔

''یہ سب بحث چھوڑو اور سوچو کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ آسامی ہاتھ سے نکل جائے۔'' ذکیہ بیگم نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

''اماں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو مجھے تو خطرہ محسوس ہو رہا ہے اس ودعیہ سے۔'' نائلہ بے چینی سے بولی۔

وہ چاروں گٹھ جوڑے آگئے کا لائحہ عمل تیار کر رہے تھے صاف انکار نے ان پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔

اماں میں نے سوچ لیا ہے کہ کرنا کیا ہے اس بار ایسی چال چلوں گی کہ میرا سسر کیا ودعیہ خود انکار نہیں کر سکے گی۔ رضوان بس تم اپنے جیسے ایک دو لڑکوں کو تیار رکھنا۔'' شائلہ کی آنکھوں میں شیطانیت ناچ رہی تھی۔

انکار کے بعد شائلہ کا رویہ خلاف معمول ودعیہ کے ساتھ بہتر ہو گیا تھا۔

وہ اسے آرام کرنے کا کہہ کر خود کام کرتی اور ودعیہ اس مہربانی کو نا چاہتے ہوئے بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ البتہ نائلہ کا آنا جانا بڑھ گیا تھا وہ ہر دوسرے دن آ موجود ہوتی خاص کر دوپہر کو آتی اور عالی کے آنے تک ادھر ہی رہتی۔

مگر عالی کی نظر کرم کے لیے ابھی تک وہ جدوجہد کر رہی تھی۔ جس کے لیے وہ نت نئے بے ہودہ فیشن والے کپڑے خوب سارا میک اپ اور سستی پرفیوم کی بوتلیں خود پر انڈیل کر آتی تھی۔ اپنی طرف سے وہ ہر اس ہتھیار سے لیس ہو کر آتی جو جنس مخالف کو کھینچ سکے مگر عالی ایک فتح نہ ہونے والی چٹان بنتا جا رہا تھا وہ اسے ذرا لفٹ نہیں کراتا تھا۔

آج بھی نائلہ آئی ہوئی تھی۔ ریڈ کلر کے فٹنگ والے سوٹ میں۔

ریڈ کلر کی لپ اسٹک لگائے ریڈ کلر کی نیل پولش سے اپنے لمبے ناخن سجائے وہ اپنی طرف سے میڈورانا لگنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

آج عالی کی طبیعت صبح سے کچھ ڈل تھی اس لیے وہ گھر پر ہی تھا۔ شائلہ کے بلاوے پر وہ اڑی چلی۔

عالی کا ارادہ اپنے کمرے کی تفصیلی صفائی کروانے کا تھا۔ جس کے لیے اس نے ودعیہ کو

حاضر کرلیا تھا۔
"جی بھائی آپ نے بلایا ہے۔" وہ اپنے کمرے سے اس کی آواز پر نیچے سے دوڑتی ہوئی آئی۔
"ہاں! تم فارغ ہو......؟" وہ مصروف انداز میں کتابوں کی جانچ پھٹک کررہا تھا۔
جی بھائی وہ بے دلی سے بولی۔ ابھی اسے فارغ ہوئے تمام کاموں سے بمشکل پانچ منٹ ہی تو ہوئے تھے۔
ہوں ٹھیک ہے تم میرے کمرے کی تفصیل سے صفائی کردو۔ میں جو کہوں وہ اٹھا کر اسٹور میں رکھتی جاؤ ٹھیک ہے۔ وہ اس کی طرف مڑا۔
"جی ٹھیک ہے۔" اس نے منہ بگاڑا۔
عالی اس کے انداز واطوار کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا صاف ظاہر تھا کہ اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ کام ایسے کررہی تھی جیسے سر پر کوئی ڈنڈا لے کر کھڑا ہو اور وہ ڈنڈا امامی کے سوا کس کا ہوسکتا تھا۔
آج کل عالی نہ جانے کیوں شاید لاشعوری طور پر ودعیہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ کس بات پر خوش ہوتی ہے کس پر دکھی، اور کس پر ناراض اب بھی وہ کتابوں کو ٹھپ ٹھپ میز پر پٹخ رہی تھی انگ انگ بے زاری ظاہر کررہا تھا مگر ہونٹ ہنوز جڑے تھے۔
گھنٹا لگا کر دونوں نے فالتو چیزیں نکالیں جو اب اسٹور یعنی ودعیہ کے کمرے کی زینت بننے والی تھیں۔ آگے ہی سانس لینے میں مشکل ہوتی ہے وہاں یہ کہ اور سامان۔" وہ بڑبڑائی جو کہ عالی نے سن لیا۔
"وہاں نہ رکھو تم یہ سامان کل کباڑیا آئے تو دے دینا اسے بے کار ہے میرے لیے یہ سارا سامان۔" وہ لے جارہی تھی کہ وہ بول پڑا۔
جی! وہ کہہ کر نکل گئی۔ جبکہ عالی نے سر جھٹکا۔
"کیا کررہے ہو جناب؟" نائلہ ایک ادا سے داخل ہوئی۔
"لو آگئی مصیبت۔" وہ بڑبڑایا۔
تم نے کچھ کہا۔ نائلہ قریب آئی۔
"آہاں اچھی لگ رہی ہو۔" اس کے منہ سے پھسلا جس پر خود ہی پچھتایا۔
سچی! آج میں بڑے دل سے صرف تمہارے لیے تیار ہوئی ہوں۔ وہ مزید قریب ہوئی۔ جبکہ عالی دو قدم پیچھے سرکا۔
"تم مجھ سے دور کیوں بھاگتے ہو عالی۔" وہ ادائے دلبرانہ سے بولی۔
تمہیں پتا ہے نا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں اور تمہارے بغیر رہ نہیں سکتی۔" وہ اس کے گلے میں انی بانہوں کا ہار ڈال کر بولی۔
عالی کی نظر اس کے سر سے ہوتی ہوئی نیچے گئی۔ کھلے گریبان کی قمیض سارے راز فشاں کررہی تھی۔ جسے شانے بے نیازی سے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ جیسے دعوت دے رہی ہو۔ اس فضول حرکت پر اسے شدید غصہ آگیا۔
عالی نے ایک جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیلا۔ "اپنی حدود میں رہو۔" وہ غصے سے بولا۔
"آئندہ ایسی فضول حرکات کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں ہر لحاظ بھول جاؤں گا۔ سمجھیں تم۔" وہ کہہ کر واش روم میں گھس گیا جبکہ نائلہ ہنس پڑی کب تک بھاگو گے جان من عجیب بازاری عورتوں والا لہجہ تھا۔
ودعیہ تھر تھر کانپ رہی تھی اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے نائلہ کو عالی کے اتنا قریب دیکھا تھا وہ عالی کے کمرے میں ان سے کتاب کا پوچھنے

لگی تھی کہ کیا وہ رکھ سکتی ہے اور ادھر کا منظر ہی نرالا تھا۔
وہ خاموشی سے بھاگ کر کمرے میں آ گئی۔ اور اب وہ کانپ رہی تھی۔

☆......☆......☆

''ودعیہ آج شام بازار چلیں گے۔ دوپہر کھانا پکاتے ہوئے شائلہ نے کہا۔
میں نے چند چیزیں لینی ہے تم بھی چلی چلنا میرے ساتھ۔ مجھے یہاں کے بازار کا کچھ زیادہ اندازہ نہیں ہے ناں۔
''بھابھی میں تو خود کبھی اکیلی نہیں گئی۔ میں آپ کی کیسے مدد کر پاؤں گی وہ ٹال رہی تھی۔
کوئی بات نہیں دونوں چلیں گئے۔ وہ لگاوٹ سے بولی اور وہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکی اور مسکرادی۔ جبکہ دل یکسر نہ جانے کو کہہ رہا تھا۔
''ہاں ہم آ رہے ہیں بازار۔ دیکھو کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے اچھا، ہاں...... ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ فون پر بات کر رہی تھی کہ ودعیہ آتی نظر آئی تو اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔
بھابھی مامی سے پوچھ لیا آپ نے۔ وہ سر پر دوپٹہ درست کر کے بولی۔
ہاں پوچھ لیا تم بے فکر ہو جاؤ۔'' وہ تسلی دے کر بولی۔
بازار سے شائلہ نے سردیوں کے لیے جوڑے لیے اور ایک زبردستی اسے بھی دلا دیا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ مہربانیاں کس چکر میں ہیں۔
''ودعیہ تمہیں کچھ چاہیے تو لے لو۔'' وہ سخی بن کر بولی۔
''نہیں بھابھی شکریہ، اب چلیں مغرب ہونے والی ہے۔'' اس نے وقت کا احساس دلایا۔
وہ گلی کے نکڑ تک آئیں۔ ''شاید میں شاپر دکان پر بھول آئی تم رکو یہیں میں لاتی ہوں۔'' وہ شاپروں کو دیکھتے ہوئے بولی۔
جی بھابھی وہ فرمانبرداری سے بولی۔ شائلہ پلٹ گئی۔
وہ انتظار کر رہی تھی کہ اچانک پیچھے سے اس پر کسی نے کپڑا ڈالا اور منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور زبردستی گاڑی میں بٹھا کے لے گئے۔

☆......☆......☆

خالہ ودعیہ گھر آ گئی کیا؟ شائلہ بدحواس داخل ہوئی۔
نہیں تو وہ نہیں آئی ابھی تمہارے ساتھ ہی تو گئی تھی ابھی تک تو وہ نہیں آئی۔ مامی پریشان ہوئیں۔
''اچھا! شائلہ بھی حیران تھی۔ خالہ میں تو اسے کھڑی کر کے واپس دکان میں شاپر چھوٹ گیا تھا وہ لینے گئی تھی کہار کو میں آ ؤں تو پھر اکھٹے چلیں گے۔ مگر میں آئی تو وہ وہاں نہیں تھی میں سمجھی گھر نکل گئی ہو گی سارے راستے دیکھتی آئی ہوں مگر وہ نظر نہ آئی۔'' شائلہ نے تفصیل گوش گزار کی۔
''آ جائے گی منحوس کہاں جائے گی وہ۔'' رقیہ بیگم نے تسبیح کے دانے گرانے شروع کیے۔
''اچھا چلیں میں پھر چیزیں رکھ دوں۔'' وہ کہہ کر اٹھی۔
پہلا گھنٹہ، پھر دوسرا گھنٹہ اور اب پانچواں گھنٹہ تھا مگر ودعیہ کا نشان ندارد تھا۔
ابھی تک مردوں میں سے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ رات گہری ہونے کو آئی تھی۔ شائلہ جلے توے کی چھپل بن کر لاؤنج کے چکر کاٹ رہی تھی مگر ودعیہ کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔

''شائلہ اپنے خالو کو فون ملا۔'' رقیہ بیگم نے پریشانی سے کہا۔
خالہ تین بار ملا چکی ہوں۔ وہ بند جا رہا ہے۔
''ولی یا عالی کسی کو تو ملا ابھی تک اس جنم جلی کا پتہ نہیں ہے کہاں دفعان ہو گئی ہے۔''
خالہ ملا چکی ہو ولی نے کہا کہ وہ آ رہے ہیں اور عالی اپنے آفس میں نہیں تھا اور فون بھی نہیں اٹھا رہا ہے۔ شائلہ نے پریشانی میں بتایا۔
تب ہی وقار صاحب داخل ہوئے۔
دونوں خواتین کو پریشان دیکھ کر انہیں تشویش ہوئی۔
''خیریت آپ دونوں کچھ پریشان لگ رہی ہو۔'' وہ صوفے پر براجمان ہوئے۔ وقار وہ ودیعہ......
''کیا ہوا ہے اسے۔'' انہوں نے بات اچک لی۔
''وہ ابھی تک گھر نہیں آئی۔'' رقیہ بیگم نے بمشکل کہا۔
''خالو وہ میرے ساتھ بازار گئی تھی اور میں ذرا واپس دکان تک گئی تھی اسے بازار والے موڑ پر چھوڑ کر کہ انتظار کرنا میں دکان میں شاید سوٹ والا شاپر چھوڑ آئی ہو۔ مگر واپسی پر وہ مجھے نہیں دکھی۔ اور گھر بھی نہیں پہنچی۔
شائلہ نے شرمندگی سے بتایا۔
کتنی دیر ہوئی ہے۔ انہیں غصہ چڑھ گیا۔
عصر تک میری واپسی ہوئی تھی۔
اور لوگ اب بتا رہے ہو گھڑی پر نظر پڑی تو 9:45 بجا رہی تھی۔
اف خدایا کہاں گئی بچی، انہوں نے سر پکڑ لیا۔
وہ ایک دم اٹھے اور باہر کو لپکے۔

ولی بھی ان کے جانے کے بعد آیا وہ بھی صورتحال سے گھبرا گیا اور باہر کی طرف لپکا۔ جبکہ دونوں خواتین گھر پر اکیلی تھیں۔
وقار صاحب تقریباً گھنٹے بھر تک آئے اور ساتھ ہی ولی بھی تھا۔
ملی کیا......؟ رقیہ بیگم لپکیں۔
وقار صاحب نے اک زہریلی نگاہ ڈالی۔
''6 گھنٹوں سے لاپتہ ہے وہ بیگم دودھ پیتی بچی نہیں ہے کہ راستہ بھول جائے۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کریں۔
''ابو آپ بیٹھیں۔'' ''شائلہ پانی لاؤ۔'' ولی نے اسے دوڑایا۔
ابو آپ پانی پییں اور تم عالی کو کال کرو۔
کتنی بار کر چکی ہوں مگر وہ اٹھا نہیں رہے۔ آفس میں بھی نہیں ہیں۔ شائلہ نے بتایا۔
خدایا میری بچی کو اپنے امان میں رکھ۔ وقار صاحب صوفے پر ڈھے گئے۔

☆......☆......☆

کمرے میں لا کر کسی نے اسے دھکا دیا۔ منہ پر اور آنکھوں پر پٹی تھی اور ہاتھ بے دردی سے باندھے ہوئے تھے۔ اسے اسی حالت میں پھینک کر چلے گئے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بار بار وہ چیخنے کی کوشش کرتی مگر منہ پر بندھی پٹی اس کی چیخوں کو دبا دیتی۔ آنکھوں پر پٹی کی وجہ سے شدید درد ہو رہا تھا۔ صرف پاؤں آزاد تھے وہ ان کی مدد سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ زور سے گرنے کی وجہ سے گھٹنے پر چوٹ لگ گئی تھی جو اب تکلیف دے رہی تھی وہ بہت کوششوں کے بعد کھڑے ہونے کے قابل ہوئی۔
اس نے احتیاط سے قدم بڑھایا چند قدم چلنے

کے بعد وہ دیوار سے ٹکرا گئی۔ وہ واپس پلٹی پھر چند قدم چلنے کے بعد وہ کسی چیز سے ٹکرائی تو شاید کوئی چارپائی وغیرہ تھی وہ بڑی احتیاط سے چلتی ہوئی اس پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں سناٹے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یہاں اکیلی ہے رات ہو گئی تھی شاید کیونکہ جھینگوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تھیں۔ اکیلے پن اور سناٹے سے اس کے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ ''یا خدا میری مدد کرنا مجھے اس عذاب سے نکال میرے مولا'' میری اور آزمائش مت لے۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

کیوں لائے ہیں...... یہاں...... شاید نہیں...... اس نے اپنی نفی کی یقیناً مجھے اغوا کیا گیا ہے مگر کس لیے؟ یہ سوال آخری تھا اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ پا رہی تھی۔ کمرے کے گھٹن اور حبس کے ماحول سے اس کا سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔ سیلن کی بدبو اس کی ناک جلا رہی تھی۔

پھر گھٹن سے آہستہ آہستہ اُس کا دماغ ماؤف ہونے لگا اور وہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اور وہ وہیں چارپائی پر لڑھک گئی۔

☆......☆......☆

عالی نے لاؤنج میں قدم رکھا تو غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ سارے لاؤنج میں جمع تھے۔'' خیریت تو ہے آپ سب اب تک جاگ رہے ہیں '' وہ لمبے لمبے قدم لیتا ہوا بڑھا۔

کیا ہوا ابو؟ وہ انہیں پریشان دیکھ کر ٹھٹک گیا سیدھا ان کی طرف بڑھا۔

''بیٹا اچھا ہوا تم آ گئے وہ ودیعہ کا کچھ پتا نہیں ہے وہ کہاں گئی ہے وہ شمائلہ کے ساتھ گئی تھی مگر لوٹی نہیں ہے۔'' انہوں نے مختصر بتایا۔

ہیں...... وہ کہاں جا سکتی ہے عالی بھی حیران ہوا۔

پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے نامراد کہیں کی۔ رقیہ بیگم شدید غصے میں تھیں۔

وقار صاحب نے خونخوار نظر سے دیکھا تو وہ منہ موڑ گئیں۔

کب سے غائب ہے؟ عالی نے شمائلہ سے پوچھا۔

''یہی کوئی 10-11 گھنٹے ہوئے ہیں۔'' وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔

اتنی دیر ہو گئی ہے اور اب کہہ رہے ہیں جیسے کہ...... وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔

''کوئی فون وغیرہ آیا ہے؟ اس نے پولیس افسر کی طرح تفتیش شروع کی۔

نہیں، جواب رقیہ بیگم کی طرف سے آیا۔

''کسی رشتے دار کے گھر تو نہیں گئی۔ عالی نے پھر سوال کیا۔

''بیٹا وہ کہاں جائے گی پہلے کبھی وہ کہیں گئی ہے اکیلی جو اب جائے گی۔'' وقار صاحب بولے۔

کہیں اپنے عاشق کے ساتھ تو نہیں بھاگ گئی وہ منحوس۔'' رقیہ بیگم نے ہاتھ نچا کر زہریلے انداز میں کہا۔

''بکواس بند کرو اپنی تم اب ایک لفظ بھی بولا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وقار صاحب نے جوان بچوں کا لحاظ کیے بغیر کہا اور غصے سے کھڑے ہو گئے۔

ان کا اشتعال دیکھ کر رقیہ بیگم جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں جبکہ شمائلہ بھی بھیگی بلی کی طرح صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ابو آپ فکر نہ کریں میں دیکھتا ہوں ولی بھائی آپ بھی چلیں عالی نے ان کا کندھا دبایا۔ آپ ٹینشن نہ لیں ہم دونوں ڈھونڈتے ہیں اسے

انشاء اللہ وہ خیریت سے ہوگی۔
وہ انہیں حوصلہ دیتا ہوا نکل پڑا۔
اس نے تمام پولیس اسٹیشن دیکھے، ہاسپٹل وغیرہ بھی چیک کیے مگر وہ ہوتی تو ملتی نا آخر کو 6 گھنٹوں کی ان تھک محنت کے بعد وہ دونوں ناکام لوٹے جب انہوں نے گھر میں قدم رکھا تو نئے دن کا سورج طلوع ہو چکا تھا مگر شاید ودعیہ کا سورج زوال کی طرف گامزن ہو رہا تھا۔
اس کے حواس دوبارہ بحال ہونا شروع ہوئے تو وہ اسی زاویے پر پڑی ہوئی تھی جس پر وہ گری تھی سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہ آیا مگر جب حواس مکمل بحال ہوئے تو اس کی روح کانپ گئی یعنی وہ اب بھی وہیں تھیں اسے لگا شاید وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ مگر جسم کے ہر عضو کی دکھن چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ تم حقیقت کی دنیا میں بیٹھی ہو دل کو خوش فہمی میں مبتلا نہ کرو ودعیہ بی بی۔
بشیر یار کنڈی کھول اس کڑی کو دیکھ لیں۔ کسی بھاری مرد کی آواز کی طرف وہ متوجہ ہوئی۔ وہ شاید کسی کو دروازہ کھولنے کے لیے کہہ رہا تھا۔
ودعیہ بجلی کی تیزی سے کھڑی ہوئی مگر آنکھوں پر پٹی کی وجہ سے اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دروازہ کس طرف ہے۔
کنڈی کی آواز آئی پھر دروازہ کھلنے کی۔
ودعیہ کا دل یک باری اتنی شدت سے دھڑکا کہ اسے لگا شاید وہ سینہ پھاڑے باہر نکل آئے۔
دیکھ ذرا اس کڑی کو فیدے۔ آنکھیں تک نہیں کھولیں اس چڑیا کی۔ آواز میں رحم تھا۔
وہی شخص آگے بڑھا اور اس کی آنکھوں کی پٹی اتاری پھر منہ بھی کھول دیا مگر ہاتھ بندھے رہنے دیے۔

اس نے آنکھیں کھولیں مگر اتنے گھنٹے بند رہنے کی وجہ سے وہ تیز روشنی میں دودھیا گئیں۔
سب سے پہلے اس کی نظر باہر سے آتی تیز روشنی پر پڑی۔ ابھی دن باقی ہے پہلا خیال اسے یہی آیا کہ ابھی کچھ دیر ہوگی ہے پھر اس نے اپنے سامنے کھڑے مرد کو دیکھا اور اچھل کر پیچھے ہوئی۔
گندے، میلے، کپڑے، گندے بال جیسے مہینوں سے نہیں نہایا اور اوپر سے مونچھیں عجیب وحشت والا حلیہ تھا۔
اور اس کے پیچھے ایک اور آدمی تھا اس کا حلیہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔
ک......ک......کون ہو تم......؟ اس نے ڈر ڈر کر پوچھا۔
''ہم کون ہیں رہنے دے یہ سوال تو بس چپ کر کے یہ کھالے۔''
ایک ٹرے اس کی طرف بڑھائی گئی۔ پہلا بولا۔
''مجھے کیوں لائے ہو؟'' یہ سوال بڑا ٹیڑھا قسم کا ہے کڑیے۔ دوسرا والا ہنس کر بولا۔
ودعیہ نے بندھے ہاتھوں سے ہی اپنا دوپٹہ درست کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ٹرے زمین پر رکھ دی گئی۔ یار بشیر ہاتھ کھول دے بینا کے۔ فیدا بولا۔
ہاں کھول دیتا ہوں تو کھانا کھا لے ہم جا رہے ہیں اور دیکھ بھاگنے کی کوشش تو تو کرنا نا۔ ویسے ہمارا ارادہ تجھے نقصان پہنچانے کا نہیں ہے مگر اگر کچھ گڑبڑ کی تو پھر تو خود ذمہ دار ہوگی۔ بشیر نے الٹی میٹم دے دیا۔ ساتھ میں غصیلی آنکھوں سے گھورا اور ودعیہ تھوک نگل کر رہ گئی۔
بزدل تو وہ ازل سے تھی اور اس وقت تو ویسے ہی وہ ان کے رحم و کرم پر تھی لہٰذا جلدی سے سر

ہلانے لگی۔

"شاباش......بشیر مسکرایا اور تو کیا گھور رہا ہے چل تو بھی۔" وہ فیدے کو دیکھ کر بولا اسے ذرا اچھا نہ لگا مگر پھر بھی چل پڑا۔

ان کے جانے کے بعد اس کا رُکا ہوا سانس بحال ہوا۔ اف خدایا میں کہاں ہوں اور گھر والے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا بہت پرانا معلوم ہو رہا تھا کافی خستہ حالت تھی کمرے کی۔ جا بجا دیواروں سے پلستر اترا ہوا تھا۔ سوائے ایک دروازے کے اور کچھ بھی نہیں تھا نہ کوئی کھڑکی نہ اور کوئی روشن دان ٹوٹی پھوٹی چارپائی کے علاوہ کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ماموں کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے اور مامی وہ نجانے اب تک مجھے کتنا برا بھلا کہہ چکی ہوں گی ولی بھائی بھی پریشان ہوں گے اور عالی سے خائف ہی تھی۔ وہ رونے لگی۔

کیا کروں وہ خود سے سوال کرنے لگی سامنے کھانا پڑا تھا۔ اس نے کل صبح کا ناشتہ کیا تھا اب اسے شدید بھوک لگی تھی مگر سامنے پڑے کھانے کو کھانے کا اس کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ اٹھی اور چلتی ہوئی دروازے تک آئی اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئی اور کوئی ذریعہ نہیں تھا باہر جانے کا اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ "کھولو مجھے جانے دو۔ دروازہ کھولو۔" وہ زور زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی اور ساتھ آوازیں دے رہی تھی مگر باہر کوئی ذی روح ہوتی تو دروازہ کھولتی وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

عالی کمرے میں مسلسل چکر لگا رہا تھا اور ہر پہلو پر غور کر رہا تھا مگر اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک دم غائب کیسے ہو گئی۔ اگر فرض کریں کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کیا ہے تو ابھی تک فون آ جانا چاہیے تھا یا پھر وہ کہیں واقعی خود تو نہیں بھاگ گئی۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

"نہیں وہ خود نہیں بھاگ سکتی وہ بزدل ہے اور ڈرپوک بھی۔" اس نے خود ہی اپنے خیالوں کی نفی کی۔ اور اگر اسے کسی مقصد کے لیے اٹھایا گیا ہے تو وہ جوان ہے اور اوپر سے خوبصورت بھی ہے اور ہمارے معاشرے کے مخصوص طبقے میں یہ دو چیزیں ہونا کسی بھی لڑکی کے لیے وبال جان بن سکتا ہے۔ ہر طرف گدھ اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کب انہیں اتنا حسین اور جوان گوشت ملے گا اور ایسی لڑکیوں کو اغوا کر کے آگے فروخت کرنا دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ جیسے یہ خیال ذہن میں آیا وہ فوراً فون کی طرف لپکا اور نمبر ملانے لگا۔

"ہائے کہاں دفعان ہو گئی یہ منحوس لڑکی پتا نہیں اب کیا ن چاند چڑھائے گی۔" رقیہ بیگم وقتاً فوقتاً سے اسے منحوس کہہ رہی تھیں اور شمائلہ فون پر فون گھما رہی تھی کبھی ایک رشتے دار کے گھر اور کبھی دوسرے کے ہاں، اس نے اس نے دوسرے شہروں میں رہنے والوں تک کو فون کر دیا۔ الغرض اس نے پورے شہر بلکہ پورے ملک میں ڈھنڈورا پیٹ دیا اس کے غائب ہونے کا۔

اب وہ سکون سے بیٹھی سیب کھا رہی تھی۔ خالہ تم بھی کھا لو آنا ہو گا اسے تو آ جائے گی ورنہ نا آئے ہماری بلا سے۔" وہ پلیٹ آگے کرتے ہوئے بولی۔

"کب آئے گی شمائلہ دیکھ اسے گئے 24 گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے ہے جوان جہاں ہے اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو لوگ ہم سے کہے گے کہ

ایک بچی کو بھی سنبھال کر نہ رکھ پائے۔'' رقیہ بیگم مسلسل سر پکڑے بیٹھیں تھیں۔

آپ فکر نہ کرو خالہ بس سیب کھاؤ اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ اب بھی مکمل اطمینان سے تھی۔

ولی کہاں ہے......؟ رقیہ بیگم پوچھا۔

''اوپر میں نے آرام کرنے کو کہا ہے۔ان کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔''

ہوں اچھا کیا اس جنم جلی کے پیچھے میرے بچے کتنا خوار ہوں گے آخر۔'' انہوں نے تائید کی۔

''تو اور کیا میں نے تو ولی کو آرام کرنے کا کہا ہے مگر یہ عالی ناں اس سے کہتے تو مجھے ڈر لگتا ہے بچارا کل سے کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ گھن چکروں کی طرح پھر رہا ہے اور خالو ان کی حالت بھی غیر ہو رہی ہے۔'' شائلہ کو سب کی فکر ستا رہی تھی سوائے اس کے جو سچ مچ مصیبتوں میں گھری تھی۔

☆......☆......☆

دھڑام سے دروازہ کھلا اور بشیر اور فیدا آ گیا وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

تو نے کھانا نہیں ہم تجھے کتنی دیر پہلے دے کر گئے تھے۔ بشیر نے کھانے جیسے کا تیسے دیکھا تو ناگواری سے بولا۔

دیکھ چڑیا توں کھالے کچھ ورنہ زندہ کیسے رہے گی۔ فیدے نے دانت نکوس کر کہا وہ ہواس باختہ کبھی ایک کو تو کبھی دوسرے کو دیکھ رہی تھی جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

مجھ...... مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ ساری ہمت جمع کر کے وہ صرف اتنا ہی بول پائی۔

تجھے کہا تھا ناں کہ اس سے تیرا کچھ لینا دینا نہیں کہ کیوں لائے ہیں تم صحیح سلامت ہو تیرے لیے یہ ہی کافی ہے۔'' بشیر ہتھے سے اکھڑ رہا تھا۔

ایک تو اس کمینے نے ناک میں دم کیا ہے کہ اس کا خیال رکھیں اوپر سے یہ شہزادی کھانے کو ہاتھ نہیں لگا رہی اتنا مہنگا کھانا خریدا تھا اس کے لیے اور اس نے ضائع کر دیا۔ اتنے میں، میں کتنے سگریٹ پی لیتا۔ اس نے افسوس سے کھانے والی ٹرے کو دکھا جس پر اب مکھیوں کا راج تھا۔

''ٹھنڈ رکھ یار تو۔ فیدے نے اس کا کندھا دبایا جا تو جا میں اسے سمجھاتا ہوں اس نے بشیر کو زبردستی سے باہر بھیجا۔

بشیر نے ایک غصیلی نظر ودعیہ پر ڈالی پھر ٹرے لے کر نکل گیا۔

دیکھو شہزادی ہو تو تم ایک قسم کی اٹم بم۔ وہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا تھا جبکہ وہ اسی طرح پیچھے سرکنے لگی ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا اپنے گیلے ہوتے ہاتھوں سے اس نے دوپٹے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

مگر چونکے یار سے وعدہ کیا ہے کہ تجھے ٹھیک سے واپس کر دیں گے اسی لیے بس۔''

فیدا بات ادھوری چھوڑ کر اس کے سراپے کو آنکھوں ہی آنکھوں سے دل میں اتار رہا تھا۔ جبکہ ودعیہ کے حلق میں کانٹے چبھو رہے تھے۔

''مگر سچی بات ہے نیت میری تیرے اوپر خراب ہو رہی ہے اس منحوس انسان نے کتنی وکھری چیز پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

وہ نجانے غائبانہ کس کے بارے میں بار بار کہہ رہا تھا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ دل ہی دل میں خدا سے مدد مانگ رہی تھی۔

''فیدے آ جا تو باہر اندر ہی رہے گا کیا؟ باہر سے بشیر نے آواز دی۔

''ہاں آتا ہوں یار۔'' وہ وہیں سے بولا۔

''تیرے پاس سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا جان من، مگر بشیرا اگر ہتھے سے اکھڑ گیا ناں تو مسئلہ ہو جائے گا۔'' فیدا اس کی لٹ کو چھو کر بولا۔ اس نے منہ سے آتی عالی بدبو سے وہ سرتاپا لرز گئی۔ وہ نہایت غلیظ قسم کی بدبو تھی اس نے نفرت سے منہ موڑا۔

اس کے جاتے ہی اس نے خدا کا لاکھ شکر ادا کیا۔

وہ آخر کس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ وہ اس غائبانہ شخص کو کوسنے لگی جو کہیں نہ کہیں اس کے اغوا میں ملوث تھا۔

☆......☆......☆

عالی نے اپنے تمام ذرائع لگا دیے تھے مگر کوئی خاطر خواہ معلومات نہیں ہوئیں تھیں اس نے اپنے ماتحتوں کی شہر میں مختلف جگہ ڈیوٹیاں لگا رکھی تھیں مگر کہیں سے مثبت معلومات حاصل نہیں ہوئیں تھیں ولی نے بھی اپنے طور پر کوشش کی تھی اسے بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ وقار صاحب کا حال ان دونوں سے مختلف نہ تھا وہ بے حد پریشان تھے ودعیہ ان کی ذمہ داری تھی یوں اچانک اس کا غائب ہونا انہیں ہلا کر رکھ گیا تھا۔ وہ نڈھال سے ہو گئے تھے۔

''ابو آپ نے بلایا تھا۔'' عالی کمرے میں داخل ہو کر بولا۔

''ہاں عالی ادھر آؤ۔'' انہوں نے اسے بیڈ پر بیٹھنے کو کہا۔

''کوئی معلومات ملی ہیں۔'' انہیں نے فکرمندی سے پوچھا۔

عالی نے نفی میں سر ہلایا او میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا ہے وہ ایک دم سے غائب ہو گئی ہے۔''

''بیٹا مجھے کچھ اور پریشانی ہے۔'' وہ فکر مندانہ انداز میں بولے۔

عالی چونک گیا۔ کیا ابو؟ اس سے بڑی اور کیا پریشانی ہے؟''

''بیٹا مجھے فکر ہے کہ کہیں ودعیہ کی جان کو تو خطرہ نہ ہو۔''

''میں سمجھا نہیں ابو اس کی جان کو خطرہ کس سے اور کیوں ہوگا؟''

ہو سکتا ہے کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کیا ہو۔

لیکن اگر تاوان کے لیے کیا ہوا تو یوں دو راتوں سے وہ اسے اپنے پاس نہ رکھتے بلکہ ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے۔ انہوں ایک اور پہلو پر غور شروع کر دیا۔

''یہ ہی بات تو مجھے بھی پریشان کر رہی ہے کہ اگر اسے تاوان کے لیے اغوا نہیں کیا تو پھر کیا مسئلہ ہے مجھے اتنا تو یقین ہے کہ وہ خود کہیں نہیں گئی۔ اسے یقیناً اغواء کیا گیا ہے۔'' عالی نے پر یقین لہجے میں کہا۔

''مجھے بھی لگتا تو یہ ہی ہے بیٹا۔ وقار صاحب نے بھی کہا۔

مجھے کسی پر شک ہے بیٹا۔ انہوں نے بہت سوچ کر کہا۔

کس پر؟ عالی متجسس ہوا۔

''اس کے ددھیال پر۔ وہ ہنوز سر پکڑ کر کچھ سوچ رہے تھے۔

''What ابو! وہ بھلا اسے کیونکر اغوا کرنے لگے۔ وہ یہاں آ کر بھی تو اسے لے جا سکتے تھے آنہیں بھلا اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

عالی نے کہا۔

جواباً مختصراً انہوں نے وکیل صاحب سے ہونے والی گفتگو اسے بتا دی۔ ہوں وہ ساری تفصیل سن کر خاموش ہو گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ابو واقعی اسے جائیداد کے لیے اغوا کیا گیا ہو۔''

''کیا ودعیہ کو جائیداد کا پتا ہے؟'' اس نے سوچ کر سوال کیا۔ نہیں بیٹا اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

ابو میں خالی شک کی بنا پر اتنی بڑی فیملی کو حراست میں تو نہیں لے سکتا ناں۔ مگر میں اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں کہ کچھ کر سکوں۔ آپ ذرا ان کا ایڈریس بتا دیں۔

وہ ان سے معلومات لینے لگا پھر وہاں سے اٹھ گیا۔

☆......☆......☆

چل لڑکی! کمرے میں بشیرے نے آتے ہی کہا۔

ک......ک......ہا......ں وہ بدک گئی۔

تجھے چھوڑنے جا رہے ہیں وہ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔

کہا......ں

چھو......ڑ......نے......جا......رہے ہو۔

الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے جبکہ ڈر کے مارے رنگت پیلی پڑ رہی تھی۔

اتنے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے سمجھی بس چپ کر کے ہماری بات مانتی جا تو فائدے میں رہے گی ورنہ کہیں میرا دماغ سرک گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔

خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے بشیر نے دھمکایا جس کا خاطر خواہ اثر ودعیہ پر ہوا اور اس کی زبان تالو سے لگ گئی۔

مگر دل کی زبان سے وہ براہ راست اپنے مالک حقیقی سے ناطہ جوڑے ہوئے تھی اور اپنی حفاظت کی اپیل کر رہی تھی بشیر نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔

فیدے گاڑی نکال لی ہے؟'' وہ اسے لے کر باہر آیا۔

''ہاں نکال لی ہے اسے بٹھاؤ۔'' یہ آواز اس کی جانی پہچانی تھی۔ مگر اسے اس وقت سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کی ہے مگر چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ بڑی جانی پہچانی آواز ہے مگر فیدے کی نہیں ہے میں اس کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ فیدے نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نہیں تو رہنے دے تو آگے بیٹھ میں بیٹھ جاؤں گا بشیر نے اکڑے لہجے میں کہا وہ فیدے کی نیت سے اچھی طرح واقف تھا لہٰذا وہ خود ودعیہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور فیدا آگے بیٹھ گیا۔

گھر میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر کوئی ودعیہ کا پوچھنے آ رہا تھا۔ وقار صاحب کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ ''بھلا یہ ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت تھی نہیں۔'' وہ رقیہ بیگم پر برس رہے تھے۔

''پورے شہر میں تم نے اس کے گم ہونے کی خبریں پھیلا دیں ہیں۔''

''میں نے تو بس تمام رشتے داروں سے یہ ہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ کہیں وہ ان کے ہاں تو نہیں آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے ان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

وقار صاحب غصے میں اندر چلے گئے اور دھڑام سے دروازہ بند کر لیا۔ لوگوں کو جواب دے دے کر وہ تھک گئے تھے احساس شرمندگی سے کسی کے سامنے سر نہیں اٹھا پا رہے تھے۔ ہر آنے جانے والا افسوس کم اور چٹخارہ زیادہ

لیتا۔ کب غائب ہوئی اکیلی تھی یا کسی کے ساتھ۔ کہیں اس کا کسی کے ساتھ افیئر؟'' جتنے منہ اتنی باتیں یہ سن سن کر ان کا اشتعال میں آنا لازمی تھا۔

ہاتھ کھول کر اسے گاڑی سے اتار دیا گیا البتہ آنکھوں کے آگے اب بھی پٹی تھی اور گاڑی فراٹے سے اڑا لے گئے۔

اس نے آنکھوں سے پٹی اتاری تو چند ثانیے کے لیے وہ کچھ دیکھ ہی نہ پائی پھر جب دیکھنے کے قابل ہوئی تو فرط مسرت اس کی چیخ نکل گئی وہ گھر کی گلی میں کھڑی تھی وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی گھر کی طرف بڑھی اس نے زور زور سے گیٹ پیٹنا شروع کر دیا۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

وہ اتنی جلدی اور حفاظت اس عذاب سے نکل آئی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا اس کے دل میں نجانے کتنے خدشے کتنے واہمے تھے مگر یقیناً اس کی کوئی نیکی کام آ گئی ہوگی۔ اور خدا نے اسے بحفاظت گھر تک پہنچا دیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر ہی خوش ہوئے جا رہی تھی۔

ارے دیکھو ولی کون پیٹ رہا ہے دروازہ رقیہ بیگم اب بھی غصے سے بھری بیٹھی تھیں۔

ولی نے جیسے ہی گیٹ کھولا ودعیہ کو سامنے پایا۔

''ودعیہ تم۔'' اسے حیرت ہوئی یہ اچانک ایک دم غائب ہوئی اور اب اچانک ایک دم سامنے وہ چند ثانیے شاک کی کیفیت میں کھڑا رہا۔

ولی بھائی میں ہی ہوں ودعیہ۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔

آ...... ہاں آ ؤ اندر آ ؤ۔ وہ مسکرا کر بولا۔

ابو دیکھیں ودعیہ آ گئی ہے ولی نے زور سے آ کر کہا۔ وقار صاحب باہر نکلے سب ایک دم حیران و پریشان اسے دیکھ رہے تھے۔ اچانک غائب اچانک حاضر۔

ماموں وہ تیزی سے بڑھی۔

''کہاں سے آ ئی ہے تو۔ رقیہ بیگم کے الفاظ قدموں کی زنجیر بن گئے۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی ہوگئی۔

وہ؟ مامی پتہ نہیں۔

''کیا پتہ نہیں دو راتیں کہاں گزار کر آئی ہے تو۔'' تجھے یہ پتہ نہیں ہے وہ تیزی سے بولیں۔

وہ حیران و پریشان سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی ہر ایک کی شکل پر یہی سوال تھا۔

مجھ...... مجھے نہیں پتہ مجھے کسی نے اغوا کیا تھا وہ آہستگی سے بولی۔

''ہیں...... اغوا کیا تھا اور پھر چھوڑ بھی دیا۔'' شمائلہ حیرانی سے بولی۔

''جھوٹ بول رہی ہے یہ۔'' بیگم نے وقار صاحب کو دیکھ کر کہا۔

وہ اب بھی منہ کھولے دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

اگر اغوا کیا تھا تو تاوان نہیں مانگا بس ایسے ہی چھوڑ دیا ارے یہ لڑکی ہمیں دھوکا دے رہی ہے وقار صاحب۔ گئی ہوگی اپنے کسی عاشق کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر آ گئی ہے ہمیں بے وقوف بنانے آج وہ سب کے سامنے زہر اگل رہی تھی۔

اور وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ لب ہنوز بند تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے جو آنسو بحفاظت گھر آنے پر خوشی کے نکلے تھے اب اپنی عزت کے چیتھڑے اڑنے پر ماتم کناں تھے۔

یاد نہیں ہے کہ پہلے بھی اس کے عاشق نے اسے خط دیا تھا اگر اسی وقت منہ توڑ لیا ہوتا ناں تو

آج یہ یوں رنگ رلیاں منا کر نہ آتی وقار صاحب۔ اس پر تو کتنا کہا تھا کہ مجھے اس پر یقین ہے آج کیا ہوا ہے آج یہ جھوٹ بول رہی ہے کہ اغوا کیا تھا کسی نے اور ایسے بھی گھر چھوڑ گئے کہ جاؤ بی بی غلطی سے اغوا کر لیا تھا۔ تمہیں اب اپنے گھر جاؤ۔ اغوا کرنے والے ایسے نہیں ہوتے بی بی۔ تم ہمیں بے وقوف بنانا بند کرو۔" وہ سارے حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھیں۔

"ماموں...... میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے واقعی اغوا کیا گیا تھا ابھی مجھے گلی کے موڑ پر چھوڑ گئے ہیں وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی جو ساکت وجامد بس اسے دیکھ رہے تھے۔

ماموں میرا دامن بالکل صاف ہے۔ آپ کو یقین ہے بولیں ماموں پلیز کچھ تو بولیں وہ گڑگڑا رہی تھی۔

اسے حیرت تھی کہ ماموں نے اب تک مامی کو کچھ کہا کیوں نہیں وہ بول رہی تھی مگر ماموں خاموش تھے۔

اس کی حیرت نے اس وقت سر پٹخ کر دم توڑ دیا جب ماموں کی آنکھوں میں اپنے لیے بے یقینی دیکھی۔

ماموں آپ کو لگ رہا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہو۔ وہ بے یقینی سے بولی۔

وقار صاحب نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر خاموشی سے نکل گئے۔ اور وہ حیرتوں کے طوفان میں تنہا کھڑی رہی اس نے مڑ کر ولی بھائی کو دیکھا ان کی آنکھیں بھی ماموں سے مختلف نہ تھیں وہاں پر بھی بے یقینی کے سائے لہرا رہے تھے انہوں نے افسوس سے سر ہلایا اور چلے گئے۔

"دیکھ منحوس تجھ پر اب کسی کو یقین نہیں ہے تجھے ذرا شرم نہیں آئی ہماری عزت کا جنازہ نکالتے ہوئے ہیں بتا کس کے ساتھ منہ کالا کر کے لوٹی ہے۔ کس کے ساتھ تو دو راتیں گزار کر واپس آئی ہے بتا۔"

رقیہ بیگم نے اسے پیٹنا شروع کیا۔ مگر اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا وہ بے حس بنی مار کھا رہی تھی اس کا یقین جو اسے اپنوں پر تھا بری طرح ٹوٹ کر بکھرا تھا۔ اس کی عصمت غیروں سے تو محفوظ رہی تھی مگر اس کے اپنوں نے زبان کے نشتروں اور بے یقینی سے تار تار کر دیا تھا اس کا غم انتہائی زیادہ تھا اس کی تکلیف اتنی تھی کہ جسمانی تکلیف کا اسے احساس تک نہیں تھا۔

مامی نجانے اسے مار مار کر کب گئیں اسے احساس تک نہیں ہوا۔

وہ وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ آنکھوں میں جو آنسوؤں کا سمندر ہمہ وقت پلکوں کے ساحل سے ٹکراتا رہتا تھا ایک دم ہی صحرا میں تبدیل ہو گیا اور اب ایک بھی بوند اس کی پلکوں کی باڑ سے نکل کر روئی جیسے رخسار پر بہہ نہ سکی جو مامی کے تھپڑوں سے دہک رہا تھا۔

عالی کو جیسے ہی اس کے گھر پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً دوڑا چلا آیا۔

ودعیہ وہ زیر لب بڑبڑایا اور فوراً اٹھ کر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا وہ پچھلے دو دنوں سے اس کے بارے میں اتنا سوچ چکا تھا کہ اس طرح اپنے سامنے یوں اچانک ملنے پر اسے عجیب سا سکون ملا تھا۔

"ودعیہ کہاں تھیں تم؟ کدھر چلی گئی تھیں؟ اور یہاں کیوں بیٹھی ہو اس طرح۔ کب لوٹیں کس طرح آئیں؟ وہ ایک ہی سانس میں ڈھیروں سوال کر گیا تھا۔ مگر ودعیہ نے سر گھٹنوں سے نہ اٹھایا۔

''تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں جواب تو دو۔'' وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر بولا۔

اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ چہرے پر واضح انگلیوں کے نشان تھے ہلکا سا نیل بھی دائیں رخسار پر تھا۔ اس نے ایک نظر عالی کے چہرے پر ڈالی عالی نے اس کا لال چہرہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ یہ کس نے کیا ہے تمہارے ساتھ؟''

وہ اب بھی خاموش تھی جیسے ہی دونوں کی نظریں ملیں عالی نے ودعیہ کی آنکھوں میں دیکھا اس کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ عالی سرتاپا لرز گیا۔

''ودعیہ میں کب سے پوچھ رہا ہوں یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو کیا ہوا ہے اور کس طرح واپس آئی ہو؟'' وہ دوبارہ اپنے سوالات دہرا رہا تھا۔

''اس سے کیا پوچھ رہے ہو تم یہ نجانے کس کے ساتھ عیش کر کے آئی ہے بدذات کہیں کی۔'' شمائلہ نیچے اترتے ہوئے بولی۔

بھابی...... عالی طیش سے بولا۔

''مجھے کچھ نہ کہو اس سے پوچھو فرماتی ہیں کہ مجھے اغوا کیا گیا تھا اور مجھے گلی کے موڑ پر چھوڑ گئے ہیں بندہ پوچھے اغوا کار کب سے اتنے اچھے ہو گئے کہ جوان جہان لڑکی کو اغوا کریں اور پھر مہمان نوازی کر کے واپس چھوڑ جائیں اور کوئی قیمت بھی نہ وصول کریں مہمان نوازی کی۔'' اس نے لفظ 'قیمت' کو بڑے اچھے انداز سے کہا۔

عالی حیران کھڑا ان کی زبان کی گوہر افشانی سن رہا تھا۔

اٹھو چلو، وہ بت بنے اس کا حکم مان رہی تھی اس سے چلا نہیں جا رہا تھا سارے جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے چلنے کی کوشش کی تو وہ لڑکھڑا گئی عالی نے فوراً اسے سنبھال لیا اور سہارا

دے کر اس کے کمرے میں چھوڑ آیا۔

وہ اپنے کمرے میں آیا تو عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ کیا ودعیہ سچ کہہ رہی ہے؟ یا جو بھابی نے اشارہ کیا وہ...... وہ عجیب بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

صبح ناشتے کی میز پر اس نے عجیب خاموشی محسوس کی رقیہ بیگم کا منہ پھولا ہوا تھا وقار صاحب شرمندہ شرمندہ لگ رہے تھے ولی بھی چپ تھا۔

ودعیہ کہاں ہے؟ اس نے بھابھی سے پوچھا۔

''جہاں بھی ہو، خبردار جو وہ منحوس، بدذات، بدکردار لڑکی میرے سامنے آئی تو کچھ کر دوں گی اس کا۔'' شمائلہ بیگم سے پہلے رقیہ بیگم پھٹ پڑیں۔

اس نے افسوس سے ابو کو دیکھا اور حیرانی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی کہ آج وہ بھی چپ ہیں جیسے سب سے زیادہ اعتبار تھا اپنی بھتیجی پر وہ بھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کو غلط سمجھ رہے تھے وہ ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ناشتے سے ایک دم اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

آفس میں بھی سارا دن وہ ودعیہ کو لے کر سوچتا رہا۔ ساری کڑیاں ملا رہا تھا مگر واضح سرا اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ تھک گیا تھا۔ نہیں جب تک میں ودعیہ سے خود نہیں پوچھ لیتا کوئی حتمی فیصلہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا آج جا کر پوچھوں گا۔''

رات اسے دیر ہو گئی ایمرجنسی میں آئی جی صاحب نے میٹنگ بلائی تھی جس میں اسے جانا پڑا لہذا ودعیہ سے پوچھنے کا کام کل پر ملتوی کر دیا گیا۔

اگلے دن اسے وقت نہ مل سکا اور اسی طرح دو

دن اور گزر گئے اس نے ان گزرے دنوں میں اس کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔

آج وہ اپنے سارے کام جلدی جلدی نمٹا کر سرِ شام ہی آ گیا۔

آتے ہی وہ سیدھا پہلے کمرے میں گیا فریش ہو کر وہ پھر ودعیہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دل میں عجیب سے خیالات آ رہے تھے۔

چال میں بھی جھجک تھی کہ آخر وہ کس طرح اس سے سب پوچھے گا آخر کار اس نے دستک دی۔

تین بار دستک دینے پر بھی جواب نا پا کر وہ خود اندر داخل ہوئی کمرے میں تاریکی تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا تو نظر زمین پر پڑے میٹرس پر پڑی جس کے عین درمیان وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی کمرے میں عجیب سوگ کی کیفیت تھی جیسے ہر چیز جو کمرے میں موجود ہے اس کے غم میں شریک ہو۔ عالی کے آنے پر نہ اس نے سر اٹھایا اور نہ کچھ بولی۔

بکھرے ہوئے بال تھے نجانے کب سے انہیں ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ شکنوں سے پر لباس تھا وہ چوکڑی مارے ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر عالی کو پہلی مرتبہ کچھ ہوا۔

ودعیہ...... اس نے دھیرے سے پکارا۔

مگر دوسری طرف کوئی جنبش نہ تھی۔

ودعیہ وہ دوبارہ پکارا اور چلتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے اب بھی سر نہیں اٹھایا تھا۔

عالی اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔

"ودعیہ مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا تھا شروع سے مجھے ساری بات بتاؤ۔

شاباش وہ اسے بچکارتے ہوئے بولا۔

دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔

ودعیہ بتاؤ گی نہیں تو کیسے پتہ چلے گا پلیز مجھے اچھے بچوں کی طرح بتاؤ ناں کہ کیا ہوا ہے......؟ وہ اسے بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہا تھا۔

اس نے پہلی بار سر اٹھایا آج اس کی آنکھوں میں نہ عالی کے لیے بے زاری تھی، نہ نفرت نہ کچھ اور بلکہ آج اس کی آنکھیں بالکل خالی تھیں نہ کوئی سوال، نہ شکوہ نہ رنج نہ غم کچھ بھی تو نہیں تھا اس کی آنکھوں میں ہر جذبات سے عاری آنکھیں تھیں اس کی۔

عالی کا دل کٹ گیا۔ پلیز ودعیہ کچھ تو بولو، کچھ تو کہو، اس نے التجا کی مگر وہ صرف خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"کچھ نہیں کہو گی تو دنیا تمہیں قصور وار گردانے گی لڑکی اپنی صفائی میں کچھ کہو۔ اپنا دفاع کرو۔ اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

ودعیہ نے خاموشی سے دوبارہ سر جھکا لیا۔

ودعیہ تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔ اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اف خدایا لگتا ہے کہ میں کسی دیوار سے سر مار رہا ہوں۔ عالی کو اس کی بے حسی پر غصہ آ گیا تھا آخر کب تک وہ خود پر کنٹرول کرتا وہ چلا پڑا۔

نہیں بتانا تو نہ بتاؤ پھر جو ہوگا تمہارے ساتھ وہ تم سوچ بھی نہیں پاؤ گی کہ زندگی تم پر کتنی تنگ کر دی جائے گی سمجھیں۔ وہ غصے سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

اور کتنی زندگی تنگ کریں گے مجھ پر سارے سانس لینا تک تو محال کر دیا ہے میرا۔ جب مجھ پر میری باتوں پر کسی کو اعتبار نہیں ہے تو مجھے بھی صفائی نہیں دینی کسی کو، میں کچھ نہیں بولوں گی وہ صرف سوچ سکی اس کے ہونٹوں پر اب بھی قفل تھا۔

☆......☆......☆

وہ اس کے کمرے سے نکل کر راہداری میں واک کرنے لگا۔ یہ لڑکی نہ تو کچھ بول رہی ہے نہ ہی سمجھ رہی ہے، کہاں تو ہر بات پر آنسو گرنے لگتے ہیں اور اب...... نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا یہ لڑکی کچھ بھی غلط کر سکتی ہے۔

مگر یہ کچھ بتا بھی تو نہیں رہی ناں وہ مسلسل اپنے دل دماغ کے درمیان جنگ لڑ رہا تھا۔

دماغ کہتا تھا کہ امی ٹھیک ہیں اس کا یقیناً کوئی چکر و کر رہا ہوگا لڑکے نے فائدہ اٹھا کر منع کر دیا ہوگا تو واپس لوٹ آئی۔

دل کہتا ہے کہ یہ لڑکی پاک دامن ہے اس کے ساتھ کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جو یہ ٹھیک سے بتا نہیں پا رہی مگر وہ کچھ بولے تو ناں وہ چڑ گیا۔

نہ جانے کب سے وہ اسے سوچنے لگا تھا لاشعوری طور پر وہ اس کے ایک ایک انداز و اطوار کو دلچسپی سے دیکھنے لگا تھا کہیں نہ کہیں اس کا دل مانتا کہ وہ واقعی ایک منفرد لڑکی ہے سب سے الگ۔ اب اتنا بڑا بہتان اسے بے چین کیے جا رہا تھا۔

وہ چلتا ہوا ولی کے کمرے کے سامنے آ گیا۔

کمرے سے آتی آواز نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

ہاں امی کیا زبردست کام ہوا ہے ہاں اور کیا ارے ہم نے جتنا سوچا تھا ناں اس سے بھی زیادہ وہ مزے لے کر بتا رہی تھی۔

اب دوسری طرف سے بات کی جا رہی تھی۔

ارے نہیں کسی کو کان و کان خبر نہیں ہوئی کہ اسے ہم نے غائب کروایا تھا آواز میں بلا کا فخر تھا اپنے کارنامے کے لیے۔

ارے نہیں امی اب بس دیر نہ کرو۔ لوہا گرم ہے وار کر و اب کے تو کسی کی مجال ہی کیا تو انکار کرے۔ شائلہ نے ٹھونک بجا کر کہا۔

عالی نے اشتعال کے باعث مٹھیاں بھینچ لیں۔

ہمیں اس سے کیا بس ایک بار شادی ہو جائے جائیداد ہمارے ہاتھ آئے پھر ہمیں کسی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

اس بار میرے سر کیا ان کے فرشتے بھی انکار نہیں کریں گے ہم نے کچا کام ہی نہیں کیا ہے اب بس زیادہ دیر نہ لگانا کل ہی آ جانا ہاں اب رکھتی ہوں ہاں ولی کے آنے کا وقت ہو گیا ہے ہاں، ہاں ٹھیک ہے...... ہاں پھر فون بند کر دیا گیا۔

عالی اپنے کمرے میں لوٹ آیا غصے کے باعث وہ کبھی ایک کونے کبھی دوسرے کونے میں چکر کاٹ رہا تھا۔

خالہ کا گھرانہ چھوٹے ذہنیت کا مالک ہے یہ میں جانتا تھا مگر اس حد تک...... اسے رہ رہ کر ان پر غصہ آ رہا تھا۔

بچاری ودعیہ، اس کا بھلا ان سب میں کیا قصور ہے وہ بچاری تو خواہ مخواہ ہی بدنام ہو رہی ہے سچ بول رہی تھی اور کسی نے اس پر اعتبار ہی نہیں کیا۔ ابو نے بھی نہیں اسے ودعیہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

نہیں میں ہرگز ودعیہ کی زندگی خراب ہونے نہیں دے سکتا۔

مجھے کچھ کرنا ہوگا مگر کیا؟ وہ خود سے سوال کرنے لگا۔

اگر واقعی کل خالہ رضوان کا رشتہ لے آئیں تو ابو شاید انکار نہ کر پائیں اور اگر میں نے رضوان پر کیس کیا تو خاندان والوں کی Specially

ودعیہ کی بدنامی ہو جائے گی۔

اور ودعیہ کی بدنامی میں ہرگز نہیں چاہتا وہ چلتے چلتے رک گیا۔

کیا میں اسے چاہنے لگا ہوں؟ ایک دم اس کے اندر سے کوئی بولا۔

ن......ن......نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے چاہت واہت کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن میں اسے دکھ میں نہیں دیکھ سکتا اپنے اندر سے ابھرتے سوال پر وہ گڑبڑا گیا پھر خود کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے خود ہی دلیل دی۔ اچانک اس کا دل و دماغ ایک فیصلے پر یکجا ہوئے۔

''ہوں یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ خود سے کہہ کر وقار صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا۔

''دستک دے کر وہ اندر داخل ہوا ابو مجھے آپ سے بات کرنی ہے بہت ضروری۔''

☆......☆......☆

آج جمعہ کا دن تھا وہ اب بھی کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس نے گھر کے کام کرنا چھوڑ دیے تھے بس کمرہ نشین ہو گئی تھی جب بھوک حد سے بڑھ جاتی تو خالی پیٹ کے لیے وہ کمرے سے نکل کر کچن تک کا سفر کرتی ورنہ وہ دن رات کمرے میں گزار رہی تھی وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے کمرے میں تھی۔

اس نے ان پانچ دنوں میں کسی سے کوئی بات نہ کی تھی اور نہ ہی حیرت انگیز طور پر آنسو بہائے تھے بس بت بنی بیٹھی رہتی تھی۔

ماموں داخل ہوئے تو وہ سنبھل کر بیٹھی۔

''ودعیہ بچے تو ٹھیک ہے وقار صاحب کی شرمندہ سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی رہی انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سے بات کیسے کریں۔ وہ عجیب کشمکش کا شکار تھے۔ ایک عجیب سی بے چینی عجیب سی شرمندگی اس کا احاطہ کیے تھی وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ مسل رہے تھے پھر چپ کر کے اس کے پاس بیٹھے۔

''بیٹا میں سرمندہ ہوں مجھے معاف کر دے وہ سر جھکا کر بولے۔

مجھے تجھ پر یقین کرنا چاہیے تھا مگر افسوس اس عقل کا جو دل پر پردہ ڈال گئی۔ میں تمہارا قصور وار ہوں بچہ مجھے معاف کر دے۔'' وہ شرمندگی سے بولے۔

ودعیہ نے سر اٹھایا اب بھی اس کی آنکھیں ویران تھیں جسے دیکھ کر ان کے اندر کچھ کٹ گیا۔

''بیٹا تو میری اکلوتی بہن کی ایک ہی اور آخری نشانی ہے تو میری بیٹی ہے کیا تو مجھے معاف نہیں کرے گی میری ودعیہ۔ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولے۔ میں شرمندہ ہوں بیٹا مجھے معاف کر دے۔'' وہ رونے لگے۔

ودعیہ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا بے شک اس کا دل دکھا تھا اسے بے اعتبار کیا گیا تھا اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی تھیں مگر وہ اتنی سنگ دل تو ہرگز نہیں تھی کہ اپنے ماموں کے سفید بالوں کا لحاظ نہ رکھتی اپنے ان ماموں کا جنہوں نے اسے پالا پوسا تھا اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اس یتیم کو سہارا دیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ماموں کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں نے آپ کو معاف کیا ماموں......'' وہ آہستگی سے بولی۔

وقار صاحب کی آنکھوں میں خوشی کا دیپ روشن ہوا عالی نے انہیں صرف اتنا بتایا تھا کہ اسے بڑے پکے ذرائع سے یہ اطلاع ملی تھی کہ ودعیہ کو اغوا کیا گیا تھا مگر پھر پولیس کو شک ہوا اور انہوں نے اغوا کاروں کو پکڑنے کی کوشش کی مگر انہوں

نے ڈر کے مارے ودعیہ کو محلے میں چھوڑ دیا تا کہ پولیس سے بچ جائیں پولیس نے Raid کی تھی مگر وہ پہلے ہی نکل چکے تھے اس نے جھوٹی کہانی سنا کر وقار صاحب کو مطمئن کیا اس نے خالہ عالی بات یکسر چھپائی اس سے رشتوں میں کرواہٹ آجاتی ہے دراڑ پڑ جاتی ہے گھر میں۔ ولی کی خوشی بھی اسے عزیز تھی اور وہ اپنے بھائی کو کھونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا وہ بات گول کر گیا ساتھ ہی اس نے ودعیہ کا ہاتھ بھی مانگ لیا۔

وقار صاحب کی تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں تھیں۔ انہیں اور بھلا کیا چاہیے تھا ان کی دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ انہوں نے بڑھ کر عالی کو گلے سے لگا لیا۔

ودعیہ بیٹے مجھے تم سے ایک بات اور کرنی ہے۔ انہوں نے خوشی سے کہا۔

جی ماموں! وہ سر جھکا کر بولی۔

''بیٹے تمہارے ساتھ جو ہوا، وہ برا ہوا۔ مگر ہم اسے بدلنے کی طاقت سے محروم ہیں۔ ہمیں دکھ ہے اس بات کا مگر ہم تمہاری آنے عالی زندگی ضرور خوشحال کر سکتے ہیں اور اس کے لیے میں نے ایک فیصلہ لیا ہے اور مجھے اس بات کی پوری امید ہے کہ تم اسے قبول کرو گی۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم میری بہو کے طور پر اس گھر میں حق سے رہو میں چاہتا ہوں کہ تمہاری اور عالی کی شادی ہو جائے۔

ودعیہ نے فوراً سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں واضح حیرت تھی۔

ماموں...... اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

''ہاں بیٹا عالی نے خود کہا ہے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے خوشی سے بتایا۔

عالی بھائی نے کہا ہے یہ سن کر اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ منہ بھی کھلا رہ گیا۔ اب کس چیز کا بدلہ لینا رہ گیا ہے عالی بھائی اب تو بس کر دیں۔ وہ سوچ سکی مگر بول نہ سکی۔

ہاتھوں میں پسینہ آ گیا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔

''ماموں میں شادی...... عالی بھائی سے...... کیسے کروں گی۔''

وہ بمشکل ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بول پائی۔

''بیٹا جو ہو رہا ہے وہ ہونے دو اور دیکھو میں نے زبردستی تو نہیں کی ناں تمہاری بے گناہی کا بھی اس نے مجھے یقین دلایا ہے وہ ہی ہے جو تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم دونوں خوش رہو گے بس بیٹا انکار مت کرنا اور میری بھی یہ ہی خواہش ہے۔'' وہ جذباتی ہو کر بولے۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے اس کا سر اچانک بھاری ہونے لگا کیا میری زندگی ہمیشہ میرے لیے امتحان بنی رہے گی؟

کیا میں کبھی پرسکون نہیں رہوں گی؟ کیا کبھی مجھے خوشیاں نصیب نہیں ہوں گی؟ اس کے سامنے بہت سے 'کیا' تھے اس نے افسوس سے سر گرا لیا وہ اپنے ہی سوالوں میں گم سر جھکائے بیٹھی تھی۔

اس کے سر جھکنے کو ماموں نے اس کی ہاں گردانا اور محبت سے ماتھا چوم لیا۔ مجھے پتا تھا کہ میری بیٹی انکار نہیں کرے گی بس آج ہی نکاح کرواتا ہوں تا کہ کسی کو انکار کرنے کا موقع نہ ملے۔ وہ کہہ کر نکل گئے۔

ودعیہ سے جھٹکے سے سر اٹھایا اس نے ہاں نہیں کی تھی۔

وہ انکار کرنا چاہتی تھی وہ کہنا چاہتی تھی کہ جس

شخص سے وہ بے زار ہے جس کا سامنا کرنا نہایت دشوار لگتا ہے، جس کو سننا اسے برا لگتا ہے وہ اس کے ساتھ زندگی کیونکر گزار سکتی ہے۔ مگر خالی دروازہ اسے منہ چڑا رہا تھا جہاں سے ماموں ان کے جھکے سر کو اس کا اقرار سمجھ کر نکاح کی تیاری کرنے چل پڑے تھے۔

''اب میں نے ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے کون سی ایسی غلطی مجھ سے سرزد ہوئی ہے جس کی اتنی کٹھن سزا مل رہی ہے مجھے کہ ساری زندگی عالی بھائی جیسا بندہ میرے سر تھوپ رہے ہیں ساری زندگی مامی نے حکمرانی کی اور اب ان کا عکس مجھ پر رعب جھاڑے گا۔'' وہ سر تھام کر بیٹھ گئی اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس کے اور عالی بھائی کے درمیان کسی خوشگوار یاد کا بسیرا رہا ہو۔

کیا مجھے کبھی ٹھنڈی چھاؤں نصیب نہیں ہوگی؟ کیا میری ساری زندگی کڑی دھوپ میں بسر ہوگی؟ وہ بالکل ہی مایوس تھی۔

☆......☆......☆

آپا یہ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟ کس کی نظر لگ گئی ہے؟ ذکیہ بیگم بمعہ اہل وعیال تشریف لا چکی تھیں اب وہ ان کے غموں کو بانٹ رہی تھیں۔

کیا بتاؤں ذکیہ وہی منحوس لڑکی ہماری عزت نیلام کرنے پر تلی ہوئی ہے بتایا تو ہوگا شمائلہ نے سارا کچھ۔'' انہوں نے شمائلہ کو دیکھ کر کہا۔

ہاں بس تھوڑا ہی بتایا تھا سرسری سا۔ انہوں نے فٹ کہا۔

اب وہ تو یہ بولنے سے رہیں کہ آپا تمہارے پل پل کی خبر رکھتے ہیں مجھے تو یقین نہیں آتا آپا اس چلتر باز کا چہرے سے بلا کی معصوم لگتی ہے بھولی بنی پھرتی ہے اور کرتوت تو دیکھوں اس منحوس کی۔'' وہ بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھیں فوراً بہن کا دل رکھنے کے لیے بولنے لگیں۔

ہاں بس آج کل کی تو شکلوں پر تو جانا ہی نہیں چاہیے ناں گھر کی بات نہ ہوتی تو کب کا باہر پھینکتی بدکردار کو۔ رقیہ بیگم نے نفرت سے کہا۔

ذکیہ بیگم شمائلہ کو دیکھ کر مسکرائیں جواباً شمائلہ نے آنکھیں مٹکائیں جیسے کہہ رہی ہوں پھر مانتی ہو ناں اماں کہ کتنا زہر بھرا ہے میں نے ودعیہ کے لیے خالہ کے دل میں۔

''السلام وعلیکم بھائی صاحب۔'' ذکیہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے وقار صاحب سے کہا۔

وعلیکم السلام اچھا ہوا آپ آگئیں۔ وہ خوشی سے بولے۔

''جی بس آنا تو تھا ناں اتنی بڑی بات جو ہوگئی ہے۔'' وہ نہایت مکاری سے افسوس جتا رہی تھیں۔

وقار صاحب نے اپنی خوشی میں ان کا انداز نظرانداز کر دیا۔

خالو آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ خالہ نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت پچھلے دنوں سے خراب تھی۔ رضوان نہایت ادب و احترام سے کسی شریف بچے کی طرح بولا۔

آخر کو اس گھر کا ہونے والا داماد کا خواب آنکھوں میں بسائے آیا تھا کچھ تو شرافت بنتی تھی ناں۔

''ہاں اللہ کا کرم ہے۔'' وقار صاحب بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے ابھی تین بجے تھے اور انہوں نے نکاح کا وقت عصر کے بعد کا رکھا تھا اور گھر میں کسی کو نہیں بتایا تھا وہ جانتے تھے کہ بتا دیا تو ہنگامہ ہوگا رقیہ بیگم کی طرف سے اس لیے خاموشی میں مصلحت تھی۔

شمائلہ ان کے لیے جوس لائی ذکیہ بیگم کے ساتھ بیٹھ کان میں بولی۔ ''اماں بات کرو ناں کس کا انتظار کر رہی ہو تم؟''

''ہاں کرتی ہوں۔'' وہ جوس کا سپ لے کر بولی۔

''بھائی صاحب ودیعہ کے ساتھ جو ہوا اس کا دکھ ہے ہمیں انہوں نے تمہید باندھی۔ ہے تو وہ گھر کی بچی اس لیے بس دل دکھ جاتا ہے اس کے لیے۔

میں تو ہوں ہی ہمدرد دل کی مالک۔''

وقار صاحب ان کے اس فقرے پر انہیں ایسے دیکھا جیسے یہ فقرہ ان کی پرسنالٹی سے میل نہ کھاتا ہو۔

''بس اسی لیے میں آج بھی اپنے رضوان کے لیے اس یتیم بچی کا ہاتھ مانگ رہی ہو۔ مجھے تو خدا کا خوف ہے ورنہ بھلا ایک یتیم دوسری بدکردار لڑکی کو بھلا آج کل کے زمانے میں کون منہ لگاتا ہے بتاؤ بھلا۔''

وقار صاحب کے تیور بدلے۔ ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

رقیہ بیگم نے بھی حیرانی سے دیکھا۔ ابھی اس کے خلاف تھی ساتھ ہی اس کا رشتہ مانگ رہی ہے۔

''بس بھائی صاحب اب آپ میرے اکلوتے ہونہار بیٹے کے لیے اس کا رشتہ دے دیں وایسے بولیں جیسے احسان کر رہی ہوں۔''

اماں یہ تو تم نیکی کماؤ گی ورنہ ایسی لڑکی جو دو راتیں باہر گزار کر آئی ہو اسے کون اپنائے گا مجھے فخر ہے تمہاری سوچ پر اماں۔'' شمائلہ نے فوراً اپنے ماں کے فیصلے کو داد دی۔ وقار صاحب اب بھی خاموش تھے۔

''ہم نے سوچا چلو خالہ کی عزت بھی رہ جائے گی اور ودیعہ کو ٹھکانہ بھی مل جائے گا یہ تو بھائی کی ضد تھی کہ شادی کروں گا تو صرف ودیعہ سے ہی کروں گا ورنہ ہمیں تو رشتے بہت ایک سے ایک لڑکی ہماری نظر میں مگر رضوان کی خوشی کے آگے ہم چپ کر گئے۔''

نائلہ نے اپنا حصہ ڈالا جبکہ رضوان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ تمہارا بڑا حوصلہ ہے ذکیہ کہ اب بھی تم اس کا رشتہ مانگ رہی ہو رقیہ بیگم نے کہا۔

''ذکیہ بہن آپ اپنے ہونہار بیٹے کا رشتہ ان ہی لڑکیوں سے کرآئیں جو ایک سے بڑھ کر ہے۔'' وقار صاحب ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''اول تو یہ کے ودیعہ بدکردار نہیں ہے دوسری بات اس کا ایک رشتہ آیا ہے اور وہ لڑکا اس سے خود شادی کا خواہش مند ہے۔ وہ آپ کے بیٹے سے ہزاروں نہیں کروڑوں گناہ بہتر ہے۔

یہ سن کر سب کا منہ کھل گیا۔ ''لو بھلا کون ایسا ہے جو اس لڑکی کو منہ لگا رہا ہے؟'' ایک بار پھر انکار پر ذکیہ بیگم کا پارہ چڑھ گیا ساری ہمدردی ہوا ہو گئی۔ اور وہ تڑخ کر بولیں۔

''جو بھی ہے بہت شاندار ہے، فکر ہے مجھے اس پر۔'' وہ بلند آواز میں بولے آپ آ گئیں ہیں تو بہت ہی اچھا ہے آپ بھی اس مبارک ساعت کا حصہ بنیں گے۔''

''آج ہی ودیعہ کا نکاح ہے عصر کے بعد۔'' آپ خود مل لیجیے گا وہ کہہ کر نکل گئے۔

جبکہ پیچھے سارے لوگ تو اچھل ہی پڑے۔

''آپا تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس کا نکاح ہے۔'' ذکیہ بیگم کے چہرے پر ناگواری واضح تھی

اور آواز میں غصہ جبکہ رقیہ بیگم خود بھی شاک کی حالت میں بیٹھیں تھیں۔
''مجھے بھی تو ابھی معلوم ہوا ہے کہ اس کا نکاح ہے۔'' وہ حیرانی سے بولیں۔ لو کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ رضوان بولا۔ نائلہ نے ٹھوکا دے کر اس کو اس کی غلطی کا احساس کرایا۔
شمائلہ بار بار پہلو بدل رہی تھی کون آ گیا ہے جو اس منحوس سے نکاح کر رہا ہے۔ سارے کیا کرایا پانی میں جا رہا تھا جو اسے منظور نہیں تھا۔
''تم تو بس اب نکاح کا انتظار کرو اسے دیکھنے کے لیے۔ نائلہ ناگواری سے بولی۔
اچھا ہی ہے کہ یہ منحوس کا نکاح ہے اب گھر سے تو جائے گی ناں۔ رقیہ بیگم اٹھ کر چلی گئیں۔
''ساری بساط ہم نے بچھائی اور جیت کوئی اور رہا ہے پتہ ہے کہ کتنے پاپڑ بیلے تھے میں نے تم لوگوں کے کہنے پر رضوان غصے سے بولا۔
''تو ہمیں کیا پتا تھا کہ ایسا کچھ ہوگا۔ اب تم بار بار منہ نہ کھولو کسی نے سن لیا ناں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ شمائلہ چڑ گئی۔

☆......☆......☆

''بیٹا تم تیار ہو جاؤ تمہارا نکاح عصر کے بعد ہے۔'' ماموں کمرے میں آ کر بولے۔
ودعیہ نے بے بسی سے ماموں کے خوشی سے بھرپور چہرے کو دیکھا۔
''مجھے بڑی خوشی ہے بیٹا کہ تم عالی کی دلہن بن رہی ہو۔ وہ اس رضوان سے کروڑوں گنا بہتر ہے جواب بھی تمہارا سعالی بنے نیچے رشتہ لے کر آیا ہے۔'' وقار صاحب فخر سے بولے۔
''رضوان کا نام سن کر وہ سرتاپا لرز گئی۔ واقعی رضوان سے تو عالی بھائی بہت بہتر ہیں اگر عالی بھائی نہ ہوں تو مامی میری شادی رضوان سے کرا دیں۔'' جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد تو سارے مان جائیں گے سوچوں کا دھارا کسی اور رخ بہنے لگا۔ مطلب ابھی تک کسی کو نہیں پتا کہ میرا نکاح ہے وہ بھی عالی بھائی کے ساتھ۔ اسی لیے ابھی تک کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا یقیناً مامی کو نہیں پتہ ہوگا ورنہ وہ تو قیامت برپا کر چکیں ہوتیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔
فون کی گھنٹی بجی تو وقار صاحب متوجہ ہوئے۔
''ہاں ولی یار میں نے کیا تھا فون میں نے کہنا تھا کہ جلدی آ جاؤ عصر تک ہاں۔'' ہاں وہ کہتے ہوئے چلے گئے تھے۔
وہ خاموشی سے اٹھ کر واش روم میں گھس گئی۔
وقار صاحب صحن میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے وہ عالی کا انتظار کر رہے تھے عصر ہو چکی تھی مگر وہ اب بھی لوٹا نہیں تھا گیٹ کھلا اور یونیفارم میں ملبوس عالی اندر داخل ہوا۔
''کہاں رہ گئے تھے یار تم۔'' وہ فوراً بڑھے۔
''ابو بس کام ضروری تھا آپ نے امی کو بتا دیا کیا؟'' وہ بے چینی سے بولا۔
''نہیں بیٹا میں نے کہا عین وقت پر بتاؤں گا ورنہ وہ ہنگامہ برپا کر دے گی۔'' وہ اسے شانوں میں لے کر بڑھے۔
''مگر ابو عین وقت پر اگر کوئی۔''
''چلو بیٹا جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ انہوں نے اس کی بات کاٹی۔
''بس تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ مولوی صاحب آتے ہی ہوں گے۔'' جیسے ہی اندر بیٹھے خالہ اور رضوان پر عالی کی نظر پڑی اس کا خون کھولنے لگا اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔
سب کے لٹکے ہوئے چہرے بتا رہے تھے کہ انہیں بھنک تو ہوگئی ہے اسے ایک عجیب سی خوشی

ہوئی ان کے چہرے دیکھ کر۔
''ارے واہ ابو! آپ نے نکاح پر خالہ کو بھی بلا لیا واہ جی واہ۔
وہ طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔
''اچھا ہے جتنے زیادہ گواہ ہوں ہے اتنا ہی اچھا ہے اچھا بھئی میں زرا فریش ہو جاؤ۔'' وہ کہہ کر اوپر چل پڑا۔
ودعیہ کو تیار کیا ہونا تھا نہا کر اس نے عام سے کپڑے پہن لیے اور چپ کر کے بیٹھ گئی دل تیز تیز دھڑک رہا تھا انے آنے عالی زندگی کا سوچ سوچ کر ہی اس کے پسینے چھوٹنے لگے تھے وہ بس خدا سے رحم مانگ رہی تھی۔
عالی تیار ہو کر نکلا تو دل نے خواہش کی کہ ایک دفعہ ودعیہ سے مل لے وہ بڑھا مگر کچھ سوچ کر رک گیا اور نیچے آ گیا۔
ابو مولوی آ گئے کیا؟ وہ تک سک تیار ہو کر نیچے آ گیا۔
سفید شلوا قمیض میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ نائلہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے دل میں اتارا۔
''ہاں بیٹا آ گئے تم چلو تم تیار ہو۔'' انہوں نے خوشی سے کہا وہ آج خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔
''تم اپنے دوست وغیرہ کو بلانا چاہو تو۔''
وقار صاحب بولے۔
''نہیں ابو بس گواہ ہونے چاہیے۔'' وہ لاؤنج میں سیڑھیوں کے قریب کھڑے ہی باتیں کر رہے تھے۔
لڑکا کون ہے رقیہ بیگم کا صبر کا پیمانہ آخر لبریز ہوا۔
امی لڑکا آپ کے سامنے ہی تو ہے۔'' عالی خوش ہو کر بولا۔

رقیہ بیگم نا سمجھنے والے انداز میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔
کہاں ہے وہ لڑکا مجھے تو بس گھر والے ہی دکھ رہے ہیں وہ قدرے حیرانی سے بولیں۔
ابو چلیں نا اندر مولوی صاحب بلا رہے ہیں۔'' ولی آ کر بولا۔
''لڑکا ابھی تک نہیں آیا تو اسے تو بلائیں۔ وہ پریشان تھا۔
عالی نے تلے قدم چل کر رقیہ بیگم کے سامنے آیا۔
''امی آج آپ مجھے مبارک باد دیں اج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔'' عالی خوشی سے بولا۔
وہ اب بھی حیران و پریشان تھیں۔
''کیا سب پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ ودعیہ کا نکاح کس سے کر رہے ہو۔''
وہ اب چڑ گئیں تھیں۔
''امی ودعیہ کا نکاح عالی وقار سے ہے۔''
عالی پر جوش تھا۔
کیا تم کر رہے ہو اس بدکردار لڑکی سے نکاح ان کی آواز بے حد بلند تھی۔
''جی امی میں کر رہا ہوں اپنی مرضی سے کر رہا ہوں۔'' عالی کے ٹھہراؤ میں کوئی فرق نہیں آیا وہ اسی ہنگامے کی امید کر رہا تھا سب کا رنگ اڑ گیا خصوصاً نائلہ کا چہرہ تو اتر ہی گیا۔
''ہرگز نہیں میں تجھے تیری زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی چل توں میرے ساتھ۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔
''نہیں امی میں اپنی زندگی برباد نہیں کر رہا بلکہ یہ مجھے لگتا ہے میری زندگی کا بہترین فیصلہ ہے۔''
''عالی تو سمجھ نہیں رہا وہ منحوس لڑکی پہلے ماں باپ کو نگل گئی پھر تیری دادی کو نگل گئی اور اب وہ

تیری زندگی بھی کھا جائے گی تو سمجھ نہیں رہا ہے۔"
وہ چلا رہی تھیں۔
کمرے میں ودعیہ کو آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔اس کے دل میں جو عالی بھائی کو لے کر تھوڑا بہت خیال بھی تھا کہ وہ اچھے ہیں وہ پختہ ہو رہا تھا۔
"امی نہ تو وہ منحوس ہے نہ ہی اس کی وجہ سے کوئی مرا ہے۔یہ سب باتیں جنہوں نے آپ کے دماغ میں ڈالیں ہیں ناں (وہ خالہ کو دیکھ کر بولا) وہ شاید بھول گئے ہیں کہ زندگی کا مالک تو وہ ذات ہے جو عرش پر ہے وہ جب چاہے روح کی ڈور زندگی کی پتنگ سے کاٹ سکتا ہے نہ اس میں کسی کی مرضی ہے اور نہ ہی کوئی کچھ کر سکتا ہے۔"
وہ تحمل سے رقیہ بیگم کو سمجھا رہا تھا۔
وہ چلا رہی تھیں کہ ودعیہ نے کوئی جادو کر دیا ہے فلاں فلاں کا اور بھی بہت کچھ مگر عالی نے کان نہیں دھرے اور چپ چاپ ڈرائنگ روم میں چلا گیا وہ جانتا تھا کہ اس وقت انہیں سمجھانا بالکل بے کار ہے۔
عجیب ہنگامے کے دوران نکاح ہوا تھا۔
رقیہ بیگم کا غم و اشتعال کے مارے برا حال تھا۔ولی کوشش کر رہا تھا کہ ان کی طبیعت نہ بگڑے غصے کے مارے ان کا بی پی ایک دم ہائی ہو گیا تھا۔جس کی وجہ سے ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ بڑی مشکلوں سے انہیں دوائی کھلانے میں کامیاب ہوا تھا۔
"تم اور بنا لو اپنے پلان، سب پر پانی پھر گیا۔" نائلہ رو رہی تھی اور غصے میں شائلہ کو کوس رہی تھی۔
"مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہا کہ آ کر ہوا کیا ہے یہ سب میرا تو اپنا دماغ کام نہیں کر رہا۔ ودعیہ کی شادی ہوئی تو ٹھیک تھا مگر عالی نے کی یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔" وہ خود سر پکڑے بیٹھی تھی۔
"آہائے سارے ارمانوں پر پانی پھیر دیا بھائی صاحب نے میں نے کتنا سوچا تھا کہ عالی کو نائلہ کی شادی کراؤں گی اور اس لڑکی کو بہو بنا کر اس کی جائیداد پر راج کروں گی مگر یہ تو آوا کا آوا ہی پلٹ گیا۔
وہ تینوں شائلہ کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔
ذکیہ بیگم اور شائلہ اپنی بھڑاس نکال رہی تھیں اور نائلہ عالی کے نکاح پر آنسو بہا رہی تھی۔
اچھا اب بس کرو رونا دھونا ابھی صرف نکاح ہوا ہے ناں۔شائلہ، نائلہ کے سوں،سوں سے تنگ آ کر بولی۔ جو ایک کے بعد ایک ٹشو ناک پونچھ کر گرا رہی تھی۔
"تم بس میری ایک بات پلو سے باندھ لو تم عالی کا پیچھا نہ چھوڑنا۔ اس کے پیچھے ہی لگی رہنا اپنی اداؤں کے جال میں اسے پھنساؤ۔ پھر یہ ودعیہ کا قصہ بھی ختم کر دیں گے۔" شائلہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔
"لو بھلا اب کیا فائدہ۔" نائلہ ناک صاف کر کے بولی۔
"فائدہ ہی فائدہ ہے۔جذبات میں آ کر عالی نے فیصلہ کیا ہے؟ ودعیہ سے اس کی ویسے بھی کبھی نہیں بنی اب میں اس کا جینا اور بھی دشوار کر دوں گی کہ اب کہ واقعی وہ بھاگ جائے۔ شائلہ نے اسے اپنے آنے والے ارادوں سے با خبر کیا۔
اور رہی خالہ کی بات تو وہ تو ویسے ہی نفرت کرتیں ہیں اس سے۔

(اس دلچسپ ناولٹ کی اگلی قسط پڑھنا مت بھولیے گا)

جانو جرمن

جانو جرمن جو کوئی بھی تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ جب کبھی پڑھے لکھے لوگوں کا اس قسم کے لوگوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو مقابلہ ہمیشہ جانو جرمن ہی جیت جاتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مقابلے کے ریفری یا امپائر بھی اتفاق سے جانو جرمن کی......

یاد ش بخیر، یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب پی ٹی وی کے ڈراموں کا عروج تھا۔ یعنی المیہ ڈراموں کو دیکھ کر بندے کو رونا آ جاتا تھا اور کامیڈی ڈرامے دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آ جایا کرتی تھی۔ اب معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یعنی مزاحیہ ڈرامے دیکھ کر رونا آتا ہے اور سنجیدہ ڈرامے دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔

پاکستانی ڈراموں کے تنزل کی وجہ ہماری اپنی کوتاہیاں ہرگز نہیں ہیں۔ اس کی وجہ بھی حسب روایت ہنود اور یہود کی مشترکہ سازش ہے۔ کوتاہ نظر لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری پاک دامن خواتین اور نیک بیبیاں یہ ڈرامے اس لیے دیکھا کرتی ہیں کہ ان ڈراموں کی خواتین کے رنگ برنگے، جدید فیشن کے ملبوسات کا جائزہ لے سکیں اور پھر اسی قسم کے شوخ کپڑے سلوا کر اسے برقعے کے اندر زیب تن کر سکیں۔ جبکہ بدنظر لوگوں کو گمان ہے کہ ہمارے مرد حضرات میں ان ڈراموں کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے لیکن وہ ان جدید فیشن کے مختصر کپڑوں میں لپٹی لپٹائی خواتین کو دیکھ کر اپنے ذوقِ بصارت کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی حالت بھی انہی مولوی صاحب کی کیفیت کی مانند ہے کہ جو ٹی وی پر فیشن شو کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ایک عقیدت مند نے جب یہ دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا اور پوچھ لیا کہ مولانا آپ بھی اس قسم کے پروگرام دیکھتے ہیں؟

اس پر مولانا صاحب نے فرمایا۔

"قسم خدا کی نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں۔"

خیر آمدم بر سر مطلب، ہم یہ بتا رہے تھے کہ جن دنوں پی ٹی وی کے ڈراموں کا عروج تھا۔ ان دنوں ایک سندھی سیریل ڈرامہ ٹی وی پر پیش کیا گیا۔ یہ ڈرامہ اس قدر مقبول ہوا کہ بعد میں اسے اردو میں بھی پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے میں ایک بے حد مزیدار کردار ہوا کرتا تھا اس کردار کا نام جانو جرمن تھا۔

صاحب کیا جاندار اور حقیقی کردار تھا۔ تفصیل

اس کردار کی یہ ہے کہ ایک گاؤں میں ایک صاحب جانو جرمن کے نام سے مشہور ہوتے ہیں۔ ہر وقت انگریزی کپڑے اور ہیٹ وغیرہ پہنے رہتے ہیں اور اپنی ٹوٹی پھوٹی اور احمقانہ انگریزی کا رعب سب پر ڈالتے رہتے ہیں۔ اتفاق سے اسی گاؤں کا ایک شخص جو واقعی تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ ولایت سے گاؤں لوٹتا ہے۔ جانو جرمن جو اب تک اس گاؤں پر بلاشرکت غیرے اپنی انگریزی کا رعب جھاڑا کرتا تھا۔ اسے یوں لگا کہ اس کی مملکت میں کوئی دوسرا شخص گھس بیٹھا ہے۔ اور اس کی بالادستی کے لیے کھلا چیلنج ہے۔

یعنی جانو جرمن کی حالت بالکل ویسی ہی ہوگئی تھی کہ جیسی کچھ لوگوں کی مملکت خداداد پاکستان میں جمہوریت کے آنے پر ہوجاتی ہے۔ یا پھر ان ساس صاحباؤں کی ہوجاتی ہے جب ان کی بہو ان کی مملکت کی راجدھانی یعنی کچن میں انٹری ڈالتی ہے۔ جانو جرمن خوانخواہ اس شریف اور تعلیم یافتہ شخص کے خلاف پروپیگنڈا مہم شروع کرتا ہے۔ بات جب بہت آگے بڑھ جاتی ہے تو گاؤں کی پنچائیت فیصلہ کرتی ہے کہ ان دونوں کی انگریزی دانی کا مقابلہ کرایا جائے۔ آخر ایک دن پنچائیت کے سرکردہ لوگوں کی موجودگی میں مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ صاحب کچھ جملے انگریزی کے ادا کرتے ہیں۔

اب جانو جرمن کی باری آتی ہے۔ وہ ون ٹو تھری سے ہنڈریڈ تک گنتی سنا دیتا ہے درمیان میں کہیں کہیں اسے بی سی ڈی اور چند انگریزی لفظ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کی غرض سے ڈال دیتا ہے۔ گاؤں کے لوگ جو خود انگریزی سے نابلند ہوتے ہیں وہ فیصلہ سناتے ہیں کہ اس پڑھے لکھے شخص نے اپنی انگریزی میں کچھ الفاظ دیسی زبان کے مثلاً ٹیبل، گلاس، جگ، کپ وغیرہ استعمال کیے ہیں۔ جو اردو کے الفاظ ہیں۔ جبکہ جانو جرمن نے ایک لفظ بھی اردو کا نہیں بولا۔ اس لیے پنچائیت جانو جرمن کو اس مقابلے کا فاتح قرار دیتی ہے۔

جانو جرمن جو کوئی بھی تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ جب کبھی پڑھے لکھے لوگوں کا اس قسم کے لوگوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو مقابلہ ہمیشہ جانو جرمن ہی جیت جاتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مقابلے کے ریفری یا امپائر بھی اتفاق سے جانو جرمن کی قسم کے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی اور انہونی بات بھی نہیں آپ نے اس دیہاتی کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جو عالموں کی ایک محفل میں پہنچ گیا تھا۔

اس محفل میں بڑی عالمانہ قسم کی گفتگو ہو رہی تھی جو اس دیہاتی کے سر سے یوں گزر رہی تھی کہ جیسے محترم مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں ہمارے سر سے گزر جاتی ہیں۔ دیہاتی کافی دیر تک یہ عالمانہ گفتگو سنتا رہا اور کڑھتا رہا کہ بے چارے کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ آخر وہ ضبط نہ کرسکا اور عالموں سے مخاطب ہوکر بولا۔

''حضرات! آپ یوں تو بڑے عالم فاضل بنتے ہو مگر ذرا میرے ایک سوال کا جواب دو تو مانوں؟''

عالموں نے کہا۔ ''اے شخص پوچھ، کیا پوچھتا ہے؟'' دیہاتی اٹھا اور زمین پر انگلی سے ایک لمبی بل کھاتی ہوئی لکیر بنائی اور پوچھا۔

''بتاؤ تو بھلا یہ کیا ہے؟''

عالموں کی ٹیم رویت ہلال کمیٹی والوں کی طرح دم سادھے دیر تک غور کرتی رہی۔ لکیر کو ہر زاویے سے خوب غور سے اسی باریک بینی سے

دیکھا گیا کہ جس طرح سنسر بورڈ والے کسی فلم کے قابلِ اعتراض منظر کو دیکھتے ہیں۔ کافی دیر کے بعد انہوں نے متفقہ طور پر بیان دیا کہ یہ ایک خط منحنی ہے۔ دیہاتی ان کی بات سن کر زور زور سے ہنسنے لگا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''لو جی بڑے عالم بنتے پھرتے ہیں آپ۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ یہ ایک بیل ہے جو پیشاب کرتا ہوا جا رہا ہے۔''

اب تمام عالم سناٹے میں آ گئے۔ کئی ایک پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا اور ایک آدھ غیرت مند تو بیچارہ غش کھا کر گر گیا۔ اِدھر دیہاتی اٹھا، کپڑے جھاڑے اور جاتے ہوئے بولا۔

''اونہہ...... بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور اتنا نہیں جانتے۔'' دیکھا آپ نے جانو جرمن کیا چیز ہوتے ہیں اور کیسے جیت جاتے ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے عرصے تک جانو جرمنوں کے متعلق کچھ پتا نہ تھا۔ ایک بار کسی رشتے دار کے ہاں ایک تقریب میں گیا وہاں گفتگو ہو رہی تھی کہ یرقان جھڑوانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے اس بارے میں سوال کیا تو میں نے طبی نقطۂ نظر سے انہیں بتایا کہ عموماً یرقان فزیولوجیکل ہوتا ہے اور چند دنوں میں بغیر کسی دوائی کے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جھاڑ پھونک محض تضیع اوقات ہے۔

میرا یہ کہنا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ اب جو چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہوئے تو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ دل برداشتہ ہو کر جب گھر پہنچا تو بیگم میری اتری ہوئی شکل دیکھ کر بولیں۔

''خیر تو ہے؟'' میں نے انہیں سارا ماجرا سنایا تو کہنے لگیں۔

''غلطی آپ ہی کی ہے۔ آپ کو جانو جرمنوں سے اُلجھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''جانو جرمن؟'' میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔ یہ نام میں نے پہلی بار سنا تھا۔

''ہاں! جانو جرمن۔'' بیگم مسکرا کر بولیں۔

''آج کل ٹی وی پر ایک ڈرامہ آ رہا ہے، اس کا ایک کردار ہے۔'' پھر بیگم نے تفصیلی طور پر اس کردار کے متعلق بتایا تو مجھے بھی تجسس ہوا کہ دیکھوں تو سہی کہ کیا ماجرا ہے؟ بہرحال ڈرامہ دیکھا اور جانو جرمن کا کردار بے حد پسند آیا۔ اب جو اردگرد نظر دوڑائی تو معاشرے میں جانو جرمنوں کی بھرمار نظر آئی۔

کچھ عرصہ قبل ہم نے اپنے ڈرائنگ روم کے لیے ایرانی قالین خریدا کہ چلو اس پر بیٹھ کر خیام کی رباعیاں پڑھیں گے کہ شاید جلدی سمجھ میں آ جائیں گی۔ ہماری ایک رشتہ دار خاتون آئیں تو انہوں نے قالین کی قیمت پوچھی۔

ہم نے انہیں بتایا کہ بھئی ہم نے یہ قالین اس قیمت پر فلاں دکان سے خریدا ہے۔ وہ خاتون پٹ سے بولیں۔

''بھیا...... یہ کارپیٹ تھوڑی ہے۔ یہ تو قالین ہے۔'' کہاں تو ہم نے اس قالین یا کم بخت کارپیٹ پر بیٹھ کر قہوہ پیتے ہوئے خیام کی رباعیاں پڑھنے کا پروگرام بنایا تھا اور کہاں یہ حال کہ خاتون رشتہ دار کے اعتراض کے بعد انگریزی تو انگریزی اردو بھی ہاتھ سے جاتی نظر آنے لگی۔

کچھ عرصے بعد ہم نے اس قالین یا کارپیٹ جو کچھ بھی تھا اس سے بددل ہو کر اسے دوسرے کمرے میں ڈلوا دیا اور ڈرائنگ روم کے لیے ایک عمدہ اور دبیز سنتھٹک کارپٹ بمع انڈر لے

کے خرید لایا۔ شومئی قسمت وہی خاتون رشتہ دار شاید یہ سن گن ملنے پر کہ ہم نے کارپیٹ خریدا ہے، ہماری خبر لینے تشریف لے آئیں۔ اس بار انہوں نے پھر اس نئے کارپیٹ کی قیمت پوچھی۔

ہم نے کہا۔ ''جی یہ قالین ہم نے فلاح دکان سے فلاں قیمت پر خریدا ہے۔ اس کی رسید بھی ہے کہیں تو لا کر دکھاؤں۔'' کہنے لگیں۔

''بھائی رسید دیکھ کر مجھے کیا کرنا ہے۔ کون سا میرا تعلق انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ لیکن بھیا، جسے آپ قالین کہہ رہے ہیں وہ قالین نہیں کارپیٹ ہے۔''

زندگی میں پہلی بار اپنی کم عملی پر اس قدر افسوس ہوا کہ جی چاہا کپڑے پھاڑنے کی بجائے اس قالین یا کارپیٹ کو پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جنگل میں بھاگ جاؤں۔ اپنی انگریزی سے تو خیر میں خود مطمئن تھا اور انگریز دشمنی میں اکثر اس کا حشر نشر کر دیا کرتا تھا۔ مگر اب اردو پر بھی فاتحہ پڑھنے کا جی چاہنے لگا۔ اِدھر عمر خیام کے بعد کیٹس اور اختر شیرانی بھی منہ بسورتے نظر آنے لگے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کالم کارپیٹ پر بیٹھ کر اور افسانے قالین پر بیٹھ کر لکھتا ہوں۔ پیزا اور بروسٹ کارپیٹ پر بیٹھ کر اور نہاری، بریانی، قورمہ قالین پر بیٹھ کر کھاتا ہوں۔

کارپیٹ اور قالین کا تفصیلی ذکر کرنے ک ایک ضمنی مقصد یہ بھی ہے کہ ہمارے پڑھنے والوں پر ذرا رعب جم سکے اور انہیں پتہ چل جائے کہ ان کا ہر دلعزیز ادیب کوئی عام غریب لکھاری نہیں بلکہ اچھی حیثیت کا مالک ہے۔ ویسے تو ہم کسرِ نفسی سے کام چلاتے رہتے ہیں لیکن اس بار بھرم بازی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کچھ عرصہ قبل ہم پروفیسر بریانی کے گھر ان سے ملنے گئے تو ان کا باورچی ہمارا اخباری کالم پڑھ کر خوب ہنس رہا تھا۔ ہم نے یوں ہی تذکرتا پروفیسر بریانی سے کہہ دیا کہ بھئی آپ کا باورچی تو کافی پڑھا لکھا دکھائی دیتا ہے۔

اس پر پروفیسر بریانی نے بتایا کہ ان کا باورچی تو بالکل اَن پڑھ ہے۔ ہم نے کہا۔

''لیکن میں نے خود ابھی اسے میرا کالم پڑھ کر ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔'' اس پر پروفیسر بریانی نے اک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی وہ تمہاری تصویر دیکھ کر ہنس رہا ہوگا۔''

اب بھلا آپ ہی بتائیں۔ لکھنے والے کی تحریر کا اس کی تصویر سے کیا واسطہ۔ لکھنے والا شکل سے نہیں عقل سے لکھتا ہے۔ پھر بھی اگر تصویر سے ہی کسی کی تحریر کا معیار مقرر کیا جائے تو ہم بہت سے دیگر لکھنے والوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ اگر میرے بیان کو خود پسندی کے زمرے میں شمار نہ کیا جائے تو کئی شاعروں، ادیبوں کے مقابلے میں ہم شہزادہ گلفام ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی جانو جرمنوں کی ایک بار بلدیاتی انتخابات میں ہمارے ہاں ایک ایسے صاحب کھڑے ہو گئے کہ جنہیں دستخط کرنے تک نہیں آتے تھے۔ دستخط کی جگہ انگوٹھے سے ہی کام لیتے تھے۔ ایک بار تو جوش میں آ کر پاؤں کے انگوٹھے کے نشان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ انتخابی جلسے میں کسی نے شکایت کی کہ جناب ہمارے علاقے میں میٹرنٹی ہوم نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ انہیں عوام کی مشکلات کا علم ہے۔ اگر انہیں کامیاب کرا دیا جائے تو وہ ایک نہیں دو میٹرنٹی ہوم بنوا دیں گے۔ عورتوں کے لیے الگ اور مردوں کے لیے الگ۔ بات یہ نہیں کہ ان کی

اس جاہلانہ بات پر عوام نے انہیں رد کر دیا اور ان کی ضمانت تک ضبط کرادی۔ مقام گریہ یہ ہے کہ وہ صاحب اچھے خاصے ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے۔

جس ملک میں جانو جرمن اس قدر اکثریت میں ہوں وہاں جانو جرمن ہی جیت سکتے ہیں۔ قومی اسمبلی کے امیدوار ایک مشہور و معروف مولوی صاحب سے جب یہ سوال کیا گیا کہ صاحب آئین اور قانون میں کیا فرق ہے تو مولانا نے حلق سے معرب آواز نکال کر کہا۔

''میاں آئین آئین ہوتا ہے اور قانون قانون ہوتا ہے۔''

وہ صاحب منہ دیکھتے رہ گئے۔ نہ ہوئی ان کے پاس بندوق ورنہ مولانا کو دکھا کر کہتے۔

''ٹو پک زمہ قانون۔'' پھر مولانا کو پتا چلا کہ قانون کیا ہوتا ہے اور آئین کیا ہوتا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پیارے ملک میں جانو جرمن تھوک کے حساب سے پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں نظر بددور جمہوری نظام ہے۔ مانا کہ جمہوری نظام بہت اچھا نظام ہے مگر ستم اس میں یہ ہے کہ اس نظام میں بندے گنے جاتے ہیں تولے نہیں جاتے۔

یونیورسٹی کے پروفیسر کا عالم فاضل دانشور کا بھی ایک ووٹ ہوتا ہے اور شرابی، کبابی، جواری، ہیروئنچی کا بھی ایک ووٹ ہوتا ہے۔ عقلمند انسان کا بھی ایک اور ذہنی پس ماندہ کا بھی ایک ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملک بھر کے جانو جرمن مل کر اپنے ہی جیسے کسی جانو جرمن کو جتوا دیتے ہیں۔ بندہ بھاری مینڈیٹ لے کر اسمبلی میں جا پہنچتا ہے۔ اسمبلی میں ملک بھر سے آئے جانو جرمن مل کر گل کھلاتے ہیں اور اپنے سے بھی بڑھ کر کسی جانو جرمن کو ملک کا سربراہ بنا دیتے ہیں۔ کتنی سچی بات ہے کہ جیسی عوام ہوگی ویسے ہی حکمران ہوں گے۔

کہتے ہیں کسی ملک میں بادشاہ کو خبر دی گئی کہ چند ہی ہفتوں بعد ملک کے دریاؤں میں ایسا پانی آنے والا ہے کہ جسے پیتے ہی بندہ پاگل اور احمق ہو جائے گا۔ بادشاہ اور وزیروں نے اپنے لیے پانی کا ذخیرہ کر لیا کہ اس زمانے میں فرانس سے منرل واٹر منگوانے کا رواج نہیں تھا۔

چند ہفتوں بعد جب پاگل کر دینے والا پانی دریاؤں میں پہنچا تو عوام اسے پی کر پاگل ہو گئی اور پاگل پن کا مظاہرہ کرنے لگی۔ بادشاہ اور وزیروں کے دانش مندانہ اور عقل مندی والے فیصلے سن کر عوام پاگلوں کی طرح ہنستی اور ان کا مضحکہ اڑاتی کہ بادشاہ اور وزیر کیسے اوٹ پٹانگ فیصلے کرتے ہیں۔

ملک بھر میں انارکی پھیلنے لگی اور نظامِ حکومت ٹھپ ہو کر رہ گیا کہ حکومتی اہلکار بھی دریاؤں کا پانی پی کر پاگل ہو گئے تھے۔ بادشاہ اور اس کے مصاحب اس صورتِ حال سے پریشان ہو گئے۔

آخر ایک گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔

جس میں ایک سیانے وزیر نے مشورہ دیا کہ عوام جو پانی پی رہی ہے وہی پانی بادشاہ اور وزیر بھی پی لیں۔

یہ مشورہ پسند کیا گیا اور فی الفور اس پر عمل کیا گیا۔ اب تو بادشاہ اور وزیر بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ بس اب کیا تھا عوام کو بادشاہ اور وزیر کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں اور ملک میں امن وامان بحال ہو گیا۔

یہ جانو جرمن بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

ایسے ایسے پہلو سے حملہ آور ہوتے ہیں کہ بندہ سر کھجاتا رہ جائے۔ کہتے ہیں جتنے وقت میں ایک عالم فاضل تیار ہوتا ہے اتنی ہی دیر میں ہزاروں جانو جرمن جنم لے چکے ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر وقت جانو جرمنوں کی اکثریت رہتی ہے۔ یقین نہ آئے تو اسمبلی ہال میں جاکر خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ تمام جانو جرمن ایک دوسرے کو گلے لگاتے ہیں اور قوم کو چونا لگاتے ہیں۔

بندہ لاکھ کوشش کرے، بُری گھڑی اور جانو جرمن اسے کہیں نہ کہیں تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ خود میرا معاملہ دیکھیے کہ لاکھ کوشش کے باوجود کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی جانو جرمن کے ہتھے چڑھ جاتا ہوں۔

کچھ عرصہ قبل کی بات ہے کہ ایک صاحبزادی کے نکاح کے سلسلے میں مجھ غریب کو دلہن کا وکیل مقرر کیا گیا۔ نکاح والے دن سے دو تین روز پہلے مجھے اس دلہن سے اقرارِ نکاح کروانا تھا۔ خیر گواہان کی موجودگی میں دلہن سے نکاح فارم پر دستخط کروائے گئے۔ مہر کی رقم ادا کی گئی اور میں نے دلہن سے اس کی رضامندی پوچھی۔

بس اتنی سی بات تھی۔ مگر مجھے پتا نہ تھا کہ اس سادہ سی بات میں بھی کوئی جانو جرمن کیڑے نکال سکتا ہے۔ اگلے روز دلہن اور دلہا کے والد صاحبان پریشان حال میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جناب معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔

آپ نے دلہن سے صرف ایک بار اقرار کروایا ہے۔ یہ تو نکاح غلط ہو گیا۔ آپ کو تین بار اقرار کروانا چاہیے۔

یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میرے تصور میں ایک جانو جرمن دانت نکالے میری طرف ہنستا ہوا دکھائی دیا۔

''جانو جرمن!'' میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ یقیناً یہ کسی جانو جرمن کی شرارت ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ لیکن جانو جرمن نے شکوک و شبہات کا بیج بو دیا ہے۔

مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ یہ جانو جرمن کون ذات شریف ہیں لیکن میں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔ اور ان سے کہا کہ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

آیئے گواہوں کی موجودگی میں ایک بار پھر دلہن سے اقرار کروا لیتے ہیں۔

خیر ایک بار پھر تمام گواہان کی موجودگی میں گن گن کر تین بار دلہن سے اجازت لی گئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

لیکن جب نکاح والے دن مسجد میں مولوی صاحب نے بھی دلہا سے صرف ایک بار اقرار کروایا تو میں نے جانو جرمن صاحب کو جا پکڑا اور اپنی دانست میں انہیں چاروں شانے چت کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے دیکھا مولوی صاحب نے بھی صرف ایک بار اقرار کروایا ہے۔''

جانو جرمن ناک نکوستے ہوئے بولا۔

''تو کیا ہوا۔ وہ مولوی صاحب ہیں ایسا کر سکتے ہیں آپ تو مولوی نہیں ہیں۔ آپ کو تین بار ہی پوچھنا چاہیے تھا۔''

یہ جواب سن کر میں سچ پوچھو تو چکرا کر رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جانو جرمن اس قسم کی بودی دلیل سے مجھے لاجواب کر دے گا۔ وہ دن، آج کا دن، جیسے ہی مجھے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ میرا مخاطب جانو جرمن ہے۔ میں چپ سادھ لیتا ہوں کیونکہ جانو جرمن سے جیت جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

☆☆......☆☆

مِنی اسکرین

م ش خ

ناظرین ہم آپ کے بہت مشکور ہیں کہ گزشتہ دنوں آپ حضرات نے ہمارے صبح کو نشر ہونے والے پروگراموں میں اپنی پسند اور محبت کا اظہار کیا ہم خلوص دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ARY ڈیجیٹل کے سوپ "موہے پیا رنگ لاگا" میں بلال قریشی اور عروسہ قریشی

دعائیں قبول کرنے والا تو صرف اُس کی ذات ہے جس کی ہم اور آپ عبادت کرتے ہیں۔ ناظرین آپ کے انمول خزانے پیغامات کی صورت میں اکثر ہم ARY کے پروگراموں میں دیکھتے ہیں تو ہمیں حوصلہ ملتا ہے اوپر والے کی ذات آپ کو سلامت صحت کے ساتھ رکھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈیجیٹل اور زندگی کے پروگراموں نے خوبصورتی کے رنگ جمادیے انسان کا رنگ اچھا ہونا چاہیے وہ رنگ ایمان کا ہو ضمیر کا ہو، حوصلے کا ہو یا تعریف کا ہو • اُس کا اپنا ہی ایک خوبصورت رنگ ہوتا ہے اور ایسے خوبصورت رنگ ہمیشہ چمکتے رہتے ہیں اور ناظرین یہ آپ کے دیے ہوئے رنگ ہی تو ہیں جو ہمارے حوصلے اور محنت میں حقیقی رنگ بھرتے ہیں۔ ناظرین ہم پروگرام پیش کرنے کے بعد شدت سے آپ کی رائے کے منتظر رہتے ہیں اور آپ حضرات کے دیے ہوئے حوصلوں سے ہم بہت مطمئن ہوجاتے ہیں کیونکہ ہمارے اردگرد تو جیتی جاگتی کئی مثالیں ہیں یقیناً ہے کہ ہم سے غلطیاں بھی ہوجاتی ہوں گی مگر چھوٹی غلطی پر خاک ڈال کر ہم پھر نئے سرے سے آپ لوگوں کے لیے بہتر پروگرام تیار کرتے ہیں۔

محبتوں میں خطائیں تو ہو ہی جاتی ہیں
محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا

اس دفعہ ARY ڈیجیٹل اور ARY زندگی لایا ہے آپ کے لیے خوبصورت پروگرام آیئے اب چلتے ہیں پروگراموں کی طرف سب سے پہلے ڈیجیٹل سے پیش ہونے والے پروگرام آپ کو بتاتے چلیں ڈیجیٹل سے آن ایئر ہونے والی سیریل دو بھائی مجاہد تاج اور ساجد تاج کی کہانی ہے۔ مجاہد تاج کی دو بیٹیاں ہیں اور وہ ان سے بہت پیار کرتے ہیں ان کے گھرانوں میں برادری سے باہر رشتے طے نہیں کیے جاتے ہیں اور نہ ان کے

گھرانوں کی لڑکیاں آزادی پر یقین رکھتی ہیں۔ مائدہ ایک خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی ہے اُس کی والدہ اُس کی شادی کے لیے پریشان ہیں جبکہ مائدہ کی خوبصورتی کی وجہ سے اُس کے برادری سے باہر کے رشتے آتے ہیں جاذب ایک خوبصورت لڑکا ہے وہ اس سیریل میں خوبصورت کردار ادا کررہا ہے وہ مائدہ کو پسند بھی کرتا ہے مگر جاذب کا تعلق مائدہ کے خاندان سے نہیں ہے اور یوں یہ شادی رُک جاتی ہے کیا جاذب مائدہ کو حاصل کرنے میں کامیاب

یہ سیریل ہر جمعرات کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی۔ سیریل ''میرا یار ملا دے'' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس میں خوف نام کی کوئی چیز نہیں ہے اس لڑکی کا والد شعبہ تعلیم سے وابستہ ہے۔ پورا محلّہ ان کی عزت کرتا ہے جبکہ اس لڑکی کی چھوٹی بہن اتنی سیدھی سادھی ہے کہ دروازے کی آہٹ سے بھی گھبرا جاتی ہے سیریل کے ہدایت کار انجم شہزاد ہیں۔ اس سیریل کے فنکاروں میں فیصل قریشی، سجل علی، ریحام، عائشہ خان

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''تم یاد آئے'' میں ثانیہ سعید، سحر افضل اور فلم اسٹار ندیم

ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب تو سیریل ''اب کر میری رفوگری'' دیکھنے کے بعد ہی ملے گا اس سیریل کو تحریر کیا ہے سائرہ رضا نے ہدایت عدنان قریشی کی ہیں اس کے فنکاروں میں اُشنا شاہ، دانیال راحیل، نازیہ ممتاز، ماریہ انصاری، ہاشم بٹ، شکیل یوسف، ماریہ سیٹھی، عثمان پیرزادہ اور سکینہ سموں قابل ذکر ہیں۔

نیر سلیم مواج قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ARY ڈیجیٹل سے ہر پیر کی رات 8 بجے دکھائی جائے گی۔ سیریل 'تم یاد آئے' کا مرکزی کردار یوسف کا مدار کررہے ہیں جو ایک معروف قانون دان ہیں۔ یوسف نے دوسری شادی مہتاب سے کی تھی۔ مہتاب کے پہلے شوہر سے اُن کی ایک بیٹی ذینی ہے

جبکہ یوسف اپنی بیوی مہتاب سے 20 برس بڑے ہیں جبکہ یوسف کے اپنے دو بچے ہیں جن میں بیٹی

ARY ڈیجیٹل کی سیریل "اب کر میری رفوگری" میں عشا شاہ اور مریم انصاری

شیری اور بیٹا نگار ہے۔ یوسف کی دوسری بیوی کی بیٹی ذینی کو اُس کی قابلیت کی وجہ سے یوسف بہت مانتے ہیں۔ ذینی کے روشن مستقبل کے لیے یوسف اپنے نواسے ساحر سے اُس کی منگنی کر دیتے ہیں۔ یہاں سے اختلافات کا آغاز ہوتا ہے اور پھر یہ اختلافات کہاں رکتے ہیں اس کا جواب تو سیریل دیکھنے کے بعد ہی ملے گا اس کے ہدایت کار عباس رضا جبکہ اس سیریل کو تحریر کیا ہے نائلہ انصاری نے سیریل 'تم یاد آئے' ہر جمعرات کی رات 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی اس کے فنکاروں میں ثانیہ سعید' شیری افضل' آغا علی' ارم اختر' عمر سلطان' عاصم اظہر' عذرا منصور اور اداکار ندیم قابل ذکر ہیں اور آیئے اب چلتے ہیں ڈیجیٹل کے سوپ کی طرف سوپ' شہزادہ سلیم' میں مرکزی کردار معشوق علی کا ہے جو ایک شوقین مزاج غیر ذمے دار انسان ہیں جنہیں کبوتر بازی کا بہت شوق ہے جبکہ گلشن آرا یہ معشوق علی کی بیوی ہیں جو چھ بچوں کی ماں ہیں ان میں اور معشوق علی میں زبردست نوک جھونک کا سلسلہ جاری رہتا ہے جبکہ معشوق علی کا بیٹا شہزادہ سلیم تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ یہ موٹا' کالا' بے ڈھنگا اور پان کا عادی لڑکا ہے جس کی شادی حسین اور کم عمر لڑکی سے ہوتی ہے اس کی شادی شازیہ سے ہوئی جو ایک یتیم لڑکی ہے اپنے کزن کو پسند کرتی تھی۔ مگر شادی شہزادہ سلیم سے ہوگئی اب ان تینوں میں کیا نئے نئے ڈرامے ہوتے ہیں جن میں معشوق علی اُن کی بیوی اور شہزادہ سلیم قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک ARY ڈیجیٹل سے رات ساڑھے دس بجے دکھایا جائے گا۔ اس کے فنکاروں میں قوی خان' افشاں قریشی' عامر قریشی' ایمان خان اور دیگر شامل ہیں۔

سوپ 'موہے پیا رنگ لاگے' اس کہانی دو ایسے گھرانوں کی ہے جو ایک دوسرے پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ سکندر گھر میں سب سے چھوٹا ہے اس کی

ARY ڈیجیٹل کی سوپ "شہزادہ سلیم" میں ایمن

شادی نورین سے ہو جاتی ہے اور پھر یہاں سے گڑبڑ شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے مختلف کردار ہیں جن میں بھابیاں، بڑے بھائی، بہنیں، بہنویوں کے دوران کھیل تماشے مختلف ایشوز پر ہوتے رہتے ہیں اس کے فنکاروں میں بلال قریشی' عروسا قریشی' اختر حسین' ذیبا شہناز' ریچا علی' کائنات کاظمی' صدف احسن' پرواشا ابرار' بشریٰ خان' صبا خان' ریحان سعید اور دیگر شامل ہیں۔ سوپ 'موہے پیا رنگ' پیر سے لے کر جمعرات تک رات 10 بجے دکھایا جائے گا۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

اے پروردگار

مجھے وہ طاقت نہ دے جس سے میں دوسروں کو کمزور کروں۔ مجھے وہ دولت نہ دے جس کی خاطر میں دوسروں کو غریب سمجھوں۔ مجھے وہ علم نہ دے جسے میں اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں۔ مجھے وہ بلندی نہ دے کہ مجھے پستی دکھائی نہ دے۔ مجھے وہ سب دے جو میں دوسروں میں بانٹ سکوں۔

افشاں۔U.K

قول حضرت علیؓ

مشکل میں کبھی بزدل سے مشورہ مت کرنا کیونکہ وہ تمہاری بچی ہوئی ہمت کو بھی ختم کردے گا۔

قبرستان ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ دنیا ان کے بغیر نہیں چل سکتی۔

جو تمہاری خاموشی سے تمہاری تکلیف کا اندازہ نہ کر سکے اس کے سامنے زبان سے اظہار کرنا صرف لفظوں کو ضائع کرنا ہے۔

رضوانہ پرنس

دنیا

☆......دنیا کا خوبصورت ترین لفظ (اللہ)

☆......دنیا کا میٹھا ترین نام (محمدؐ)

☆......دنیا کی مکمل ترین کتاب (قرآن)

☆......دنیا کی مکمل ترین ورزش (نماز)

☆......دنیا کا خوبصورت ترین پیغام (اذان)

☆......دنیا کا خوش نصیب انسان آپ

سلمٰی۔بحرین

شعر

اگر یونہی خامیاں نکالتے رہے لوگ
تو اِک دن خوبیاں رہ جائیں گی مجھ میں

سعدیہ سیٹھی

بڑھاپا

گاؤں میں ایک صاحب کا انتقال ہوگیا۔ایک صاحب اُن کے بیٹے سے تعزیت کرنے پہنچے اور پوچھا۔''مرحوم کو کیا بیماری تھی؟''

بیٹے نے جواب دیا۔''بڑھاپا خود ایک بیماری ہے۔''

وہ صاحب بولے۔''واقعی ہمارے گاؤں میں بھی دو تین بچے اسی بیماری سے فوت ہو چکے ہیں۔''

ریحانہ مجاہد۔کراچی

بچ مائی

ایک تانگے والے نے بڑھیا کو ٹکر ماردی تو سپاہی نے تانگے والے کو پکڑلیا اور اس سے پوچھا۔

''تم نے بڑھیا کو ٹکر کیوں ماری۔'' تانگے والا خاموش کھڑا رہا اس کو خاموش دیکھ کر بڑھیا بولی۔

''اب کیوں چپ ہے پہلے تو بڑا شور مچا رہا تھا

سچ مائی سچ مائی......"

عفر رضوی۔ U,K

باس

باس نے دفتر میں داخل ہونے کے بعد اپنے کمرے میں جانے کے بجائے دفتر کا معائنہ شروع کردیا۔ ایک صاحب بہت توجہ کے ساتھ کام کررہے تھے باس نے پوچھا۔
"تم کب سے یہاں کام کررہے ہو؟" وہ فوراً بولے۔
"جناب جب سے آپ کو اس طرف آتا دیکھا ہے۔"

رازعدن۔ بحرین

سنہری اقوال

اگر پہاڑ سرکانے کی خواہش ہے تو پہلے ذروں کو سرکانا سیکھو۔
ہنر انسان کا سب سے بڑا دوست ہے۔
جو ذرا سی بات پر دوست نہ رہے وہ دوست تھا ہی نہیں۔
اپنی ناکامی پر مسکراؤ تمہیں کامیابی ملے گی۔
روح کی گہرائی سے نکلی بات روح کی گہرائی تک ضرور جاتی ہے۔
اگر چاہتے ہو تمہارا نام باقی رہے تو اپنی اولاد کو اچھے اخلاق سکھاؤ۔
ایسی دولت قبول مت کرو جو تمہیں اپنوں سے دور کردے۔

ندیا مسعود۔ کراچی

پہلی کوشش

ایک سیاح کو افریقہ کے جنگل میں جنگلیوں نے پکڑ لیا۔ اور اس کو رسیوں سے باندھ کر اس کے گرد ناچنے لگے۔ سیاح نے اپنی جان بچانے کے لیے چیخ کر کہا۔
"میں جادو کرسکتا ہوں۔"
جنگلیوں نے کہا۔ "دکھاؤ ورنہ ہم تمہیں کھاجائیں گے۔" سیاح نے اپنی جیب سے لائٹر نکالا اور جلا دیا۔
تمام آدم خور رقص کرتے کرتے رک گئے اور حیرت اور خوف سے دیکھنے لگے۔ سیاح بولا۔
"دیکھا میرا جادو......" آدم خود بولے۔
"یہ تو واقعی میں جادو ہے زندگی میں پہلی بار لائٹر پہلی کوشش میں جلتے دیکھا۔"

مجید احمد۔ لاہور

خاندانی دشمنی

بیٹا باپ سے: "ابو جب آپ کلاس میں فیل ہوتے تھے تو دادا نے کیا کہا تھا؟"
باپ: "بیٹا انہوں نے مجھے بہت مارا تھا۔"
بیٹا: "اور جب وہ فیل ہوئے تھے تو......؟"
باپ: ان کے ابو نے انہیں مارا تھا۔"
بیٹا: "ابو میں چاہتا ہوں یہ خاندانی تشدد کا سلسلہ اب ختم ہوجائے۔"

گلناز۔ کراچی

اقبال کہتے ہیں

زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے

تہمینہ۔ کوئٹہ

انتخاب

کنفیوشس اپنے شاگرد کے ساتھ کسی جگہ سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔
"اے چین کے سب سے عقلمند انسان کچھ میرے بھی دکھ کا علاج بتا۔"

کنفیوشس نے اپنے شاگرد سے کہا۔
''اس عورت سے اس کا دکھ معلوم کرو۔''
عورت نے بتایا میرے بیٹے کو چیتا کھا گیا ہے اس سے پہلے یہی چیتا میرے شوہر اور بڑے بیٹے کو بھی کھا چکا ہے۔
کنفیوشس نے عورت سے کہا جب یہ چیتا تیرے گھر کے تمام افراد کو کھا چکا ہے تو تو یہ جگہ کیوں نہیں چھوڑ دیتی کہیں اور چلی جا۔
عورت نے کہا۔ میں نے کئی بار سوچا مگر یہ سوچ کر باز رہی کہ آج کل کے حکمران ظالم ہیں حکمرانوں کے مقابلے میں یہ درندہ پھر بھی غنیمت ہے کیونکہ یہ تو چیر پھاڑ کر کے مار دیتا ہے حکمران تو سسکا سسکا کر مارتے ہی۔ چین کا عالم کنفیوشس عورت کے جواب پر لاجواب ہوگیا۔

دانیال۔ کراچی

خوبصورت شعر

مجھے بھی لمحہ ہجرت نے کر دیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے' قدم سفر کی طرف

بتول۔ پنڈی

جانے کس راہ سے آجائے وہ آنے والا
میں نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے

فضا۔ کراچی

قلم ہے ہاتھوں میں خنجر کی کیا ضرورت ہے
پڑھا لکھا ہوں سلیقے سے قتل کرتا ہوں

راحیلہ۔ ملتان

گڑھے

استاد شاگرد سے: بتاؤ بہت سارے گڑھے اگر ایک ساتھ کسی جگہ پر ہوں تو اسے کیا کہتے ہیں؟''
شاگرد: ''سڑک......''

مستقیم۔ چکوال

ٹرین

اخباری نمائندے نے حادثے کے عینی شاہد سے سوال کیا۔
''یہ بتائیں پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تمام لوگ کیسے مر گئے؟''
عینی شاہد: ''اعلان ہوا کہ ٹرین پلیٹ فارم پر آرہی ہے یہ سننا تھا کہ تمام لوگوں نے ڈر کے مارے پٹری پر چھلانگ لگادی۔''
''پھر آپ کیسے بچ گئے؟'' نمائندے نے حیرت سے پوچھا۔
عینی شاہد: ''میں خودکشی کے ارادے سے پٹری پر لیٹا تھا یہ اعلان سنا تو جا کر پلیٹ فارم پر لیٹ گیا۔

تابش۔ پشاور

غزل

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا
دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نار سا پایا

(..................)

دروازہ

بڑے میاں کی وفات پر بڑی بی کے آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے۔ عورتوں کے تسلی دینے پر بڑی بی بولی۔
''اے بی بی میں تو اس لیے رو رہی ہوں کہ موت نے گھر کا دروازہ دیکھ لیا ہے۔''

افشاں۔ U.K

شادی

ایک ستر سالہ بوڑھے نے گھر میں یہ اعلان کر کے سنسنی پھیلادی کہ وہ بائیس سالہ دوشیزہ سے شادی کر رہا ہے۔ ان کا پوتا جو بیس سال کا تھا اس نے کہا۔

''دادا اس شادی کا انجام خطرناک ہوگا۔''

''مرتی ہے تو مر جائے میں دوسری شادی کرلوں گا۔''

دانیہ۔ لاہور

ہے نا عجیب بات

☆......صرف زمینڈک ہی ٹرا سکتے ہیں۔

☆......صرف نر لال بیگ (کاکروچ) ہی اڑ سکتے ہیں۔

☆......پرندوں میں سب سے زیادہ عمر گدھ کی ہوتی ہے۔

☆......بندر واحد جانور ہے جو مختلف رنگوں میں تمیز کرسکتا ہے۔

☆......روشنی صرف مادہ جگنو ہی دیتی ہے۔

☆......چمگادڑ کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔

☆......مکڑی کا جال صرف مکڑا بناتا ہے۔

☆......جھینگرا اپنے منہ سے شور نہیں مچاتے شور ان کے پیروں کی رگڑ سے پیدا ہوتا ہے۔

☆......کلوروفارم کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔

☆......مچھر کے بائیس دانت ہوتے ہیں۔

صبا دانش۔ کراچی

چینی کہاوت

اگر دل میں سچائی ہو تو کردار میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ اگر کردار میں حسن ہو تو گھر میں خوشگوار ماحول ہوگا اگر گھر میں خوشگوار ماحول ہو تو اس سے قوم میں تنظیم پیدا ہوگیا گر قوم میں تنظیم پیدا ہوگی تو ملک امن کا گہوارہ بن جائے گا۔

خضر فرحان صدیقی۔ کراچی

تین ادوار

زندگی میں تین مدارج آتے ہیں۔

1) آپ کو نیند کی ضرورت ہے مگر آپ سونا نہیں چاہتے۔

2) آپ سونا چاہتے ہیں مگر آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔

3) آپ سونا چاہتے ہیں آپ کے پاس وقت بھی ہے مگر آپ کو نیند نہیں آتی۔

مسز نگہت غفار۔ کراچی

بھابی

ایک پٹھان نے اپنی بھابی کو خوب مارا لوگوں نے پوچھا۔

''تم اپنی بھابی کو کیوں مار رہے ہو؟'' پٹھان بولا۔

''ہمارا بھابی اچھا عورت نہیں۔'' لوگوں نے پوچھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' پٹھان بولا۔

''او یارا! میں جس دوست سے بھی پوچھتا ہوں تم کس سے بات کر رہے ہو وہ کہتا ہے تیری بھابی ہے۔''

طاہر۔ میاں چنوں

پانچ نمازوں کا تحفہ

فجر: چہرے کا نور

ظہر: روزی میں برکت

عصر: بدن کی طاقت

مغرب: نیک اولاد

عشاء: پُرسکون نیند

منا اہل۔ گجرات

نئے لہجے نئی آوازیں

اک بار کہہ دو

تم ایک بار کہہ دو
مجھ بن ہو تم ادھورے
میں زندگی لٹا دوں، ہر غم گلے لگا لوں
جو ساتھ تم ہو میرے، میں دو جہاں بھلا دوں
رستے کے تیرے کانٹے
پلکوں سے میں سمیٹوں
ہر اشک تیرا جاناں!
پوروں پہ میں اٹھا لوں
بس ایک بار کہہ دو
مجھ بن ہو تم ادھورے

شاعرہ: عائشہ شفقت۔ ساہیوال

کچھ کہوں

جاں کی اماں پاؤں تو...... کچھ کہوں
اے صاحبو! میں سنی جاؤں تو کچھ کہوں
اس دور میں بھی جاری ہے حق و باطل کی جنگ
منصور ساجواں...... سولی چڑھاؤں تو کچھ کہوں
یکلخت ہے جگر میرا سینہ مادر کی طرح نگار
بچوں کو اپنے اور گنواؤں تو کچھ کہوں
اٹھتی ہے میری سمت جو ناراض سی نظر
خود کو کٹہرے میں بلاؤں تو کچھ کہوں

شاعرہ: مومنہ بتول۔ کراچی

پیار

سندر سپنا میرا تھا
اس میں عکس وہ تیرا تھا
جھیل سی گہری آنکھیں تھیں
چاند سا روشن چہرہ تھا
گال گلابوں جیسے تھے
اور کالے تل کا پہرا تھا
روئی روئی آنکھیں تھیں
اک آنسو پلکوں پہ ٹھہرا تھا
چاندنی جیسا روپ تھا اس کا
بالوں کا رنگ سنہرا تھا
جذبے دونوں کے سچے تھے
تو پیار کا رنگ بھی گہرا تھا

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی۔ لاہور

کیا یہ تم ہو......

اپنی ذات کے جنگل میں
اکیلے گھومتی ہوں میں
تیری یاد کی خوشبو سے
اپنے جسم کو معطر کرتے ہوئے
بیتے لمحوں کی بارش میں
سر تا پا بھیگ جاتی ہوں میں
پھر حیراں آنکھوں سے دیکھتی ہوں
اس سائے کو
جو میرے ساتھ بھیگتا ہے
لیکن میں اس کا چہرہ دیکھنے میں
ناکام ہو کے سوچتی ہوں
کہ کیا یہ تم ہو؟
جو میرے وجود کا اک حصہ ہو
ہمیشہ سے......

شاعرہ: شمسہ قمر۔ کراچی

سفر

مری تشنہ روح
آج بھی
مانوس آہٹوں
پیار کی ٹھنڈک
محبت کی چاندنی کی تلاش میں
محوِ سفر ہے

شاعرہ: نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ

ہم راز

دل کے قلم میں
دکھوں کی سیاہی بھر کر
اور لفظوں کے ہیر پھیر کو
شاعری کے انداز میں ڈھال کر
اور پھر...... کاغذ کو معتبر بنا کر
میں نے زمانے کو
اپنا ہم راز بنا لیا

عائشہ نور عاشا۔ شادیوال، گجرات

چار اشعار

ستم ہنس کر اٹھانے ہیں محبت عام کرنی ہے
یہی کوشش ہمیں دنیا میں صبح و شام کرنی ہے
بھری محفل میں مجھ کو بے وفا کہہ کر پکارا ہے
ابھی کچھ اور بھی چاہت مری بدنام کرنی ہے
بس اتنی سی تمنا ہے محبت میں مری جاناں
تری باہوں میں اپنی زندگی کی شام کرنی ہے
محبت کس قدر تم سے ہے عادل کو بتائیں کیا
بس اب تو زندگی اپنی تمہارے نام کرنی ہے

شاعر: عادل حسین۔ کراچی

غور کرو

ملی ہے زندگی سب کو یہاں ایک بار
کیوں سمجھتے نہیں ہو اس کا مفہوم یار!
پکارے جب کوئی دوڑو جانب صدا
پھر مل نہ پائے گی آواز بھی ایک بار
تُو جو سمجھ رہا ہے ویسا نہیں ہوں میں
اُتر کر دیکھ میرے دل میں فقط ایک بار
دنیا کیا تھی کیا ہوگئی ہے اور کیا ہوجائے گی سوچ
نہ گھبرا تُو خدا کے سامنے ہاتھ تو پھیلا ایک بار
خدا کے حضور جھک ، سجدہ کر دعا مانگ!
زندگی سنور جائے گی جو کر دیا اس نے معاف ایک بار

شاعرہ: شبانہ نسیم۔ کراچی

صفحۂ زیست

صفحۂ زیست کو ہم نے کچھ اس طرح پایا
کہیں سلوٹیں، کہیں شکنیں کہیں بوسیدہ پن
کہیں گرد سے اٹا ہوا کہیں شبنم سے دُھلا ہوا
کہیں بچپن کی شرارتیں کہیں ہمارا بانکپن
کہیں روح میں اترتی تنہائیاں، کہیں لہولہو محفلیں
کہیں گفتگو میں سرور ہے، کہیں برہمی بھی ضرور ہے
کہیں ملن کی مسکراتی گھڑیاں، کہیں جدائی کی اذیتیں
کہیں وصالِ صنم روشن وتاباں، کہیں ہجر کا بوجھ ناتواں
کہیں اپنوں کی نفرتیں، کہیں غیروں کی چاہتیں
صفحۂ زیست کو ہم نے کچھ اس طرح پایا
کہیں اندھیری راتیں ، کہیں روشن سویرے

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

زندگی گلزار ہے

مری زندگی ہے، اک سادہ کاغذ
مری جان جاں! تم ہی اس زندگی کو
گلزار بنا سکتی ہو
اس سادہ ویران ورق کو اپنی محبت سے
رنگین بنا سکتی ہو!
صرف تم!

شاعر: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

"چٹ پٹی خبریں"

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

کنگنا کی کہانی

ذرائع آخر کار ریتک روشن کی طلاق کی وجہ تلاش کر ہی لائے۔ ریتک کی شادی شدہ زندگی

گرل کنگنا رناوٹ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ریتک کی سابقہ بیوی کو ان کے اس رشتے پر اعتراض تھا اور اس لیے جب ریتک نے کنگنا سے دست

میں قیامت برپا کرنے والی کوئی اور نہیں بلکہ فیشن

بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ تب یہ علیحدگی

ہوگئی۔ ریتک کے بچے بھی ماں کے ساتھ ہیں۔

وہاب ریاض کو شرم مگر...... نہیں آتی

PSL کے میچز نے پاکستان میں دھوم مچادی۔ یقیناً کرکٹ کے شائقین کے لیے ان میچز کا انعقاد بہت بڑی خوشخبری ہے۔ PSL کی

بدولت جہاں پاکستان کرکٹ مستحکم ہوگی نئے کھلاڑی ملیں گے وہاں وہاب ریاض جیسے جاہل کھلاڑی بھی نظروں میں آئے۔ وہاں ریاض نے میچ کے دوران احمد شہزاد کو مغلظات بکیں جو کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کی۔

کرشنا اور کپل آمنے سامنے

ذرائع بتاتے ہیں کہ کرشنا اور کپل میں آج

کل شدید دشمنی ہوئی ہے وجہ شاید کپل کا چینل سے جانا اور اس سیٹ پر کرشنا کی آمد ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو کرشنا بہت ہی گھٹیا کامیڈی کر رہا ہے۔ یقیناً اُس کو گوندا کا بھانجا ہونے کا بہت فائدہ ہورہا ہے۔

نیلم منیر کی اڑان

نیلم منیر اور احسن خان جلد فلم چھپن چھپائی میں جلوہ گر ہوں گے۔ نیلم آج کل بہت اونچی

پرواز کر رہی ہیں اور اکثر پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کے پیچھے پیچھے گھومتی نظر آرہی ہیں۔ فلم چھپن چھپائی کے ڈائریکٹر محسن علی ہیں۔ جنہوں نے فلم رانگ نمبر کا اسکرپٹ تحریر کیا تھا۔

انوشکا بدنام ہوگئیں

خبریں گرم ہیں کہ بالآخر ویرات کوہلی اور انوشکا شرما بھی الگ ہوگئے ہیں۔ ایک عرصے تک

انوشکا اس تعلق سے انکاری تھیں مگر اب اس تعلق

کے ختم ہونے کا کھلم کھلا اعلان کرتی نظر آ رہی ہیں۔ فلمیں تو ان کے پاس ہیں نہیں شاید مشہور ہونے کے لیے بدنام ہونے پر یقین رکھتی ہیں۔

سنجے دت فلم بنا رہے ہیں

سنجے بابا 25 فروری کو جیل سے رہائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی سزا میں کمی ان کے اچھے

لوٹ کے بدھو

سُنا ہے کترینہ کیف بالی ووڈ کے ہیروز سے آخر کار دل برداشتہ ہو کر دوبارہ سلمان خان کی

محبوبہ بن گئی ہیں۔ رنبیر کپور کے شادی سے انکار نے کترینہ کا دل اس بری طرح توڑا کہ وہ اس

رویے کی وجہ سے ملی ہے۔ سنجے دت جلد ہی اپنے جیل کے ساتھیوں پر فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس کی شوٹنگ جیل میں ہی متوقع ہے۔ اس فلم کی شروعات کے ساتھ سنجے دت کا شمار بھی فلم ڈائریکٹرز میں ہونے لگے گا۔

شخص کے پاس پلٹ گئیں جس کا کبھی فائدہ اٹھا کر اور دل توڑ کر کامیابی کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ شاید ایسے لوگوں کے لیے ہی کہا جاتا ہے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔

☆☆......☆☆

نادیہ طارق
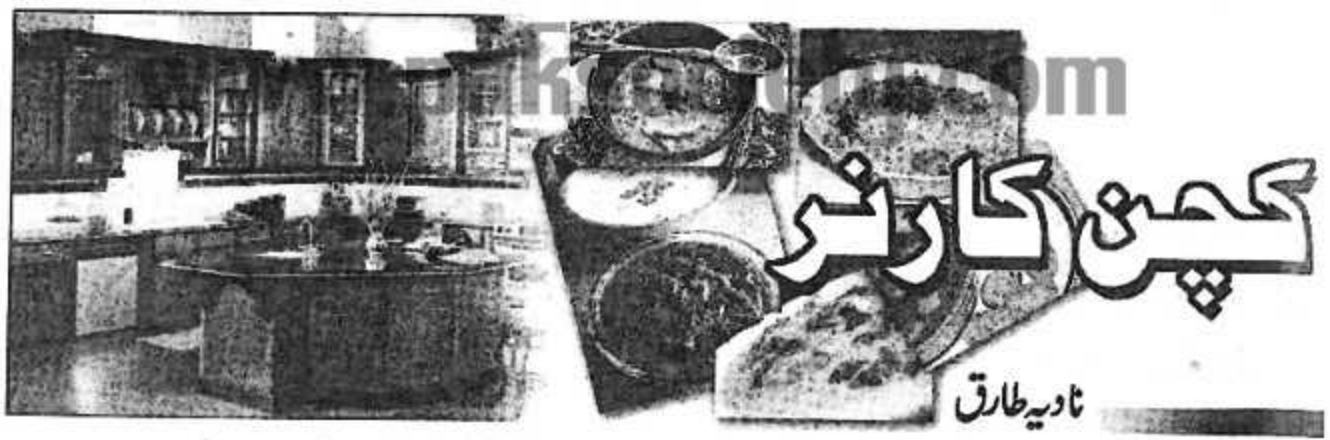
دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

حیدرآبادی قیمہ بریانی

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
چاول	آدھا کلو
دہی	ایک کپ
تیل	حسب ضرورت
پیاز	دو عدد
ٹماٹر	تین عدد
ہری مرچ	چھ عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
کڑی پتے	بارہ عدد
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے چمچہ
گرم مسالہ	ایک کھانے کا چمچہ
کری پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
تیز پات	دو عدد
لونگیں	چھ عدد
دار چینی	دو ٹکڑے
آلو بخارے	بارہ عدد
پودینہ	آدھا کپ
لیموں	حسب ضرورت
زردے کا رنگ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دودھ	ایک چوتھائی کپ

ترکیب:

چاولوں میں پانی، نمک، تیز پات، لونگ اور دار چینی شامل کر کے ابال لیں۔ جب دو کنی رہ جائیں تو اُتار کر چھان لیں۔ اب ایک پتیلی میں آئل گرم کریں اور اس میں پیاز فرائی کر کے قیمہ شامل کریں اور پھر لہسن ادرک پیسٹ شامل کر کے بھونیں۔ اس کے بعد نمک، لال مرچ پاؤڈر، کری پاؤڈر، ہلدی، دھنیا پاؤڈر، گرم مسالہ، کڑی پتے اور آلو بخارے شامل کر کے مزید بھونیں اور قیمہ گلانے کے لیے بقدرِ ضرورت پانی شامل کر کے درمیانی انچ پر رکھ دیں۔ جب قیمہ گل جائے تو اس میں دہی شامل کریں، آنچ قدرے تیز کر کے اتنا بھونیں کہ تیل علیحدہ ہو جائے۔ قیمہ تیار ہے۔ اب ایک الگ پتیلی میں پہلے قیمے کی تہہ لگائیں، پھر اس کے اوپر آدھے چاولوں کی تہہ لگائیں۔ اس کے بعد گول کٹے ہوئے ٹماٹر، کٹی ہوئی ہری مرچیں، باریک کٹا ہوا پودینہ اور باریک کٹے ہوئے لیموں ڈالیں۔ پھر اس کے اوپر باقی آدھے چاولوں کی تہہ لگائیں

اور آخر میں زردے کا رنگ دودھ میں گھول کر ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔

قیمہ دال

اجزاء

قیمہ	ایک کلو
چنے کی دال	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	حسب ذائقہ
آئل	آدھا کپ
ہلدی	ایک تہائی چائے کا چمچہ
پیاز	پانچ عدد
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	تین عدد
دہی	ایک تہائی کپ

ترکیب:

دال صاف کر کے بیس منٹ پہلے بھگو دیں۔ ایک پتیلی میں آئل گرم کریں اور اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز سنہری کر لیں۔ پھر اس میں سے آدھی پیاز نکال کر رکھ لیں۔ اب اس میں قیمہ اور اس کے ساتھ لہسن ادرک پیسٹ شامل کر کے بھونیں۔ پھر اس میں ہلدی پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، نمک، دھنیا پاؤڈر شامل کر کے ایک منٹ تک مزید بھونیں۔ پھر چنے کی دال شامل کر کے پانی ڈالیں اور گلانے کے لیے رکھ دیں۔ جب ہلکی سی کسر رہ جائے تو ٹماٹر کاٹ کر ڈالیں اور باقی بچائی ہوئی پیاز بھی شامل کر دیں۔ اب اچھی طرح بھونیں اور دم پر لگا دیں۔ آئل اوپر نظر آنے لگے تو اُتار لیں۔

گل فردوس

اجزاء

دودھ	ایک لیٹر
چاول	پچاس گرام
بادام	پچاس گرام
کھویا	250 گرام
مکھن	دو کھانے کے چمچے
پائن ایپل ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
پائن ایپل	آدھا کپ
جیلی	ایک پیکٹ

ڈبے پر دی گئی ہدایات کے مطابق جیلی پاؤڈر کو گرم پانی میں مکس کر کے جیلی جمائیں اور پھر اس کے کیوبز کاٹ لیں۔

ترکیب:

چاولوں کو دھو کر آدھے گھنٹے کے لیے بھگوئیں اور پھر فوڈ پروسیسر میں باریک پیس لیں۔ اب ایک پتیلی میں مکھن پگھلائیں اور اس میں پسے ہوئے چاول اور پسے ہوئے بادام ڈال کر بھونیں۔ دو منٹ بعد دودھ شامل کر کے پکائیں۔ آنچ ہلکی رکھیں اور تھوڑی دیر بعد چمچہ چلاتی رہیں۔ آمیزہ قدرے گاڑھا ہونے لگے تو کھویا شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں اور چمچے کی مدد سے چلاتی رہیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کر دیں اور پائن ایپل ایسنس شامل کریں۔ جب قدرے ٹھنڈا ہو جائے تو پائن ایپل کے سلائس شامل کریں اور ڈش میں نکال کر اوپر سے جیلی کے کیوبز سجائیں۔ حسب پسند باریک کٹے ہوئے بادام، پستے اور کاجو سے گارنش کر کے پیش کریں۔

رشین کباب

اجزاء

چکن	دو کپ
بندھ گوبھی	ایک کپ
گاجر	ایک عدد

شملہ مرچ	آدھی
فرنس بینز	آدھا کپ
کڑی پتے	بارہ عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چار عدد
نمک	ایک چائے کا چمچہ
میدہ	تین کھانے کے چمچے
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
آلو (اُبال کر چھل لیں)	دو کپ
بریڈ کرمبز	حسب ضرورت
انڈے	دو عدد (تلنے کے لیے)

ترکیب:

ہری مرچ باریک کاٹ لیں۔ پھر شملہ مرچ' بند گوبھی، فرنچ بینز اور گاجر کو باریک کاٹیں اور ہلکا سا اُبال لیں۔ چکن کو ادرک لہسن پیسٹ کے ساتھ ابالیں اور پھر اسے ریشہ کر کے میش کیے ہوئے آلوؤں کے ساتھ مکس کر دیں۔ اب ایک پین میں تھوڑا سا تیل ڈال کر اس میں کڑی پتے، کٹی لال مرچ، کالی مرچ، نمک اور میدہ شامل کر کے ایک منٹ فرائی کریں۔ پھر اس میں ابلی ہوئی سبزیاں اور آلو چکن کا آمیزہ بھی شامل کر لیں۔ اب اسے ٹھنڈا ہونے دیں۔ اس کے بعد کباب بنائیں اور پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈپ کر کے بریڈ کرمبز میں لپیٹیں اور تیل میں ڈیپ فرائی کر لیں۔ مزیدار رشین کباب تیار ہیں، اپنی پسندیدہ سوس کے ہمراہ نوش فرمائیں۔

تھائی چکن کیسر والے

اجزاء

چکن (ران کا حصہ گرل کیا ہوا)	دو عدد
نوڈلز	سو گرام
تھائی سوپ	ایک پیکٹ
گاجر	ایک عدد
پودینہ/دھنیا	گارنش کے لیے

ترکیب: ایک دیگچی میں نمک ڈال کر پانی اُبال لیں۔ پھر اس میں نوڈلز ڈالیں تا کہ وہ نرم پڑ جائیں (کچے نہ رہیں) اور انہیں پانی سے نکال کر الگ رکھ لیں۔ چکن سے کھال اور ہڈیاں نکال دیں اور دھولیں پھر سوپ بنانے کے لیے پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ اس سوپ میں باریک گاجریں بھی ڈال دیں اور سوپ کو اُبلنے دیں۔ اس اسٹیج پر سوپ میں نوڈلز بھی ڈال دیں اور انہیں ایک اُبال دیں۔ یہ تیار تھائی سوپ بے حد لذیذ اور قوت بخش ہوتا ہے۔ اسے گرم گرم پیش کریں۔ چاہیں تو دھنیا' پودینہ سے گارنش کر لیں۔

مکس فرائیڈ رائس

اجزاء

چاول (اُبلے ہوئے)	دو کپ
چائنیز نمک	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	ایک چوتھائی کپ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	یک کھانے کا چمچہ
ہری پیاز	دو عدد (چوپ کی ہوئی)
شملہ مرچ	ایک کپ (چوپ کی ہوئی)
انڈے	چار عدد فرائیڈ
مٹر	ایک کپ (ابلے ہوئے)
گاجر	ایک کپ
کالی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب: چاول کو نمک کے پانی میں دو کنی تک اُبال لیں۔ تیل گرم کریں اس میں انڈے فرائی کر

کے نکال لیں۔ اس میں لہسن ڈال کر فرائی کرلیں۔ دو منٹ فرائی کرنے کے بعد مٹر، گاجر، شملہ مرچ اور پیاز ڈال کر دو منٹ فرائی کریں۔ اب نمک، چائنیز نمک، سویا سوس، کالی مرچ اور انڈہ ڈال کر مکس کریں۔ اب چاول ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے پانچ منٹ پر رکھ کر اتارلیں۔

ریڈ بیف کری

اجزاء

گائے کا گوشت	آدھا کلو
ثابت سرخ مرچیں	چھ یا دس عدد
لائم کے پتے	تین عدد
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
سیاہ زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
شرمپ پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
کوکونٹ ملک	ڈھائی کپ
پیاز (چوپ کرلیں)	ایک عدد
لیمن گراس (چوپ کی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن کے جوے	چار عدد (چوپ کرلیں)
ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
تازی سرخ مرچ	ایک عدد (بیج نکال کر سلائس کاٹ لیں)
سبز پھلیاں	سو گرام
فش سوس	دو کھانے کے چمچے
تیل	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب: گوشت کی باریک اسٹرپس کاٹ لیں۔ ثابت سرخ مرچوں اور لائم کے پتوں کو پندرہ منٹ کے لیے گرم پانی میں بھگودیں۔ نان اسٹک فرائنگ پین میں بغیر تیل ڈالے ثابت دھنیا، سیاہ زیرہ اور شرمپ پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ خوشبو آنے لگے تو نکال کر ٹھنڈا کر کے فوڈ پروسیسر میں ڈال کر پیس لیں۔ سرخ مرچوں اور لائم کے پتوں کو پانی سے نکال کر لیمن گراس، پیاز، لہسن اور ادرک کے ساتھ ملا کر فوڈ پروسیسر میں ڈال کر ہموار پیسٹ تیار کرلیں۔ سوس پین میں تیل گرم کر کے پیسٹ ڈال کر تین چار منٹ فرائی کرنے کے بعد کوکونٹ ملک شامل کر کے پچیس منٹ تک پکائیں۔ تیل الگ نظر آنے لگے تو گوشت، تازی سرخ مرچیں اور پھلیاں شامل کردیں۔ گوشت اور پھلیاں گل جائیں تو نمک اور فش سوس ڈال کر دو تین منٹ پکا کر آنچ سے اتارلیں چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

اورنج گرل چکن

اجزاء

چکن بریسٹ	دو عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
پیپریکا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
اورنج جوس	پون کپ
لیموں (رس نکال لیں)	ایک عدد
تیل	تین کھانے کے چمچے
براؤن شوگر	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب: ایک پیالے میں نمک، پیپریکا پاؤڈر، لہسن پیسٹ، اورنج جوس، لیموں کا رس، ایک کھانے کا چمچہ تیل اور براؤن شوگر اچھی طرح مکس کرلیں۔ یہ میری نیشن چکن بریسٹ پر لگا کر دو تین گھنٹے تک فریج میں رکھ دیں۔ گرلنگ پین گرم کر کے تیل سے گریس کرلیں۔ میرینیٹ کیا ہوا گوشت اس پر رکھ کر گرل کرلیں۔ تیار ہونے پر سرونگ پلیٹ میں نکال کر کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

☆☆......☆☆